زندگی کے ساتھ ساتھ
ماہنامہ
چہارسو
راولپنڈی

..... برف کے شہر .....

قمر علی عباسی کی تحریر کا کمال یہ ہے کہ وہ ہر عمر کے قارئین میں مقبول ہے۔ اُن کے پسند کرنے، اُن کی تحریر سے محبت کرنے والوں کی تعداد سینکڑوں میں نہیں، ہزاروں میں نہیں، لاکھوں میں ہے۔ دنیا میں جہاں جہاں اردو پڑھی جاتی ہے وہاں قمر علی عباسی کے سفرناموں نے ''سفر'' کیا۔ اُن کی تحریر کو جو پذیرائی حاصل ہوئی وہ اُن کا سادہ، سلیس، دلچسپ اور شگفتہ انداز بیان ہے۔ مشکل سے مشکل بات نہایت آسانی سے کہہ دیتے ہیں۔ قمر علی عباسی کو دنیا کی کسی بھی زبان میں سب سے زیادہ سفرنامے لکھنے کا اعزاز حاصل ہے اور ویلکم بک پورٹ کو ان کے تمام سفرنامے چھاپنے کا اُن کے تمام سفرنامے ویلکم نے اہتمام کے ساتھ پیش کیے۔ ان کا ہمارا ساتھ لگ بھگ تقریباً تین دہائیوں کا ہے وہ رائٹر جس پائے کے تھے اس کا اندازہ اُن کو ملنے والے ایوارڈ سے کیا جاسکتا ہے۔ لیکن وہ جیسے انسان تھے وہ چیدہ چیدہ ہی ہوتے ہیں۔ لوگوں سے شفقت سے پیش آنا، محبت کا برتاؤ کرنا، نئے رائٹرز کی حوصلہ افزائی اُن کے مزاج کا خاصہ تھا۔ آج نہایت دل گرفتگی اور رنج سے میں ''برف کے شہر'' پیش کر رہا ہوں کیونکہ قمر علی عباسی کا یہ آخری سفرنامہ ہے۔ ۳۱ مئی ۲۰۱۳ء کو وہ نیویارک شہر کی مٹی اوڑھ کر سو گئے۔ ہر سفر کو تمام کر دیا۔

.....اصغر زیدی

اشاعت: جون ۲۰۱۴ء، قیمت: ۳۰۰ روپے، ویلکم بک پورٹ، کراچی۔

..... زمیں رنگ .....

آج اردو افسانے یا ناول کی وہ دنیا نہیں ہے جو عصمت چغتائی، منٹو یا بیدی کے وقت میں تھی۔ یہ ایک نئی اور حیران کرنے والی دنیا ہے۔ اور غور کیجیے تو آج کی کہانی نئی شکل، نئے انداز اور نئے اسلوب میں ہمارے سامنے ہے۔ مسرت اس بات کی ہے کہ آج ہمارے درمیان مرزا اطہر بیگ، مبین مرزا، مستنصر حسین تارڑ، خالد طور، رضیہ فصیح احمد، طاہرہ اقبال اور عاصم بٹ جیسے لکھاری موجود ہیں جنہوں نے نہ صرف نئے اردو افسانے کے فروغ میں اپنی طرف سے اضافہ کیا ہے بلکہ ان بلندیوں پر بھی پہنچایا ہے جہاں ہم آسانی سے اردو ادب کو عالمی شہہ پاروں کے سامنے رکھ سکتے ہیں۔ ممتاز شیریں، عصمت چغتائی اور قرۃ العین حیدر سے الگ طاہرہ اقبال کے افسانوں کو دیکھے جانے کی ضرورت ہے۔ طاہرہ کے سامنے پاکستان کا سیاسی و سماجی منظرنامہ بھی ہے اور وہ اس قدر زرخیز خلاقیت رکھتی ہیں کہ پاکستان کے گاؤں سے گزرتی ان کی کہانیاں بصری پیکروں کے ساتھ ان کے Process Thought کو زندگی اور نئے فلسفہ کے امتزاج سے ایک نئے تصویری منظرنامے میں تبدیل کر دیتی ہیں۔ اور اس طرح غور کریں تو ان کی طویل کہانیوں کے خاتمہ کے بعد جو مونتاژ بن کر ابھرتا ہے وہ غالب کے اس شعر کی یاد تازہ کرتا ہے ''ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب'' اور قربان جایئے کہ زندگی کو ہر لحہ جاننے کا تجسس طاہرہ کو نہ صرف حیران کرتا ہے بلکہ اظہار بیان کے لیے وہ اسے ہماری آپ کی زندگی سے نئے استعارے، نیا اسلوب اور نیا رنگ و آہنگ لے کر جدید فکشن کے نئے ڈسکورس میں شامل ہو جاتی ہیں۔ حقیقت پسندانہ اسلوب کے باوجود روایت سے گریز، مستقبل کے انقلابات پر نظر اور اس کے ساتھ سیاسی و سماجی اور تاریخی شعور کے ساتھ نہ صرف تخلیقی ذہانت کا ثبوت فراہم کرتی ہیں بلکہ میں یہ اضافہ کرنے میں حق بجانب ہوں کہ وہ اردو افسانے کو ایک نئی سمت دینے کی کوشش کر رہی ہیں اور یہ پرخطر راہ ممتاز شیریں، عصمت اور قرۃ العین حیدر سے الگ کی راہ ہے۔

.....مشرف عالم ذوقی

اشاعت: ۲۰۱۴ء، قیمت: ۳۷۵ روپے، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد۔

..... آغا گل کے فکشن میں بلوچستان کی تہذیب وثقافت .....

آغا گل کے قارئین میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ دوسری زبانوں میں ان کی کہانیوں کے تراجم سامنے آ رہے ہیں اگر بلوچستان کے نصاب تعلیم میں ان کی تخلیقات نے جگہ بنائی ہے تو اسلام آباد میں بھی ایک معروف تعلیمی ادارے ''ایسٹ انٹرنیشنل سکول'' نے ''ٹیڈی بیئر'' کو اپنے شاندار اور جاندار موضوع کی وجہ سے شامل نصاب کیا ہے۔ پاکستان کی دو تین یونیورسٹیوں نے آغا گل کے فکر وفن پر تحقیقی مقالات لکھوائے ہیں۔ حال ہی میں انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد کی ایک ہونہار طالبہ منزہ مبین نے آغا گل کے افسانوں اور ناولوں میں بلوچستان کی تہذیب وثقافت کی عکاسی کے موضوع پر راقم الحروف کی زیر نگرانی ایم۔فل کی سطح کا مقالہ تحریر کیا، یہی مقالہ کتابی صورت میں آپ کے پیش نظر ہے۔

.....ڈاکٹر طیب منیر

اشاعت: فروری ۲۰۱۴ء، قیمت: ۲۰۰ روپے، رنگِ ادب پبلی کیشنز، کراچی۔

N.P.R- 063

زندگی کے ساتھ ساتھ

چہارسُو

جلد۲۳، شمارہ: ستمبر، اکتوبر ۲۰۱۴ء

بانی مدیر اعلیٰ

سید ضمیر جعفری

مجلسِ مشاورت

○☆○

قارئین چہارسُو

○☆○

زرِ سالانہ

○☆○

دلِ مضطرب نگاہِ شفیقانہ

مدیر مسؤل

گلزار جاوید

○☆○

مدیران معاون

بینا جاوید

فاری شا

محمد انعام الحق

عروب شاہد

رابطہ: 537/D-1، ویسٹریج-III، راولپنڈی، پاکستان۔

فون: (+92)-51-5462495,5490181

فیکس: (+92)-5550886

موبائل: (+92)-336-0558618

ای۔میل: chaharsu@gmail.com

۔ ویب سائٹ ۔

http://chaharsu.wordpress.com

پرنٹر: فیض الاسلام پرنٹنگ پریس ٹرنک بازار راولپنڈی

متاعِ چہارسو

سرِ ورق، پسِ ورق۔۔۔۔۔۔شعیب حیدر زیدی
تزئین۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔عظمیٰ رشید
کمپوزنگ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ تنویر الحق

قرطاسِ اعزاز
دواہوجانا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔محمد انعام الحق ۵
ابرِ گوھر بار۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔عطیہ سکندر علی ۶
خوشیوں کا جال (خاکہ)۔۔۔۔۔۔ڈاکٹر رینو بہل ۱۰
براہِ راست۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔گلزار جاوید ۱۳
سب سے بڑا سچ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔رتن سنگھ ۱۹
ایک بزم اور۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔شرون کمار ورما ۲۰
سادہ بیانی کے مرقعے۔۔۔۔۔۔۔۔دیپک بُدکی ۲۱
باصر افسانہ نگار۔۔۔۔۔۔۔۔۔اقبال انصاری ۲۴
بدلی میں چھپا چاند۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔قیصر نجفی ۲۶
آنکھوں سے دل تک۔۔۔۔۔۔۔۔۔انور ایوبی ۲۸
جادو بیاں قلمکار۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔سلطان انجم ۲۹
لفظوں میں زندگی کے رنگ۔۔۔۔۔رومانہ رومی ۳۰
دروپدی جاگ اٹھی (افسانہ)۔۔۔۔ڈاکٹر رینو بہل ۳۲
قبضہ (ڈرامہ)۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ڈاکٹر رینو بہل ۳۷
عمراں دی تھکان (تراجم)۔۔۔۔۔ڈاکٹر رینو بہل ۴۲
آئینہ بادِ بہاری۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔فاری شا ۴۹
مائل بہ کرم
نسیمِ سحر، ماہر اجمیری۔ ۵۰
افسانے
آنگن میں کالی دھوپ۔۔۔۔۔۔۔منیرہ احمد شمیم ۵۱
چہار درویش۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔انجم جاوید ۵۵
بستی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔شاہد جمیل ۶۰
اُستاد۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔گلزار جاوید ۶۲
کوئے قاتل
منظر ایوبی، مشکور حسین یاد، نقشبند بخاری، آصف ثاقب، خیال آفاقی، مہندر پرتاپ چاند، غالب عرفان، حسن عسکری کاظمی، صدیق شاہد، پرواز انبالوی، جواز جعفری، اشرف جاوید۔ ۶۷
ہوا کے دوش پر
ایک عام آدمی کی داستانِ حیات۔۔۔۔فیروز عالم ۷۳
عراق جل رہا ہے
سفرنامے کا ایک باب۔۔۔۔۔۔۔سلمیٰ اعوان ۷۸
چشمِ ناحق
سعید نقوی، زہیر کنجاہی، عرش صہبائی، نعیم الدین، خورشید رضوی، سلیم ناز، شگفتہ نازلی، حفیظ انجم، وشال کھلّر، نوید سروش، مالک سنگھ، اصغر شمیم، کرشن گوتم، شمیم ادیب، سبھاش گپتا۔ ۸۴
آئینۂ فن
مقدمے کا فیصلہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔خالد اشرف ۸۹
افسانوں میں کربلا۔۔۔۔۔۔۔۔۔عفت ذکیہ ۹۳
عاشی اور تتلی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔مسرت کلانچوی ۹۷
دل کا پنچھی
محمود الحسن، یونس صابر، یوگیندر بہل، غالب عرفان، حسن عسکری کاظمی، نصرت بخاری، شگفتہ نازلی، فیصل عظیم، جہانگیر اشرف۔ ۹۹
خدا بھول گئے
فائق باپ کی لائق اولاد۔۔۔۔۔۔۔رؤف خیر ۱۰۴
نشانِ راہ
ذرا سی زندگی۔۔۔۔۔۔۔۔۔وجاہت علی عباسی ۱۰۶
بساطِ بشاشت
گدھا سمجھ کے۔۔۔۔۔ایس۔ایم۔معین قریشی ۱۰۸
فون پر بات۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔امرناتھ دھمیجہ ۱۱۰
ایک صدی کا قصہ
نوشاد علی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔دیپک کنول ۱۱۱
رس رابطے
جستجو، ترتیب، تدوین۔۔۔۔۔۔۔وقار جاوید ۱۱۶

قرطاسِ اعزاز

ڈاکٹر رینو بہل

کے نام

دوا ہو جانا:

نام: ڈاکٹر رینو بہل

والد: امی چند بہل

والدہ: اوینا ش بہل

پیدائش: ۶/اگست ۱۹۵۸، کپورتھلہ، بھارت۔

پتہ: ۱۵۰۵، سیکٹر ۴۹۔بی، چندی گڑھ۔۱۶۰۰۴۷

رابطہ: ۰۰۹۱۔۱۷۲۔۲۶۳۱۰۷۷ (گھر)

موبائل: ۰۰۹۱۔۹۷۸۱۵۵۷۷۰۰

ای میل: renubehl06@gmail.com

مصروفیت: پرائیویٹ سیکرٹری حکومت پنجاب، چندی گڑھ، بھارت۔

تعلیم: (۱)ایم۔اے (بی ایڈ)، (۲) ایم۔اے (سیاسیات)، (۳) ایم۔اے۔اردو (سونے کا تمغہ)، پی۔ایچ۔ڈی (اردو) ''عصمت چغتائی کے افسانوں کا فنی وفکری جائزہ'' پنجاب یونیورسٹی، چندی گڑھ، ۲۰۰۰ء۔

تصانیف: ۱۔آئینہ (۲۰۰۱ء)، یوپی اردو اکادمی سے انعام یافتہ۔۲۔آنکھوں سے دل تک (۲۰۰۵ء)۔۳۔کوئی چارہ ساز ہوتا (۲۰۰۸ء) یوپی اردو اکادمی سے انعام یافتہ۔۴۔خوشبو میرے آنگن کی (۲۰۱۰ء) بہار اردو اکادمی سے انعام یافتہ۔۵۔بدلی میں چھپا چاند (۲۰۱۲ء)۔۶۔خاموش صدائیں (۲۰۱۳ء) یوپی اردو اکادمی سے انعام یافتہ۔

زیرِ اشاعت: کستوری (ہندی افسانوں کا انتخاب)

ڈاکٹر رینو بہل کی کہانیاں اور فیچر ایف۔ایم 92.7 پر شائع ہوتے ہیں۔رینو بہل کی افسانہ نگاری (آنکھوں سے دل تک کی روشنی میں) پر شعبہ اردو جموں یونیورسٹی کی طالبہ راج دیوی نے ایم فل کا تحقیقاتی مقالہ تحریر کیا ہے۔ہندی اور پنجابی کے ادبی میگزین میں بھی کہانیاں باقاعدگی سے شائع ہوتی ہیں۔

۲۱ سے ۲۳ دسمبر بین الاقوامی امن کانفرنس منعقدہ لاہور میں شرکت۔

انعامات: ۱۔لالا جگت نرائن ایوارڈ (اکتوبر ۲۰۰۳ء)۔۲۔امرتا پریتم سرمتی سمن ایوارڈ (۲۰۱۰ء)

محمد انعام الحق (اسلام آباد)

''ابرِ گوھر بار''

عطیہ سکندر علی

(سکھر)

یکم جون ۲۰۱۰ء
نئی دہلی۔

بہن رینو بہل۔

آپ کا مجموعہ ملا۔ میں نے اس کا ایک افسانہ پڑھ بھی لیا ہے۔ آپ بہت پیارا لکھتی ہیں۔ پنجاب میں پڑھنے والے کم ہیں لیکن ہمارا کام لکھنا ہے ہم اپنا کام کرتے رہیں گے۔

کرتار سنگھ دُگل

۱۳؍فروری ۲۰۰۶ء
دہلی۔

رینو بہل صاحبہ، خوش رہیے!

آپ کی کہانیوں کی کتاب مل گئی۔ شکریہ۔ کتاب میں نے بڑے انہماک سے پڑھی ہے جس کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ہمارے بعض پرانے کہانی کاروں کے یہاں بھی شاید غور و فکر کی جداگانہ بہتات کے باعث وقوع کا پہلو اتنا دبا ہوا ہوتا ہے کہ ان کی کہانی میں کچھ ہوتے چلے جانے کا احساس نہیں ہوتا۔ یہ امر باعث مسرت ہے کہ آپ کے یہاں وقوعی انحطاط کا احساس قطعاً نہیں ہوتا۔ آپ کی کہانی بڑی سرعت سے آگے بڑھتی چلی جاتی ہے اور عام قاری اسے نہایت دلچسپی سے آخر تک پڑھ لیتا ہے۔ کسی کہانی کار کی یہ خوبی کچھ کم اہم نہیں، تاہم میری رائے میں آپ اپنے افسانوی عمل میں اب اس دور میں آن پہنچی ہیں کہ واقعہ کو اپنی ذاتی ترجیحوں سے برتنے کی بجائے اس امکان پر غور کریں کہ واقعہ کی سمتوں کا تعین کہانی میں بیان کردہ جبر کے تحت آپ ہی آپ ہوتا چلا جائے۔ اسی مفہوم کو ادا کرنے کے لیے اساتذہ کا کہنا ہے کہ کہانی اپنی فنی معراج پر خود آپ ہی اپنے آپ کو لکھنے لگتی ہے۔

جوگندر پال

۵؍اپریل ۲۰۱۲ء
انبالہ۔

عزیزہ ڈاکٹر رینو! خلوص فراواں اور دعائے خیر۔

آج دونوں افسانے میں نے پڑھ لیے ہیں۔ اتنی اچھی کہانیاں لکھنے اور مجھے انہیں پڑھنے کے لیے بھیجنے پر اظہار تشکر بھی کرتا ہوں اور دلی مبارک باد بھی پیش کرتا ہوں۔ دو ایک سال قبل سماجی اور عصری مسائل پر تمہاری کہانیاں پڑھتا تھا تو کئی بار یوں لگتا تھا کہ تم نے سماج کے ہر اچھے بُرے پہلو کو درشا دیا ہے اور اب شاید تمہارے پاس کچھ اور لکھنے کے لیے کوئی موضوع نہیں بچا ہوگا۔ لیکن تم نے اس مدت میں جن اچھوتے موضوعات پر بے شمار نئی کہانیاں لکھی ہیں ان سے ثابت کر دیا ہے کہ تمہاری سچی لگن اور محنت کے ساتھ ساتھ تمہاری وسیع النظری کے نہاں خانوں میں نئے نئے موضوعاب کے بے شمار خزانے چھپے ہوئے ہیں اور یہ سرمایہ کبھی ختم نہیں ہوگا بلکہ وقت کے ساتھ ساتھ اس میں اور اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔

تمہارے بیانیہ میں پختگی کے ساتھ ساتھ دل کشی بھی ہے جو قاری کی دل چسپی کو بڑھاتی چلی جاتی ہے۔ کئی نازک مرحلوں کے بیان میں تمہارے الفاظ کا انتخاب اور جملوں کی ادائیگی لائق صد تحسین ہے اور مجھے اُمید ہی نہیں بلکہ یقینِ کامل ہے کہ آنے والے کچھ سالوں میں تمہارا شمار ملک کے صفِ اوّل کے افسانہ نگاروں میں ہوگا۔ میری دلی دعائیں ہمیشہ تمہارے ساتھ ہیں۔ اسی طرح خوب محنت کرتی رہو اور اپنے قارئین کو خوب سے خوت تر کہانیوں کی سوغات دیتی رہو۔

مہندر پرتاپ چاندؔ

۱۶؍اکتوبر ۲۰۰۶ء
حیدر آباد، دکن

ڈاکٹر رینو بہل صاحبہ، آداب و نیاز۔

بیسویں صدی کے ماہِ رواں کے شمارے میں آپ کا افسانہ ''دو دلوں کے درمیاں'' نظر نواز ہوا۔ مجھے بے حد پسند آیا۔ خاص کر افسانے کی زبان، کرداروں کی زبان آپ کے افسانے کی خاص بات یہ ہے کہ قاری افسانہ پڑھتے ہوئے اپنے آپ کو افسانے کے کرداروں کے درمیان محسوس کرنے لگتا ہے۔ یہ خدا کا عطیہ ہے۔ آپ کی انفرادیت ہے ''دو دلوں کے درمیاں'' نے مجھے کافی سے زائد متاثر کیا ہے اس کا اختتام قارئین کی تشنگی کو دو چند کر دیتا ہے۔

میری جانب سے پرخلوص مبارکباد قبول کیجیے۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

میری ادبی صحافتی اور طبّی مصروفیات مجھے اجازت ہی نہیں دیتیں کہ میں کسی کو خط لکھوں لیکن پتہ نہیں کیوں آپ کا افسانہ پڑھنے کے بعد بے اختیار ہو کر انجانی جذبے کے تحت آپ کو مبارکباد کا خط لکھا ہے۔ اس جسارت پر معذرت خواہ ہوں۔ آپ کوئی خیال نہ فرمائیں۔ اچھی نثر میری کمزوری ہے۔ ایک قاری اور آپ اچھا ہی نہیں بہت اچھا لکھتی ہیں۔ اتنی اچھی زبان آپ نے کہاں سے سیکھی ہے؟

ڈاکٹر راہیؔ

۲۸؍فروری ۲۰۱۰ء
جموں

محترمہ رینو بہل جی!

پرنام۔ آپ کا افسانوی مجموعہ ''خوشبو میرے آنگن کی'' شیوراتری کے مقدس تیوہار کے موقع پر موصول ہوا۔ یاد آوری کے لیے شکریہ۔

یہ مجموعہ جاذبِ نظر ہے اور بڑے سلیقے سے شائع کیا گیا ہے۔ پہلے بھی آپ کے کئی افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ اردو کے معروف افسانہ نگار اور دانشور کشمیری لال ذاکر نے ''خوشبو میرے آنگن کی'' کا دیباچہ لکھا ہے اور آپ کی شخصیت کے چند نمایاں پہلو اجاگر کئے ہیں۔ اُنہوں نے آپ کی کہانیوں کی چند خصوصیات حرفِ تحریر میں لائے ہیں اور قارئین کے لیے دلچسپی کا سامان مہیا کیا ہے۔ ویسے آپ اپنی تحریروں کے ذریعے سے پہلے ہی اردو دنیا میں متعارف ہیں اور اپنے سدا بہار افسانوں سے ہر دلعزیز ہیں۔ آپ کے دو مختصر افسانے دودھ اور خط میں نے آج ہی لفظ لفظ سری نگر میں پڑھے۔ مجھے یہ دونوں مختصر افسانے بے حد پسند آئے۔

''خوشبو میرے آنگن کی'' کے افسانے دل میں ہلکی سی ٹیس پیدا کرنے والے افسانے ہیں۔ ان افسانوں میں آج کل کے انسان کا درد و کرب کھل کر سامنے آیا ہے۔ یہ افسانے جدیدیت کے نام پر ملف کرنے والے افسانے نہیں بلکہ ان میں کہانی پن کا خیال رکھا گیا ہے۔ پلاٹ سیدھے سادے، کردار جانے پہچانے اور زبان عام فہم ہے۔ یہ خصوصیات آج کل کے افسانہ نگاروں میں بہت کم نظر آتی ہیں۔ ابھی اس خوبصورت مجموعے کا مطالعہ ہی کر رہا ہوں۔ عنقریب ہی اس پر ایک تبصرہ ضبطِ قلم میں لا رہا ہوں۔ آپ کو مطلع کر دوں گا اور کیا لکھوں۔ اُمید ہے آپ اچھی ہوں گی۔

پریمی رومانی

۴؍مئی ۲۰۰۵ء
دھرم شالہ۔

رینو بی بی۔

تمہارا ارسال کردہ افسانوں کا مجموعہ ''آنکھوں سے دل تک'' مجھے موصول ہوا میں اس محبت کے لیے تمہارا شکر گزار ہوں۔

تمہارے افسانے پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ کہانی اپنے ماضی کی طرف لوٹ رہی ہے اور اس کے بیانیہ میں وہی احساس دروں بینی اور کرب ہے جو ایک اچھی کہانی کا خاصہ ہے۔ میں خاص طور پر اس بات کا بھی ذکر کرنا چاہوں گا کہ نسائی افسانوی ادب میں تم ترنم ریاض کے بعد واحد افسانہ نگار ہو جسے اپنے معاشرہ پر دانشورانہ نظر ڈالنے کی توفیق میسر ہے۔ تمہارے افسانوں میں جو بلیغ اور مفکرانہ مگر معنی خیز اشارے ملتے ہیں وہ اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ تمہارے اظہار کا سوتا خشک نہیں ہے بلکہ اس میں ہر لحظہ نسائی حسیت فروغ تر اور افروز تر ہے۔ کہیں کہیں حالانکہ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ فقروں کی بناوٹ پر تمہیں زیادہ دھیان دینے کی ضرورت ہے لیکن یہ کوئی ایسی بڑی بات نہیں ہے کہ اس طرف تمہاری تمام تر توجہ مبذول ہو۔ میں ایک بار پھر تمہارا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ تم نے مجھے اپنے افسانے پڑھنے کی دعوت دی۔

کرشن کمار طور

۲۲؍فروری ۲۰۱۰ء
سنگرور۔

عزیزہ ڈاکٹر رینو بہل، دعا و سلام۔

پچھلے دنوں آپ کے آنگن کی خوشبو موصول ہوئی۔ خوبصورت اور دل کش ٹائٹل سے آراستہ معطر کہانیوں کی کتاب دیکھ کر دل شاد ہو گیا۔ دہلی سفر کے دوران سارے افسانے پڑھ گیا ہوں۔ آٹھ گھنٹوں کا بور کر دینے والا سفر کیسے کٹ گیا پتہ ہی نہ چل سکا۔ یہی ثبوت کافی ہے آپ کے روح پرور افسانوں کا۔ جو دل کی گہرائیوں کو چھو گیا۔ کتنی روانی ہے کتنا بہاؤ ہے۔ کل کل بہتا جھرنا ہو جیسے۔ حالانکہ ہر افسانہ اپنے آپ میں ناول کا میٹر لئے ہوئے ہے۔ مگر آپ نے کمال ہنر مندی سے کوزہ میں سمندر بند کر دیا ہے۔ یقیناً آپ موجودہ دور کی مقبول افسانہ نگار ہیں۔ آخر آپ کی محنت رنگ لے ہی آئی۔ آپ نے اپنی قلم سے پنجاب میں مدھم ہو رہے چراغ اردو کی لو کو بڑھا دیا ہے۔

آپ سے ایک گلہ ہے آپ نے میرے افسانوی مجموعہ ''لمحوں کی داستاں'' کے بارے چٹّی سادھ لی ہے کچھ تو لکھا ہوتا۔ میرے لیے آپ کی قیمتی رائے قیمت رکھتی ہے۔ پہلے ہر روز آپ کی جانب سے خط کا انتظار رہتا تھا مگر اب امید چھوڑ دی ہے۔ بہر حال خدا سے دعا ہے زورِ قلم اور زیادہ۔ آپ خوش رہیں اور افسانہ نگاری کی عبادت میں مگن رہیں۔ یقین مانیئے آپ کے افسانوں سے سیکھنے کو بہت کچھ حاصل ہوا۔

کرشن بیتاب

۲؍ستمبر ۲۰۱۰ء
علی گڑھ۔

محترمہ رینو بہل صاحبہ، آداب۔

آپ کا شعری مجموعہ ''خوشبو میرے آنگن کی'' ملا شکریہ۔ خط لکھنے میں تاخیر ہوئی امید ہے درگذر کریں گی۔

اتنا خوبصورت مجموعہ شائع ہونے کی مبارکباد قبول کریں آپ تو ہماری بزم ادب کی مقبول قلمکار ہیں ہماری اس کاوش میں برابر ہمارے ساتھ ہیں۔ ہماری بزم کی تمام خواتین آپ کو مبارکباد پیش کرتی ہیں۔ آپ کے افسانوں کی میں کیا تعریف کروں ایک سے بڑھ کر ایک ہے آپ کے افسانوں میں مشرقی عورت کا عکس اپنی تمام تر خصوصیات کے ساتھ جلوہ گر نظر آتا ہے کسی بھی طرح کی عریانی یا ناشائستگی سے پاک اچھے افسانے ہمارے ذہن و دل پر اپنی

پاکیزہ چھاپ چھوڑتے ہیں جو ایک اچھی نگارش کی پہچان اور جان ہوتی ہے۔ اس امید کے ساتھ کہ آپ اس بزم ادب کے لیے اپنی نگارشات سے اس کو ہمیشہ یاد رکھیں گی۔

راشدہ خلیل

۷/اکتوبر ۲۰۱۳ء

دہلی۔

محترمہ رینو بہل صاحبہ۔ آداب۔

امید ہے کہ مزاج گرامی شگفتہ ہوں گے۔ آپ کا بھیجا ہوا افسانوی مجموعہ کافی دن پہلے مل گیا تھا۔ فون پر تو اس کی رسید آپ کو دے دی تھی خط لکھنے میں مصروفیت کی وجہ سے دیر ہوگئی جس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔

مجموعہ کی نہایت عمدہ طباعت ، دیدہ زیب ٹائٹل کے ساتھ جلوہ افروز ہوا۔ ناشر نے کتاب اپنے روایتی اشاعتی حسن کے ساتھ شائع کی ہے۔ تمام افسانوں کو جستہ جستہ پڑھا۔ ان میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ کہیں بھی کہانی کا فن مجروح نہیں ہوتا۔ آپ کی تحریر میں زبان نہایت سادہ اور سلیس ہے، ادق الفاظ کا استعمال کر کے خواہ مخواہ قاری کو الفاظ کی پیچیدگی میں نہیں الجھایا اور نہ ثقیل الفاظ کا استعمال کر کے عبارت کو بوجھل بنایا ہے۔ یوں تو زندگی کا ہر واقعہ اپنے اندر کہانی کا جواز رکھتا ہے مگر آپ نے ان موضوعات کا انتخاب کیا ہے جو ہمارے معاشرے کی ناہمواریوں کا پتہ دیتے ہیں۔ آپ نے افکار و خیالات کی کامیاب عکاسی کی ہے لیکن بعض افسانوں میں غیر فطری اختتام سے اگر اجتناب کیا جاتا تو ان کا فنی حسن دوبالا ہو جاتا۔

نارنگ ساقی

۱۸/مئی ۲۰۱۲ء

پونے۔

بہن ڈاکٹر رینو بہل! خوش رہو۔

''بدلی میں چھپا چاند'' کے افسانے میں نے پڑھے پسند آئے۔ آپ کا انداز بیاں آپ کا اپنا ہے۔ ''پت جھڑ کے بعد'' کا بلدیوراج ایک اکیلا آدمی نہیں جو اپنوں کی بے حسی کا شکار ہے بلکہ معاشرہ میں آج کتنے ہی ایسے بلدیوراج ہیں جن کی اولادیں آنسرنگ مشینوں میں تبدیل ہوگئی ہیں۔ ایک دوست بتارہے تھے کہ ایک ہندوستانی نوجوان کا رشتہ ایک ''این آر آئی'' (Not Requried Indian) لڑکی سے طے ہونے جارہا تھا۔ پہلی ہی ملاقات میں لڑکی نے لڑکے سے پوچھا ''تمہارے گھر میں ''ڈسٹ بین'' کتنے ہیں؟'' ڈسٹ بین سے اس کا مطلب ہے ''بوڑھے لوگ''۔ آج کل بزرگوں کی یہ عزت رہ گئی ہے۔ کہیں تو کچھ غلط ہو رہا ہے اگر اس کی اصلاح نہیں ہوتی تو سارا معاشرہ کوڑا داں بن جائے گا۔ افسانہ نگار مسائل کی نشاندہی کرسکتا ہے انہیں حل کرنا ملت کے رہنماؤں کا کام ہے لیکن آج کل وہ بھی بدل گئے ہیں۔ آج کل ایس ایم ایس حلقوں میں یہ جوک گشت کر رہا ہے کہ ''ہندوستانی فلم ستارے کرکٹ کھیل رہے ہیں کھلاڑی سیاست کر رہے ہیں۔ سیاستدان فحش فلموں میں دلچسپی لے رہے ہیں اور فحش فلموں کے اسٹارز اداکاری کر رہے ہیں۔'' سارا معاشرہ تباہی کے دہانے پر کھڑا ہے۔ یہ سب قیامت کے آثار ہیں۔ جس معاشرہ میں بڑوں کی عزت نہیں بچوں سے شفقت نہیں اس کا انجام اچھا نہیں ہوتا۔ بلدیوراج اگر حالات سے تنگ آ کر ''اولڈ ایج ہوم'' کی راہ اختیار نہ کرتے اور اپنے بے حس بچوں کو کوئی سبق سکھاتے تو شاید انہیں ان کے کیئے کی سزا ملتی۔ جب تک دنیا میں رمق بھر بھی انسانیت باقی ہے یہ دنیا تباہ نہیں ہوگی۔ ''بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے'' کے کردار بھی اسی زمین سے جڑے ہیں۔ ان میں ایک باپوجی بھی ہیں جو اپنے جسم کی راکھ کو انہیں کھیتوں میں بکھیر دینا چاہتے ہیں جس نے انہیں زندگی کی تمام آسائشیں دی ہیں۔ بیٹوں کا بس چلے تو باپوں کو بیچ دیں۔ دل چھو لینے والے افسانوں کی تخلیق پر دلی مبارکباد۔

قاضی مشتاق احمد

۱۲/ستمبر ۲۰۱۲ء

لندن۔

رینو بہل جی، نمسکار۔

کی حال اے، اُمید تے ہے کہ تُسی ٹھیک ٹھاک ہوو گے۔

''بدلی میں چھپا چاند'' کی وصول یابی چاند صاحب کے کرم سے ہوئی۔ وہ نہایت مخلص اور نیک انسان ہیں۔ آپ کی امانت چنڈی گڑھ سے بحفاظت لندن لاکر میرے حوالے کی۔ وہ پرانی نسل کے وضع دار لوگ ہیں۔ ان دنوں ڈھونڈنے سے بھی ایسے شخص نہیں ملتے۔

رینو جی! آپ کی بیشتر کہانیاں پہلے سے پڑھ رکھی تھیں لیکن اب اُن کو کتابی صورت میں دیکھ کر دل خوش ہوا۔ کارن یہ کہ آپ نے سنجیدہ موضوعات پر قلم اٹھانا شروع کر دیا ہے۔ مبارک ہو۔ میرے نزدیک یہ خوش آئند بات ہے بلکہ آپ زبان اور فنی کرافٹ کے ساتھ کہانی کی جزئیات پر بھی دسترس حاصل کرنے میں کامیاب ہوتی دکھائی دے رہی ہیں۔ اب یہ میدان آپ ہی کا ہے۔ بشرطیکہ آپ اپنی ذات کو مزید کھنگالیں اور اپنی باطنی آگ سے افسانہ نگاروں کو آگے لگادیں۔ ایک آدھ برس بعد ایک بھرپور ناول لکھ ڈالیں۔ فنکار کی اصلی پہچان اور اُس کی صحیح امیج ناول سے ہی بنا کرتی ہے۔

جتندر بلّو

۱۲/فروری ۲۰۰۹ء

ممبئی۔

محترمہ رینو جی، پرنام۔

آپ نے جو خوبصورت گلدستہ مجھے بھیجا ہے اس کے لیے آپ کا بہت بہت شکریہ۔ میں آپ کی خوبصورت کہانیاں اکثر پڑھتا رہتا ہوں۔ آپ

نے کہانی کہنے کے فن میں جو مہارت حاصل کی ہے وہ لاجواب اور قابلِ تعریف ہے۔آپ کی بیشتر کہانیاں پنجاب کی مٹی سے جُڑی ہوتی ہیں یہی وجہ ہے کہ آپ کی کہانیاں دل کو چھوتی ہیں۔

''کوئی چارہ ساز ہوتا'' کی بیشتر کہانیاں میں نے پڑھ لی ہیں۔ان دنوں کچھ مصروفیات بڑھ گئی ہیں جن کے سبب پڑھنے لکھنے کے مواقع سمٹ گئے ہیں۔کوشش کروں گا کہ باقی کی کہانیاں بھی میں یکسوئی کے ساتھ پڑھ لوں۔ایک بار پھر ایسا خوبصورت تحفہ بھیجنے کے لیے آپ کا بہت بہت شکریہ۔لکھتے رہیے۔ ایشور کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

دیپک کنول

۶/جون ۲۰۱۲ء

جموں۔

محترمہ بہل صاحبہ، آداب و نیاز۔

گزشتہ گیارہ روز سے صاحبِ فراش ہوں ابھی یہ سلسلہ جاری رہے گا۔اس کا مجھے سب سے بڑا فائدہ یہ پہنچا ہے کہ ''بدلی میں چھپا چاند'' کے سب افسانے پڑھ لئے ہیں ورنہ یہ سلسلہ قسطوں میں جاری رہتا۔ میں ہر اس مجموعے کو پڑھتا ہوں جو مجھے موصول ہوتا ہے۔تمام کہانیاں خوب سے خوب تر ہیں کس کس کی تعریف کی جائے۔تمام افسانوں میں نت نئے تجربات ہیں جو ایک سوال کی طرح کھڑے ہو جاتے ہیں۔کیا آپ خود اُن سے گزری ہیں یا صرف سُنے ہیں؟ افسانوں میں آپ کی بے باکی بھی متوجہ کرتی ہے۔آپ بات کہنے کا ڈھنگ جانتی ہیں اور یہ ڈھنگ ہی افسانہ کا فن ہے۔قاری شروع سے لے کر آخر تک افسانہ کے ساتھ جڑا رہتا ہے۔

عرش صہبائی

۸/اپریل ۲۰۰۹ء

پٹنہ۔

محترمہ رینو جی! آداب۔

بے حد ممنون ہوں کہ آپ نے اپنا تازہ افسانوی مجموعہ ''خوشبو میرے آنگن کی'' پڑھنے کا موقع فراہم کیا۔ میں نے مجموعہ وصول ہونے کی اطلاع فوراً ای میل کے ذریعہ دیدی تھی آپ تک یقیناً پہنچی ہوگی۔

میں رسائل کے توسط سے آپ کی کہانیاں قبل بھی پڑھتا رہا ہوں اور کچھ شعری تخلیقات بھی پڑھی ہیں اور ان کے حوالے ذہن پر خوشگوار تاثرات بھی ہیں۔تازہ مجموعہ میں نے فرصت کے لمحات نکال کر اطمینان اور توجہ سے پڑھا۔سب سے اچھی بات یہ لگی آپ کی کہانیوں کی فضا مانوس لگتی ہے اور ان میں اپنائیت کا احساس ہوتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ عام زندگی، آس پاس کی زندگی اور گھریلو واقعات سے کہانی کا تانا بانا بن لیتی ہیں اور انہیں بڑی آسانی سے کہانی میں ڈھال دیتی ہیں۔اس پروسیس میں بڑے فطری ڈھنگ سے مسائل کی بدحالی پر انگلیاں بھی رکھتی جاتی ہیں اور ان کا حل ڈھونڈنے کے لیے قاری کو آمادہ بھی کر لیا جاتا ہے لیکن کمال یہ ہے کہ کہیں بھی وعظ و نصیحت کا گمان نہیں ہوتا۔ مجموعہ اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ آپ کا مشاہدہ گہرا ہے اور آپ کا ذہن غور و فکر کرنے والا ہے۔

آپ کے اسلوب میں بھی بڑی روانی اور شگفتگی کا احساس ہوتا ہے جو قاری کو شروع سے آخر تک اپنی گرفت میں رکھتا ہے۔میری دانست میں تمام اوصاف کامیاب افسانہ نگار کے ہیں۔ دعا گو ہوں کہ آپ کا ارتقائی سفر مزید روانی کے ساتھ ہو اور یہ مجموعہ آپ کی شہرت میں مزید اضافہ کا سبب بنے۔اس مجموعہ کی اشاعت پر میری جانب سے دلی مبارکباد قبول کریں آخر میں آپ کی عنایت کے لیے ایک بار پھر شکر گزار ہوں۔اُمید ہے آپ بخیر و عافیت ہوں گی۔

امام خورشید

۲۲/مارچ ۲۰۰۷ء

لاہور۔

شریمتی ڈاکٹر رینو بہل، نمستے۔

آپ کا خط اور افسانہ ''دھند'' ملے۔میں جناب مہندر پرتاپ چاند کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے آپ سے ماہنامہ رشحات کا تعارف کرایا۔اب آپ سے گزارش ہے کہ اپنے حلقے میں بھی اس جریدے کو متعارف کرائیں۔عین ادب کی خدمت ہوگی۔

یہ ٹھیک ہے کہ ہندوستان میں اب اردو کا اتنا چرچا نہیں ہے لیکن یہ جان کر خوشی ہوتی ہے کہ حکومتی سطح پر اردو کی سرپرستی ہو رہی ہے۔تقریباً تمام ہندوستان میں اُردو کے فروغ کے لیے کام ہو رہا ہے۔ یہ بات باعثِ طمانیت ہے۔ میرے خیال میں بزرگوں کو چاہیے کہ وہ نوجوان نسل کو بھی اس طرف راغب کریں۔کیونکہ زبانوں کا جاننا اور ان میں ادب پارے تخلیق کرنا انسان کی اعلیٰ ظرفی کا ثبوت ہے۔آپ نے دیکھا ہوگا کہ مختلف زبانوں کے ادب پارے مختلف زبانوں میں ترجمہ کیے جا رہے ہیں۔اس سے ہی اندازہ لگالیں کہ زبانوں کی کتنی اہمیت ہے۔ میری یہ خواہش ہے کہ ہندی کے لٹریچر کو اردو میں ترجمہ کر کے شائع کیا جائے۔اس سلسلے میں اگر آپ میری مدد کر سکیں تو ممنوں ہوں گا۔

آپ کا افسانہ موجودہ معاشرے پر زبردست طنز ہے اور ہمارے معاشرے کی فعال پذیری کی طرف اشارہ کرتا ہے۔جون کے شمارے میں شامل ہوگا۔فی الحال مئی ۲۰۰۴ء کا شمارہ حاضرِ خدمت ہے۔ میں چونکہ بیمار رہتا ہوں اس لیے پرچہ ذرا تاخیر سے شائع ہوتا ہے لیکن ہوتا باقاعدگی سے ہے۔امید ہے آپ کو پسند آئے گا۔اپنی رائے سے ضرور نوازیے گا۔شکریہ

میری صحت کے لیے دعا ضرور کیجیے گا۔

اقبال سحر انبالوی

☆

''خوشیوں کا جال''

ڈاکٹر رینو بہل

بچپن بھی کتنا معصوم کتنا نادان ہوتا ہے اور کبھی کبھی بچپن کی نادان ادھوری خواہش تاعمر سینے میں پھانس کی طرح چبھتی رہتی ہے۔ گاہے گاہے سر اُٹھاتی ہے اور اپنے پورے نہ ہونے کا احساس دلاتی رہتی ہے۔ ''میری چندا، میری جان، میری لاڈو، میں واری، میں صدقے'' بچپن میں جب جب یہ الفاظ میں اپنی چاچی کی زبان سے اپنی اکلوتی لاڈلی بیٹی کے لیے سنتی تو حیرت کے مارے سر سے پاؤں تک اُن کی بیٹی کا جائزہ ضرور لیتی کہ اُس میں کیا خاص بات ہے، کون سے سُرخاب کے پر لگے ہیں جو ہم میں نہیں۔ ہماری ماں کے منہ سے تو کبھی ایسے الفاظ نکلتے ہی نہیں اور نہ ہی وہ چاچی کی طرح ہمیں بانہوں میں بھر کر چومتی اور لاڈ کرتی ہیں۔ چاچی کو حسرت بھری نگاہ سے بیٹی کے ساتھ اس طرح لاڈ کرتے دیکھتی تو معصوم ذہن میں اپنی ماں کو شکایت بھرے لہجے میں کہتی کہ وہ ہم سے بھی چاچی جیسے لاڈ کیوں نہیں کرتی تو وہ کھردرے انداز میں کہتی ''مجھے نہ تو ایسے چونچلے آتے ہیں اور نہ ہی میرے پاس وقت ہے ان باتوں کا'' ان کا ٹکا سا جواب سن کر دل مسوس کر رہ جاتی۔ پھر میں سوچتی ہوسکتا ہے وہ ان کی اکلوتی اولاد ہے اور ہم چار بہنیں شاید اسی لیے وہ اُن کی آنکھوں کا تارا ہے۔ حقیقت تو یہ تھی کہ ماں نے کبھی اپنی ممتا، اپنا پیار اس طرح ہم پر لنڈھایا ہی نہیں تھا شاید انہیں یہ سب آتا ہی نہیں تھا یا پھر اُن کے پاس وقت ہی نہیں تھا ان سب باتوں کے لیے۔ اکیلی ہی گھر کا سارا کام سنبھالتی۔ صبح سے لے کر شام تک وہ گھر کے کاموں میں مصروف رہتیں۔ دیر تک سونے کی اجازت بالکل نہیں تھی۔ گرمی ہو یا سردی صبح سویرے ہی ہمیں نہانا پڑتا۔ سردیوں کے موسم میں اگر ہم میں سے کسی نے نہانے سے آنا کانی کی تو ایسی ڈانٹ پڑتی کہ ہم میں سے کوئی بھی دوسری بار کچھ کہنے کی ہمت نہ کرتا۔ بِنا نہائے ناشتہ بھی نہیں ملتا تھا۔

ماں ضد کی بڑی پکی تھیں۔ اُن کی دلی خواہش تھی کہ وہ اپنی بیٹیوں کو اچھی تعلیم دیں۔ انہیں اپنی تعلیم بیچ میں ہی چھوٹ جانے کا بڑا رنج تھا۔ اس وقت کے بہترین انگریزی میڈیم سکول میں داخلہ دلوانے کی ضد پکڑ لی۔ باب کہتے تھے کہ ''میں اکیلا کمانے والا ہوں میرے لئے مشکل ہو جائے گا چاروں کو اس سکول میں پڑھانا'' ماں ضد پر اڑی رہی کہ ''میری بیٹیاں اسی سکول میں پڑھیں گی۔ آپ چاہیں تو میں گھر کے دوسرے اخراجات میں کٹوتی کر لوں گی۔ اگر ایک ساڑھی میں گزارا کرنا پڑا تو کر لوں گی مگر وہ پڑھیں گی وہیں'' پاپا تو ویسے بھی ہم سب پر جان چھڑکتے تھے اور ماں کے منہ سے نکلی ہر بات پوری کرنا تو وہ اپنا فرض سمجھتے تھے۔ ماں کی ضد کے آگے پاپا کو جُھکنا پڑا۔

ہمیں یاد نہیں کہ بچپن میں ہم نے کبھی ماں کو رات کے وقت اٹھایا ہو اگر ہمیں کوئی بھی تکلیف ہوتی تو ہم پاپا کو ہی اٹھاتے۔ معلوم تھا کہ اگر انہیں اٹھایا تو ڈانٹ پڑے گی۔ ویسے بھی ماں سے زیادہ ہم پاپا کو اپنا چھوٹا بڑا ہر مسئلہ بتانا پسند کرتے تھے۔ صبح سویرے ہی وہ گھر کے کاموں میں مصروف ہو جاتیں اور جب تک گھر کے سبھی کام نپٹا نہ لیتیں اُن سے بات کرنا فضول ہوتا۔ صفائی کا حد سے زیادہ شوق تھا گھر میں کوئی بھی چیز اپنی جگہ سے ہلنی نہیں چاہیے جو چیز جدھر سے اٹھائی وہیں پر رکھنی چاہیے۔ بڑے سلیقے سے اُنہوں نے گھر کو سجا سنوار کر رکھا تھا۔ بچپن سے ہی ڈانٹ ڈانٹ کر ہمیں ایسی عادت ڈال دی تھی کہ کوئی بھی چیز کبھی اِدھر اُدھر نہیں پھینکی۔ جب تک کام ختم نہ کر لیتیں چہرے سے ایسے لگتا جیسے غصّہ ناک پر رکھا ہو۔ یہ بات خاندان میں مشہور تھی کہ ''صبح والی شکل'' اور ہوتی ہے اور کام سے نپٹنے کے بعد والی شکل دوسری ہوتی ہے۔ پھر تو ان کا چہرہ پُرسکون اور مطمئن نظر آتا۔ پاپا کے ساتھ مل کر یا یوں کہیے کہ اُن کی شہہ پر ہم شرارت میں اُنہیں خوش کرنے کے لیے آپس میں ایسی حرکتیں اور باتیں کرتے جنہیں سن کر وہ مندمند مسکرا دیتیں۔ چہرے پر بناوٹی غصّہ اور لبوں میں دبی ہنسی اُس وقت اُن کی وہ دبی دبی مسکراہٹ بھی بہت بھلی لگتی اور یہ دیکھ کر ہم سب کھلکھلا کر ہنس دیتے۔

اُن کے غصّے اور رعب سے ہم کیا ہمارا بخار بھی ڈرتا تھا۔ دو دن اگر بخار ٹکا رہا تو تیسرے دن ماں کہہ دیتی تھی ''اگر کل تک تمہارا بخار نہیں اُترا تو بستر گھر سے باہر پھینکوا دوں گی'' اور سچ میں اگلی صبح بخار غائب ہو جاتا۔ اگر کبھی سکول نہ جانے کا جی چاہتا تو اس وقت پیٹ درد کا بہانہ ہی سب سے مناسب لگتا مگر ماں کے آگے سبھی بہانے فیل ہو جاتے۔ ماں اُسی وقت دوا کھلاتی اور بستہ ہاتھ میں تھما کر سکول کے لیے روانہ کر دیتی۔ آندھی آئے یا طوفان، گرمی ہو یا سردی یا برسات سکول سے بے وجہ چھٹی کبھی ملی ہی نہیں۔ ماں نے ایسی دہشت پھیلا رکھی تھی کہ ہم سب اُنہیں ''ہٹلر'' کہہ کر چھیڑتے۔

لاڈ پیار (بقول ماں کے چونچلے) تو بہت دُور کی بات ہے اُنہوں نے ہمیں کبھی روٹھنے پر منایا بھی نہیں۔ بچپن میں کبھی کسی بات پر اگر کوئی بھی ناراض یا غصّہ ہو جاتا تو ماں کبھی نہ مناتی۔ پاپا ضرور منانے کی کوشش کرتے اور ناراضگی میں اگر کھانے سے انکار کر دیا تو دونوں میں سے کوئی بھی دوسری بار کھانے کے لیے نہیں بلاتا۔ بے شک دو دن گزر جائیں بھوکے رہتے۔ خود ہی اپنا غصّہ اور ناراضگی نگلنی پڑتی تھی اور بے شرموں کی طرح کھانا کھانا پڑتا تھا۔ پاپا ہمیشہ کہتے تھے ناراضگی اپنی جگہ، غصّہ اپنی جگہ مگر کھانے کی رزق کی ناقدری نہیں ہونی چاہیے۔

صبح سکول جانے سے پہلے ماں سے چوٹی بنوانا بھی کوئی آسان کام نہیں تھا۔ ماں جلدی جلدی کام پر ہاتھ چلاتے ہوئے چوٹی اس قدر کس کر باندھتیں کہ جیسے سارا زور میرے بالوں پر ہی آزمایا گیا ہے۔ چوٹی بناتی بھی

جاتیں اور بُڑبڑاتی بھی جاتیں ''اتنی بڑی ہوگئی مگر ابھی تک بال بنانے نہیں آئے۔سلیقے سے بال سلجھانے بھی نہیں آتے۔اگر تم نے جلد بال بنانے نہ سیکھے تو بال ہی کٹوادوں گی'' اُن کی بال کٹوانے کی دھمکی کے ڈر سے میں نے جلد ہی چوٹی بنانی بھی سیکھ لی۔ ماں کو میرے بال بنانے سے تو چھٹی ملی ہی ساتھ ہی ساتھ چھوٹی بہنوں کے بال بنانے سے بھی فراغت مل گئی۔

آٹھویں جماعت تک پہنچتے پہنچتے ماں نے گھر کے کاموں میں اپنا ہاتھ بٹانے کے لیے کچھ کاموں کی ذمہ داری بھی سونپ دی۔کام تو مجبوراً کرنا پڑتا مگر اس وقت کام ایسے کرتی جیسے اُن پر احسان کر رہے ہوں۔اُن کی مرضی کے بنا گھر میں پتّا بھی نہیں ہلتا تھا۔انہیں اپنی بات منوانے کا، دوسروں سے (ہم سب سے) کام لینے کا ہنر بخوبی آتا تھا اور خاص بات یہ تھی کہ کبھی کسی سے منّت کر کے، اُسے بہلا پھسلا کر کام نہیں کروایا ہمیشہ رعب سے اور حکم سے ہی کام کروایا۔ ہم سب مل کر جب انہیں باتوں میں گھیر لیتے تو اکثر کہا کرتے ''آپ تو خوش قسمت ہیں آپ کو کوئی رعب ڈالنے والا رشتہ ملا ہی نہیں۔نہ ساس نہ نند اور اُوپر سے نہ گھر میں بہو آئے گی۔اگر ایک بیٹا ہوتا تو پھر آپ بیٹے کے اشاروں پر ناچتیں۔اب تو ہم سب کو انگلیوں پر نچا رہی ہیں۔''

ماں کے لیے مائیکے اور سُسرال والے سب برابر تھے۔کسی کو فضول بات کہتی نہیں تھیں اور فالتو بات سُنتی بھی نہیں تھیں۔مائیکے والوں کی خامیوں پر کبھی پردہ نہیں ڈالا اور سُسرال والوں کی بات کبھی اچھائی نہیں۔دل میں کسی کے لیے ناراضگی رکھ کر اُس شخص سے کھلے دل سے کبھی ملی بھی نہیں۔جو دل میں ہوتا چہرے پر صاف نظر آتا۔اُنہیں اپنے جذبات چھپانے کا ہنر بھی نہیں آتا تھا۔ سُسرال تو دُور کی بات ہے وہ کبھی مائیکے بھی زیادہ دن نہیں رکتی تھیں۔اپنے گھر سے دُور رہنا اُنہیں پسند ہی نہیں تھا۔سکون انہیں اپنے گھر لوٹ کر ہی ملتا۔

جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی اکثر مائیں بیٹیوں کی دوست بن جاتی ہیں مگر ہمارے رشتے میں ایسا کبھی نہیں ہوا۔ماں سے زیادہ ہم اپنے پاپا کے قریب تھے۔وہ صرف ہمارے والد ہی نہیں بلکہ بڑے بھائی اور دوست بھی تھے۔ ہم بہنیں اپنا سکھ دُکھ، اپنی ہر تکلیف آپس میں مل بیٹھ کر بانٹ لیتی تھیں ہم چاروں میں اتحاد بہت تھا۔اگر کسی ایک کو بھی ماں سے کسی بات پر ڈانٹ پڑ جاتی تو سبھی ماں کے خلاف مورچہ باندھ لیتیں اور ماں ہم سب پر اکیلی ہی بھاری پڑتیں اور اُس وقت ماں بیٹیوں کے بیچ چل رہی اعصابی جنگ (Coldwar) کو پاپا ہی ختم کرواتے۔وہ ایک ایسی کڑی تھی ہم لوگوں کے بیچ جس نے ہم سب کو ہمیشہ جوڑے رکھا اور پھر پاپا کے چلے جانے کے بعد ہماری زندگی ہمارے رشتے ہی بدل گئے۔

عمر کے چالیس سال ماں کے ساتھ رہتے ہوئے بھی میں ماں کے کبھی اتنے قریب نہ تھی جتنی پاپا کے چلے جانے کے بعد ہوئی۔پاپا کا اچانک سڑک کے حادثے میں چل بسنا، ہماری زندگی کا سب سے بڑا سانحہ تھا۔ماں کی تمام عمر اپنے شوہر، بچوں اور گھر کے اردگرد گھومتے ہی گزری۔ہمیں ڈر تھا کہ یہ طوفان اُنہیں توڑ نہ ڈالے مگر وہ بظاہر مضبوط چٹان کی طرح ہمیں تحفظ دیتی رہیں۔ہمیں اُن کے آنسوؤں سے تکلیف نہ ہو اس لیے وہ ہم سے اپنا غم، اپنا درد اپنے آنسو چھپاتی رہیں۔اتنے بڑے حادثے کا اس قدر ڈٹ کر مقابلہ کیا کہ وہ نہ تو خود ٹوٹیں اور نہ ہمیں ٹوٹنے دیا۔اس غم نے ہمیں توڑنے کی بجائے اک دوسرے سے مضبوطی کے ساتھ جوڑ دیا۔ماں کے لیے دل میں جو بدگمانیاں رہتی تھیں وہ سب آنسوؤں کی برسات اور درد کے سیلاب میں بہہ گئیں۔

پاپا کے جانے کے بعد ایک خلا پیدا ہو گیا تھا اور وقت کے مرہم نے ہمارے رشتوں، ہماری سوچ، ہمارے نظریے کو بدل کر رکھ دیا۔اولاد ہمیشہ اپنے والدین کی محبت، اُن کی قربانیوں، اُن کی تکلیفوں، اُن کی شفقت کو For granted ہی کیوں لیتی ہے؟

حالات جب بدلتے ہیں تو نظریہ بھی بدل جاتا ہے اور جب احساس ہوا تو خود پر شرمندگی بھی ہوئی۔پیچھے مڑ کر دیکھا تو سب ویسا نہیں تھا جیسا سوچتے رہے۔کیسے وہ اکیلی ہم چاروں بہنوں کو ہر روز سفید یونیفارم دُھلی دھلائی پریس کی ہوئی پہنا کر سکول جانے سے پہلے ناشتے کے ڈبے تیار کر کے دیتیں اور ہمارے سکول سے لوٹنے سے پہلے گھر کو سلیقے سے سجا سنوار کر رکھتیں۔اگر وہ رات کو ہماری طبیعت خراب ہونے پر ہمارے اُٹھانے پر ہمیں ڈانٹتی تھیں تو یہ ہم کیسے نہ دیکھ سکے کہ سارا دن اکیلی جان تھک ہار کر ہی تو سوئی ہوگی۔اگر کوئی چیز ہماری پسند کی نہ بنتی تو ہم اُن پر احسان کر کے کھانا کھاتے۔اولاد بھی کتنی ناشکری ہوتی ہے۔

رسوئی کا کام تو ماں نے عرصہ پہلے چھوڑ دیا تھا مگر صفائی ستھرائی آج بھی وہ اپنی نگرانی میں ہی خادمہ سے کرواتی ہیں۔تہتر برس کی عمر میں پہنچ کر بھی اُن کی صفائی اور گھر سجانے کا جنون برقرار ہے۔اب بھی وہ صبح سویرے اٹھ جاتی ہیں۔شاید پانچ یا سات منٹ وہ گھر کے مندر میں دھوپ بتی کر، آنگن میں لگی ''تلسی'' کو پانی دے، پرندوں کے لیے باجرا ڈال، ان کے کٹورے کو پانی سے بھرنے کے بعد اپنی Dusting کا کام شروع کر دیتی ہیں۔ہم لوگ کہتے ہیں ''ریٹائرمنٹ لے لو۔اس عمر میں تو سرکار بھی ریٹائر کر دیتی ہے۔'' اور اُن کا وہی مخصوص جواب ہوتا ہے ''جب تک ہاتھ پاؤں چلیں گے یہ سب کروں گی، مجھے اچھا لگتا ہے۔'' یہ کام صرف اس دن نہیں ہوتا جب اُن کی طبیعت حد سے زیادہ ناساز ہو، ورنہ تھوڑی بہت تکلیف کی تو وہ پرواہ بھی نہیں کرتیں۔آج بھی وہ ہمیں چیز اِدھر اُدھر بے ترتیبی سے پھینکنے پر اسی طرح ڈانٹتی ہیں جیسے بچپن میں ڈانٹتی تھیں۔سچ تو یہ ہے کہ اب ان کی یہ ہی ڈانٹ بھلی لگتی ہے اور اگر وہ ایسا کرنے پر نہ ڈانٹیں خاموش رہیں تو سمجھو طبیعت زیادہ خراب ہے اور اُن کی خاموشی ہم سے برداشت نہیں ہوتی۔

بچپن میں ہم نے انہیں محلے کی عورتوں کے ساتھ بیٹھ کر وقت گزارتے نہیں دیکھا۔دعا سلام تو سب سے تھی مگر کسی کے گھر جانے کی عادت

نہیں تھی۔ پاپا کی عادت تھی ہر کسی کو بُلا کر ملنا، خوش دل، خوش مزاج اتنے کہ ہر عمر کے شخص سے بہت جلد گھُل مل جاتے۔ بیگانوں کو اپنا بنانے میں دیر نہیں لگتی تھی اور اس کے برعکس ماں صرف کم گو ہی نہیں، لوگوں کے ملنے جُلنے، اُن سے بات کرنے سے بھی کتراتی تھیں جدھر اُن کا پاپا کے ساتھ جانا نہایت ضروری ہوتا وہیں جاتیں ورنہ پاپا کو اکیلے ہی جانا پڑتا۔ آج بھی وہ اپنے گھر میں رہنا زیادہ پسند کرتی ہیں گھر سے باہر اکیلے نہیں جاتیں نہ کسی سٹسنگ میں نہ بھجن کیرتن میں نہ Kittly Party میں۔ انہیں صرف ہمارے ساتھ ہی گھر سے باہر جانا پسند ہے۔ نہ وہ زیادہ مندروں میں جانا پسند کرتی ہیں اور نہ ہی کسی گرو کے آشرم میں۔ آج بھی ''میرا گھر میرے بچے'' اُن کا جیون منتر ہے۔ اُن کی دنیا ہم سے شروع ہو کر ہم پر ہی ختم ہو جاتی ہے۔

ہندی ناول پڑھنا اور باغبانی یہ دونوں اُن کے محبوب مشغلے ہیں۔ سکول کے زمانے سے مجھے ناول پڑھنے کی لت اُن سے ہی لگی۔ جب بھی انہیں کام سے فرصت ملتی تھی ناول لے کر بیٹھ جاتی تھیں۔ اب وہ ناول نہیں پڑھتیں بلکہ اب اُن کے لیے ہندی کے دو اخبار روز آتے ہیں اور دن میں اخباروں کا اچھا نچوڑ نکال لیتی ہیں۔ ہم سے زیادہ Update رہتی ہیں۔ باغبانی کا شوق اس حد تک تھا کہ مالی کے ساتھ ساتھ خود پودوں کی کٹنگ، کھاد، پانی وغیرہ کا خیال رکھتیں۔ پھولوں کی کیاریاں ہمیشہ موسم کے پھولوں سے کھلی رہتیں۔ گلاب، بکن بیلیاں، رات کی رانی، ڈیلیاں، سویٹ پیز موسم کے حساب سے کھلے رہتے۔ آج بھی اُن کا یہ شوق قائم ہے فرق صرف اتنا ہے کہ اب یہ پھول کیاریوں میں نہیں گملوں میں موسم کے مطابق لگواتی ہیں۔

بچپن میں لاڈ، پیار، دلار کے معنی الگ تھے۔ اُس عمر میں چونچلو (ماں کی زبان میں) کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اور یہ ہر بچے کی خواہش ہی نہیں حق بھی ہوتا ہے۔ ماں کا یہ لاڈ بچے کو محسوس کراتا ہے کہ اُس کا وجود کتنا خاص ہے۔ میرے اندر کی بچی آج بھی اس محرومی کو محسوس کرتی ہے۔ اب میں نے اس بچی کو مطمئن کرنے کا طریقہ تلاش کر لیا ہے۔ ماں نے لاڈ نہیں کیا تو کیا اب میں آتے جاتے ماں کے گال کھینچ کر، اس کے پیٹ کو آٹے کی طرح گوندھتے ہوئے اُسے چھیڑ کے، تنگ کر کے اپنا لاڈ جتا لیتی ہوں۔ ایسا کرنے سے وہ مصنوعی غصّہ دکھاتی ہیں۔ غصّے میں لپٹی وہ ہلکی سی ہنسی جو چھپائے نہیں چھپتی، وہ بڑی بھلی لگتی ہے۔ ہم تو اُنہیں لاڈ جتانا سکھا نہیں سکے اور اُن کی اگلی پیڑھی نے انہیں تھوڑا تھورا یہ ہُنر سکھا دیا ہے۔ اپنے نواسے اور نواسی سے لاڈ کرنا سیکھ گئی ہیں، اُن پر واری بھی جاتی ہیں، ان کے صدقے بھی اُتارتی ہیں۔ ''صبح والی شکل'' سے وہ بھی اب بخوبی واقف ہیں۔

صبح وہ اپنے بال خود بناتی ہیں اور شام کو اُمید کرتی ہیں کہ ہم اُن کے بال بنائیں۔ شرارت میں بھی کس کر اُن کی چوٹی بنانے لگتی ہوں تو کہتی ہیں ''آہستہ کرو مجھ میں ہمت نہیں تمہارا زور سہنے کی۔'' اور جب ماں پر زیادہ پیار آ جائے تو جیسے پاپا ماں کو نام سے پکارتے تھے ہم بھی ویسے ہی اُن کے نام سے بلانے لگتی ہیں اور وہ بھی مسکرا کر ویسے ہی جواب دیتی ہیں جیسے پاپا کو دیا کرتی تھیں۔ بچپن میں کہتی تھیں کہ ''آندھی آئے یا طوفان سکول تو تمہیں جانا ہی ہے کوئی چھٹی نہیں لینی'' اور اب کہتی ہیں ''گرمی بہت بڑھ گئی ہے کچھ دن دفتر سے چھٹی ہی لے لو'' اب انہیں ہماری چھٹی کا انتظار ہوتا ہے۔ بچوں کی طرح نئی نئی چیزوں کی فرمائش کریں گی اور اگر فرمائش پوری نہ کرو تو منہ پھُلا کر بیٹھ جائیں گی۔ پہلے وہ ہمارے لیے اپنی پسند کے کپڑے بنواتی تھیں اور اب وہ ہماری پسند کے کپڑے پہننا پسند کرتی ہیں۔ وقت کا پہیہ واپس گھوم رہا ہے۔ اب رول بدل گئے ہیں۔ اب وہ ماں نہیں رہی میری بیٹی بن گئی ہیں اور میں اُن کی ماں۔

مجھے رنج اس بات کا ہے کہ جس قدر ٹوٹ کر انہیں میں اب پیار کرتی ہوں اتنے سال کیوں نہیں کیا۔ کیوں میں اُن کی قربانیاں دیکھ نہ سکی؟ ان کی صحت کی فکر تب بھی ہوتی تھی، دعائیں تو میں تب بھی کرتی تھی اُن کی عمر درازی کے لیے مگر اب میرے پاس میرا سرمایہ صرف ''میری ماں میری بیٹی'' ہی ہے۔ دن رات اُن کی صحت یابی اور لمبی عمر کی دعائیں کرتی ہوں۔ خود کو خوش نصیب تسلیم کرتی ہوں کہ ممتا کے سایہ دار شجر کی ٹھنڈی ہوائیں میرے وجود، میری روح کو تر و تازہ کر رہی ہیں۔ پرماتما اُن کا سایہ ہمارے سر پر بنائے رکھے۔ اسی طرح وہ ہم پر حکم چلاتی رہیں، ہمیں ڈانٹتی رہیں اور روز بہ روز نئی نئی فرمائشیں کرتی رہیں اور میں ہر روز انہیں دیکھ کر مامتا بھرے یہ اشعار دہراتی رہوں۔

یارب میری ماں کو لازوال رکھنا
میں رہوں نہ رہوں میری ماں کا خیال رکھنا
میری خوشیاں بھی لے لو میری سانسیں بھی لے لو
مگر میری ماں کے گرد سدا خوشیوں کا جال رکھنا

سوجایئے

نیند کی کمی اور انسانی دماغ کے افعال کی ساخت میں تبدیلی کے حوالے سے کی گئی تحقیق میں یہ ثابت ہوا ہے کہ جو لوگ اوسط سے کم سوتے ہیں اُن کا دماغ جلد بوڑھا ہو جاتا ہے۔ طبی ماہرین کے مطابق ایک گھنٹہ کم نیند لینے والے پچپن افراد کے دماغ کا معائنہ کرنے پر معلوم ہوا کہ اُن کے دماغ کی ساخت تبدیل ہو رہی ہے جس کے باعث اُن میں چڑچڑاپن اور سوچنے کی صلاحیت بھی متاثر ہو رہی ہے۔

براہِ راست

ڈاکٹر رینو بہل اردو ادب کی ایسی خاتون افسانہ نگار ہیں جن کے نام کے ساتھ وہ تمام الفاظ والقاب جو کسی بھی تخلیق کار کو شہرت وناموری کے پائیدان پر کھڑا کرتے ہیں قطعی نہیں لگتے۔ نہ اُن کے کارناموں کا طُور مارا ایسا ہے جو اُنہیں ادب میں خاص، منفرد مقام ومرتبے کا مستحق ٹھہراتا ہو۔

ایک اعزاز، ایک اختصاص اور ایک فخر جو ڈاکٹر رینو بہل کو قدرت نے عطا کیا ہے وہ ہر کس وناکس کے حصّے میں نہیں آتا۔

جی ہاں! بھارت کے دوصوبوں ہریانہ اور پنجاب کی واحد اور اکلوتی خاتون افسانہ نگار ڈاکٹر رینو بہل نے ہندی اور انگریزی کی عمدہ استعداد کے باوجود گزشتہ دو دہائیوں سے اردو زبان وادب کا پرچم نہایت جرأت و بہادری سے تھام کر شعر مذکور کی تفسیر بنی ہوئی ہیں:

مٹادے اپنی ہستی کو اگر کچھ مرتبہ چاہے
کہ دانا خاک میں مل کر گل وگلزار ہوتا ہے

ہستی کو مٹانے کا یہ عمل اپنی ذات یا اَنا کی تسکین کے لیے نہیں صرف اور صرف اردو زبان وادب کی سربلندی وسرفرازی اور سروقامتی کے لیے ہے۔ اسی عشقِ صادق میں پنجاب و ہریانہ میں رینو بہل کا نام اردو افسانہ اور اردو افسانے کا نام رینو بہل سے جانا جاتا ہے۔

تو آیئے! آج کی محفل میں یکسو و یک آواز ہو کر بے لوث خادم اردو ڈاکٹر رینو بہل کی ادبی خدمات کا اعتراف بھی کیجیے اور تمام مروّج تنقیدی اوزان و پیمانوں کی مدد سے اُن کے ادبی مقام ومرتبے کا تعین بھی کیجیے!!!

گلزار جاوید

☆ گفتگو کا آغاز اپنے نام کے لاحقے ''بہل'' سے کیجیے تاکہ ہمارے قارئین کو آپ اور آپ کے پرکھوں کے حوالے سے کچھ مفید معلومات دستیاب ہوں؟

☆☆ ''بہل'' میرا اسم ہے اور ''بہل'' کھتری ہوتے ہیں۔ میرے آباو اجداد راولپنڈی کے علاقے چکلالہ (پاکستان) سے تھے۔ ملک کے بٹوارے سے پہلے چکلالہ میں پلیگ کی ایسی وبا پھیلی کہ پورا علاقہ اس کی چپیٹ میں آ گیا۔ میرے دادا جن کی آنکھوں کے سامنے ایک ایک کر کے گھر کے سبھی افراد نے دم توڑ دیا تھا، وہاں سے جان بچا کر بھاگنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس وقت وہ شاید لڑکپن اور جوانی کی درمیانی عمر میں تھے۔ کشمیر کی وادیوں میں کئی جگہ بھٹکتے بھٹکتے وہ بھدرواہ پہنچ گئے۔ کئی سال وہاں قیام کیا اور وہیں اُن کی شادی کشمیری براہمن پریوار کی لڑکی سے ہوئی۔ جو ''بال ودھوا'' تھی۔ اس زمانے میں ''بال ودھوا'' کی شادی اور وہ بھی دوسری برادری میں بہت بڑی بات سمجھی جاتی تھی۔ شادی کے بعد دونوں ڈھلھوزی آ کر بس گئے۔ ہمارے لیے ہمارا خاندان، ہمارے پُرکھوں کی فہرست لالہ کشن چند بہل ہمارے دادا سے ہی شروع ہوتی ہے۔ ملٹری میں ٹھیکیداری کا کام تھا اُن کا۔ والد صاحب چھ بھائی تھے، ایک بڑا اور چار چھوٹے۔ چودہ سال کی عمر میں میرے والد صاحب کے سر سے ماں کا سایہ اٹھ گیا۔ دادا نے اکیلے ہی بیٹوں کی پرورش کی، دوبارہ شادی نہیں کی۔ میری ایک کہانی ''رفاقتوں کا سفر'' انہیں کی زندگی پر مبنی ہے۔

☆ کچھ تفصیل تعلیمی ایام کے مشاغل اور مصروفیات کے حوالے سے بھی بتلایئے؟

☆☆ والد صاحب کی نوکری پنجاب یونیورسٹی، چندی گڑھ میں لگ گئی تو ڈھلھوزی چھوٹ گیا۔ میری تعلیم چندی گڑھ میں انگریزی میڈیم سکول سے ہی ہوئی۔ ۱۹۷۴ء میں میں نے دسویں پاس کی اور دو سال کا سیکرٹریل پریکٹس ڈپلوما میں داخلہ لے لیا اور ساتھ کے ساتھ پرائیویٹ بی۔ اے بھی شروع کر دیا۔ ادھر کورس پورا ہوا اور اِدھر مجھے ۱۹۷۶ء میں پنجاب سرکلر کے ادارے میں ملازمت مل گئی۔ بی۔ اے، ایم۔ اے (پبلک ایڈمنسٹریشن، پولیٹیکل سائنس اور اُردو) پھر پی۔ ایچ۔ ڈی کی پڑھائی سب میں نے نوکری کے ساتھ ہی کی۔

☆ علوم وفنون بلخصوص اردو ادب کی روایت آپ سے پہلے خاندان میں کہاں پائی جاتی ہے؟

☆☆ خاندان کے حوالے سے میں نے عرض کیا کہ ہمارا خاندان بڑا مختصر سا ہے۔ میرے والد صاحب کو اردو شاعری پڑھنے کا شوق تھا اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔

☆ آپ کو اپنے تخلیقی وصف کا احساس کب اور کیونکر ہوا اور آپ نے اُس کے اظہار کے وسیلے کس طرح تلاش کیے؟

☆☆ گلزار صاحب ہر انسان کی زندگی میں کھٹے میٹھے دن ضرور آتے ہیں۔ میری زندگی میں بھی ایک وقت ایسا آیا جب میں تناؤ، کشمکش اور گھٹن کے دور سے گزر رہی تھی۔ خود کو اس اندھیرے سے نکالنے کے لیے مجھے کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ پھر ایک روز میں نے اپنے اندر کے غبار کو کاغذ پر اُنڈیل دیا۔ اس طرح مجھے محسوس ہوا کہ قلم ہی میرا سہارا بن سکتا ہے۔ اس کے بعد میں نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ پہلے میں نے شاعری اور پھر بعد میں افسانے لکھنے شروع کر

دئے۔قلم کے اس جادو نے میری سوچ ہی بدل دی۔میری زندگی کا نظریہ بدل گیا میں ''ہڈ بیتی'' کے کرب سے نکل کر ''جگ بیتی'' کے میدان میں اُتر آئی۔

☆ آغاز آپ کا شاعری سے ہوا پھر آپ افسانے کی جانب مائل ہو گئیں؟

☆☆ یہ سچ ہے کہ آغاز میں نے شاعری سے کیا۔کئی غزلیں، نظمیں، اشعار لکھ ڈالے مگر کسی سے اصلاح نہیں کروالی۔چند غزلیں رسالوں میں چھپ بھی گئیں۔غزلیں لکھنے کے پیچھے بھی بڑا دلچسپ قصّہ ہے۔میں جگجیت سنگھ کی گائیکی کی بڑی مدّاح ہوں۔ایک دن دل میں خواہش جاگی کہ کاش ایسا ہو کہ کسی روز میری لکھی غزل جگجیت جی گائیں۔بس یہ خیال آتے ہی میں نے شاعری کرنی شروع کر دی پھر ایک روز میں اپنی ڈائری لے کر جناب کشمیری لال ذاکر کے پاس پہنچ گئی۔انہوں نے چند غزلوں کی اصلاح بھی کر دی اور تخلص رکھنے کا مشورہ بھی دیا۔لہٰذا میں نے ''صبا'' تخلص بھی رکھ لیا۔''رینو صبا''۔اُدھر جناب شباب للت صاحب جو جدید فکر و فن کے ایڈیٹر تھے ان کو اپنے افسانوں کے ساتھ ساتھ غزلیں بھی بھیجنی شروع کر دیں۔افسانے تو انہیں پسند آجاتے مگر غزلیں لال سیاہی سے خامیوں کی نشاندہی کے ساتھ واپس آجاتیں۔میں ردیف، اوزان، بحر، قافیہ کی پابندیوں میں اُلجھتی جارہی تھی۔میں کہتی کچھ تھی اور اصلاح کے بعد اس کے معنی کچھ ہو جاتے تھے۔ذاکر صاحب کا بھی یہ ہی خیال تھا کہ مجھے شاعری کی بجائے نثر پر توجہ دینی چاہیے اور میرے دل نے بھی یہ اعتراف کر لیا کہ شاعری میرے بس کی بات نہیں یہ تو خدا کی وہ نعمت ہے جو ہر کسی کو نصیب نہیں ہوتی۔اور اپنی اس نادان سی خواہش کو بچکانہ سمجھ کر درگزر کر دیا۔شاعری سے توبہ کر لی مگر شاعری پڑھنا آج بھی میرا محبوب شغل ہے۔

☆ عصمت چغتائی کو پڑھنے سے قبل آپ نے بذریعہ ہندی کس قدر اردو تخلیقات پڑھی تھیں؟

☆☆ اردو نثر کے حوالے سے میں نے پریم چند، کرشن چندر اور راجندر سنگھ بیدی کو ہندی میں پڑھا تھا اور اس کے علاوہ ہندی میں غالب، فیض احمد فیض، فراق، اقبال، کیفی اعظمی اور بہت سے مقبول شاعروں کی کتابیں پڑھی تھیں۔عصمت چغتائی کو تو اردو جاننے کے بعد ہی پڑھ پائی۔

☆ وہ کون سی تحریر تھی جسے پڑھ کر ایم۔اے اردو کرنے کی ٹھانی؟

☆☆ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا کہ میری اردو زبان سے آشنائی بی۔اے کے دوران یعنی ۸۱۔۱۹۸۰ء میں ہوئی۔اس وقت تک میں اردو زبان اور اردو ادب میں بالکل کوری تھی۔پھر جیسے جیسے اردو زبان کو جانتی گئی ادب کو پڑھنے کی ہوک پیدا ہوتی گئی اور گہرائی سے ادب کا مطالعہ کرنے کے لیے ایم۔اے سے زیادہ بہتر Option کوئی دوسرا مجھے لگا ہی نہیں۔

☆ ایم۔اے اردو کے بعد پی۔ایچ۔ڈی کا سلسلہ کب اور کیسے بنا اور اس راہ میں کیا کیا دشواریاں جھیلنا پڑیں؟

☆☆ اردو ایم۔اے میں نے ۱۹۹۳ء میں کیا۔میرے مرحوم اُستاد ڈاکٹر ہارون ایوب صاحب بڑے شفیق انسان تھے۔آج میں جس مقام پر ہوں، اس میں سب سے بڑا ہاتھ اُنہیں کا ہے۔اُن سے ہی میں نے الف، ب سے شروعات کی۔ایم۔اے کے بعد میری ادب کی طرف دلچسپی دیکھتے ہوئے انہیں نے مجھے پی۔ایچ۔ڈی کرنے کا مشورہ دیا۔چونکہ میں عصمت چغتائی کے اسلوب، اُن کی زندگی، اُن کی کہانیوں سے کافی متاثر ہوئی تھی اس لیے ''عصمت چغتائی کے افسانوں کا فنی و فکری جائزہ'' کے تحت ڈاکٹر ہارون کی ہی نگرانی میں پی۔ایچ۔ڈی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

میں نے اپنی پوری تعلیم نوکری کے ساتھ ساتھ ہی کی لیکن پی۔ایچ۔ڈی کی پڑھائی مختلف تھی۔زیادہ محنت اور زیادہ وقت مانگتی تھی۔ڈاکٹر ہارون نے اتنی اجازت دے دی تھی کہ میں کبھی بھی کسی بھی وقت اُن سے فون پر بات یا اُن سے کیمپس میں یا اُن کے گھر انہیں مل سکتی ہوں۔ان کی شریک حیات ڈاکٹر ریحانہ پروین بھی بڑی محبت سے ملتیں اور ہمیشہ آگے بڑھنے کا حوصلہ دیتیں۔میری بہت سی مشکلیں آسان ہو گئی تھیں۔وہ مجھے گائیڈ کر دیتے اور میں دیر شام تک کیمپس لائبریری میں اپنا کام کر لیتی۔افسوس اس بات کا ہے کہ جب اُن کی نگرانی میں تھیسس (Thesis) مکمل ہونے کے مرحلے پر تھا ڈاکٹر ہارون ایوب اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ان کی جگہ دوسرے گائیڈ کو مقرر کر دیا گیا سارا کام اُن کی نگرانی میں ہوا اور سہرا کسی اور کو ملا۔

☆ اس دوران آپ کے اردگرد یعنی والدین، بھائی بہن، دوست احباب، محلے دار، پڑوسی اور شریک کار کا ردِعمل کیا تھا؟

☆☆ میرے گھر میں میری اردو کی طرف دلچسپی اور پھر پی۔ایچ۔ڈی کو لے کر کوئی پریشانی نہیں تھی۔میرے پریوار نے ہمیشہ میری حوصلہ افزائی کی ہے۔آج بھی گھر سے باہر جو لوگ مجھے اردو پڑھتے دیکھتے ہیں تو حیران ضرور ہوتے ہیں۔ایسے دیکھتے ہیں کہ میں کوئی پُرانی صدی کی مخلوق ہوں۔دراصل ہمارے شہر میں اردو جاننے والی نوجوان نسل انگلیوں پر گنی جاسکتی ہے یہ زبان بزرگوں کے ساتھ وابستہ ہو گئی ہے۔

☆ پہلی اردو کہانی کب اور کس عنوان سے لکھی، اُس کی اشاعت کہاں ہوئی اور اُس کی بابت کس طرح کا ردِعمل سامنے آیا؟

☆☆ میری پہلی اردو کہانی ۳؍جنوری ۱۹۹۶ء کو بعنوان ''پرچھائیاں'' ہندسماچار، جالندھر میں چھپی۔مزے کی بات یہ ہے کہ یہ کہانی ''رینو صبا'' کے نام سے چھپی۔لوگوں نے اسے پسند کیا۔قارئین کے بہت سے خطوط بھی موصول ہوئے۔''رینو صبا'' کے نام سے کہانی چھپنا مجھے پسند نہیں آیا۔مجھے لگا یہ ''میں'' نہیں کوئی دوسرا ہی ہے لہٰذا میں نے ''صبا'' ترک کر دیا اور اپنے اصلی نام پر آگئی اور اس کے بعد رینو بہل کے نام سے ہی کہانیاں لکھیں۔

☆ کہانی لکھنے کے لیے کس قسم کا اہتمام کرتی ہیں مثلاً موڈ، ماحول،

موسم اور وقت کا کس حد تک دخل ہوتا ہے؟

☆☆ کہانی کا موڈ ایک دو دن میں نہیں بنتا۔ ایک چھوٹا سا خیال پہلے دل پر پھر دماغ پر دستک دیتا ہے اور میرے وجود میں اپنا گھر بنا لیتا ہے پھر دھیرے دھیرے وہ خیال، ذہن کے کسی گوشے میں میرے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ ایک پودے کی طرح وہ خیال بڑھتا، پنپتا جاتا ہے اور مختلف کردار اپنی صورتیں لئے اُبھرنے لگتے ہیں اور جب اُن کی دنیا مکمل ہو جاتی ہے تو وہ کِھل کر پھول بن جاتا ہے اور اس پھول کے مرجھانے سے پہلے میں اُسے توڑ کر کاغذ پر اُتار دیتی ہوں۔ اس کے لیے موڈ، ماحول، موسم نہ وقت کوئی بھی مجھے پریشان نہیں کرتا۔ بس اتنا جانتی ہوں کہ جب اس پھول کے وجود کو کاغذ پر سجا دیتی ہوں تو مجھے بہت راحت محسوس ہوتی ہے۔

☆ اکثر تخلیق کاروں پر موسمِ خزاں بھی آیا کرتا ہے۔ جب آپ سے کہانی روٹھ جاتی ہے تو آپ اُسے منانے، بلانے کے کیا جتن کرتی ہیں؟

☆☆ گلزار صاحب وہ وقت بڑا کڑا ہوتا ہے۔ کچھ دن تو میں روٹھی ہوئی کہانی کو آزاد چھوڑ دیتی ہوں اور جب وقت کچھ زیادہ خاموشی سے گزر جاتا ہے تو نئے موضوع تلاش کرتی ہوں، اُن کا سرا پکڑنا چاہتی ہوں کوشش کرتی ہوں میری کہانی اس سے بہل جائے، اُسے قبول کر لے۔ بالکل ایسے ہی جیسے روٹھے ہوئے بچے کو نئے نئے کھلونے دے کر بہلایا جائے، منایا جائے مگر یہ ہی کہوں گی کہ روٹھنے منانے والا دور دل میں ہلکی ہلکی بے چینی پیدا کر دیتا ہے۔ راحت اُسے منا کر ہی ملتی ہے۔ بقول شاعر:

اُنہیں معلوم ہے ہم کو منانا خوب آتا ہے
اسی باعث وہ روٹھ کر ہم کو ستاتے ہیں

☆ حوالہ آپ کا عصمت چغتائی اور کہانیاں آپ کی پریم چند کا مزاج رکھتی ہیں؟

☆☆ اس میں کوئی شک نہیں کہ مجھے عصمت چغتائی کی شخصیت اور ان کی کہانیوں کے اسلوب نے بے حد متاثر کیا مگر اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ میری کہانیاں بھی اُن کے رنگ میں رنگی ہوں۔ میرا یہ ماننا ہے کہ ہر انسان کی اپنی فطرت، اپنا مزاج ہوتا ہے اور میں کہانیاں اپنے مزاج، اپنی فطرت کے مطابق لکھتی ہوں اس وقت یہ نہیں سوچتی کہ یہ کس رنگ میں رنگی جائیں گی۔

☆ آپ کی کہانی جس طرح عورت کے گرد گھومتی ہے اس طرح مرد افسانہ نگاروں کی کہانیاں مردوں کے گرد نہیں گھوما کرتیں؟

☆☆ یہ کہنا سراسر غلط ہے میری کہانیاں صرف عورتوں کے ارد گرد ہی گھومتی ہیں جس کی مثال آپ میری کہانی ''ٹکڑوں میں بٹا آدمی''، ''لکیریں''، ''بیگم بادشاہ غلام''، ''لمحوں نے خطا کی صدیوں نے سزا پائی''، ''دودھ کا جلا''، ''ابھی تو میں جوان ہوں''، ''بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے'' وغیرہ وغیرہ میں مل سکتی ہے۔ ان کہانیوں میں عورت کا کردار صرف برائے نام ہے۔ میرے لیے مرد اور عورت دونوں برابر ہیں۔

☆ آپ کے نسوانی کردار مجبور محض کیوں ہوا کرتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ آپ نے کرداروں کے ہاتھ پیر باندھ کر اُن پر بہت سی قدغن لگا رکھی ہیں؟

☆☆ میری کہانیوں کی عورت تہذیب کی حدوں میں رہنا پسند کرتی ہے وہ حالات سے مجبور ضرور ہو جاتی ہے مگر زندگی سے ہار نہیں مانتی اپنے حالات سے لڑنا چاہتی ہے۔ اس کا مقابلہ آخری دم تک کرتی ہے اور اگر آپ ایسے کردار کے ہاتھ پیر باندھنا کہیں تو میں کیا کہہ سکتی ہوں بجز اس کے:

لو وہ بھی کہہ رہے ہیں بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر تو گھر کو لٹاتا نہ میں

☆ دوسروں کو تحریک، پند و نصائح کرنا آسان ہے اگر خدانہ خواستہ آپ کو ''موہ جال'' والی کملا سے حقیقی طور پر سامنا ہو تو آپ کا ردِعمل کیا ہوگا؟

☆☆ میری کہانیوں کے کردار آج کے دور کے جیتے جاگتے کردار ہوتے ہیں۔ اُن کے مسائل، اُن کی زندگی سے جڑے ہوتے ہیں۔ ''موہ جال'' کی کملا میں جب تک زندگی کے تھپیڑے سہنے کی قوت تھی اُس نے اپنے کردار کے معیار کو گرنے نہیں دیا۔ حالات کا مقابلہ ڈٹ کر کیا اور جب اُس کا ناتواں جسم خود اپنا ہی بوجھ، اپنی ہی زندگی کا بھار اٹھانے سے قاصر ہو گیا تو کردار کے معیار کو پکڑ کر کیا کرتی۔ پیٹ کی آگ کے آگے سب اصول دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں اور اگر کملا کی جگہ میں ہوتی تو میں بھی وہی کرتی جو کملا نے کیا۔ البتہ خواجہ میر درد اس وقت مجھے شدت سے یاد آتے ہیں:

سب خونِ دل ٹپک ہی گیا بوند بوند کر
اے دردؔ! بس کہ عشق سے نہیں تھا شکستہ دل

☆ آپ ہمیشہ بیانیہ کہانی ہی تحریر کرتی ہیں کبھی علامتی یا تجریدی کہانی لکھنے کو دل نہیں چاہتا؟

☆☆ گلزار صاحب میں تو اپنے دل کی غلام ہوں۔ ابھی تک دل نے علامتی کہانی لکھنے کی آواز ہی نہیں دی تو میں کیا کروں؟

☆ ''ادب برائے زندگی'' کا نظریہ آپ سے منسوب کرنے والے کس حد تک درست گردانے جا سکتے ہیں؟

☆☆ اگر لوگ میرے ساتھ ''ادب برائے زندگی'' کو منسلک کرتے ہیں تو کوئی غلط نہیں کرتے۔ میرے لیے واقعی ''ادب برائے زندگی'' ہی ہے۔ میرے قلم نے ادب کا دامن اس وقت تھاما جب میں مایوسیوں کے دور سے گزر رہی تھی۔ میں نے قلم کا سہارا کیا لیا اس نے مجھے ''میں'' کے حصار سے نکال کر دنیا میں لا کھڑا کیا۔ ادب سے وابستگی کے بعد مایوسی کی تاریک راہوں سے نکلنے میں کامیاب ہو سکی۔ اسی لیے میرے لیے ''ادب برائے ادب'' نہیں بلکہ ''ادب برائے زندگی'' ہی ہے۔ شاید مرزا غالب نے مندرجہ ذیل شعر ایسے ہی موقع پر کہا ہوگا:

بخشے ہے جلوۂ گل ذوقِ تماشا غالبؔ
چشم کو چاہیے ہر رنگ میں وا ہو جانا

☆ مشرقیت کے فروغ کا کریڈیٹ بھی آپ کو کثرت سے دیا جاتا ہے؟

☆☆ گلزار صاحب ہر ادیب اپنے ماحول، اپنے عہد، اپنی تہذیب کو اپنے ساتھ اپنی تحریروں میں لے کر چلتا ہے چونکہ میں مشرق کی باشندہ ہوں اس لیے مشرقی رنگ میری کہانیوں میں زیادہ نمایاں ہونا میری لیے باعث فخر ہے۔

☆ ایک صاحب آپ کو منٹو سے مماثلت دیتے ہوئے معاشرتی افسانہ نگار گردانتے ہیں اور آپ کو مرد اور عورت کا نباض افسانہ نگار بھی کہتے ہیں؟

☆☆ آپ کے سوال کے جواب میں کچھ کہنے کے بجائے مرزا غالب کا شعر درج کرنا بہتر ہوگا:

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

☆ وہی صاحب اقبالؔ کے حوالے سے آپ کو معاشرے کا دیدہ بینا بھی کہنے سے نہیں چوکتے؟

☆☆ یہ تو اُن کی زرّہ نوازی ہے۔

☆ کبھی کبھی آپ کے ہاں تجربہ کی کمی کا ذکر بھی کیا جاتا ہے یہاں ''اندھیرے اُجالے'' کی مثال دی جاسکتی ہے؟

☆☆ آئے دن دل دہلا دینے والے قصّے سُننے اور پڑھنے کو ملتے ہیں۔ ہمارے معاشرے میں ایسے درندے سرِ عام دندناتے پھرتے ہیں جنہیں نہ تو رشتوں کا پاس ہے نہ ہی دنیا کی شرم اور نہ خدا کا خوف۔ بچی سے لے کر بوڑھی عورت بھی اس معاشرے میں محفوظ نہیں ہے اور قانون اتنا کمزور کہ مظلوموں کو تحفظ بھی نہیں دے سکتا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ حقیقی زندگی میں گناہگاروں کو اُن کے کیے کی سزا نہیں مل پائے گی۔ کم سے کم دل کی بھڑاس، اپنی خواہش، زندگی کی کڑواہٹ سب ظاہر کر کے افسانے میں تو لکھی جاسکتی ہے۔ ''اندھیرے اجالے'' بھی اسی بھڑاس کا نتیجہ ہے۔ لاقانونیت کے خلاف بغاوت سمجھ لیجیے۔

☆ آپ کے ہاں پُنر جنم یعنی بعد از مرگ زندگی کا تصور اس قدر نمایاں کیوں ہے؟

☆☆ ہندو دیومالا (Mythology) میں اسی بات کو مانتے ہیں کہ پُنر جنم ہوتا ہے اور میں بھی اس بات کو بڑی شدت سے مانتی ہوں کہ سبھی لینے دینے کے سمبندھ ہوتے ہیں۔ سُکھ دُکھ، پیار، محبت، نفرت، خوشی غمی، وفا بے وفائی یہ سب جو ہمیں ہمارے اپنوں کے ذریعے ملتے ہیں اسی فلسفے پر مبنی ہیں۔

☆ آپ پر اکثر لوگ بسیار نویسی کا الزام بھی لگایا کرتے ہیں جس کے سبب آپ اناج کو بھوسی سے الگ کرنا بھی بھول جاتی ہیں؟

☆☆ گلزار صاحب لکھنا میری مجبوری ہے۔ میں نے پہلے بھی یہ عرض کیا کہ میں اپنی اضطرابی طبیعت کو مطمئن کرنے کے لیے لکھتی ہوں اگر لوگ الزام لگاتے ہیں تو مجھے فرق نہیں پڑتا۔ میں نے دنیا کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیا ہے:

اُٹھا لے اُنگلیاں جی بھر کے اپنے اور بیگانے
جو دیوانے ہیں کب پرواہ کرتے ہیں زمانے کی

☆ کبھی کبھی آپ کے ہاں موپساں اور منٹو کی طرز پر چونکانے کا عمل بھی دیکھنے میں آتا ہے جس کی مثال افسانہ ''دھند'' سے دی جاسکتی ہے؟

☆☆ مجھے کہانی میں چونکانے والا اسلوب پسند ہے اور عموماً لوگ بھی ایسے پسند کرتے ہیں جس کہانی میں اس کی گنجائش ہو۔ میں اختتام چونکانے والا کر دیتی ہوں۔

☆ مرد حضرات کے پاس ذاتی تجربات و مشاہدات کی شکل میں افسانوں کا مواد دستیاب ہوتا ہے آپ کا سورس اس حوالے سے کس نوعیت کا ہے؟

☆☆ میرے بھائی یہاں پر مرد اور عورتوں کے تجربات و مشاہدات کی بات کیسے آ گئی؟ کیا عورتیں بنا تجربے کے زندگی بسر کر لیتی ہیں؟ کچھ تجربے خود کی زندگی کے ہوتے ہیں کچھ دنیا کو دیکھ کر سبق آجاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں ناں کہ اگر گھوڑی نہیں چڑھے تو گھوڑی پر چڑھتے تو دیکھا ہے۔

☆ یہ بیان کس حد تک حقیقت پر مبنی ہے کہ رینو بہل کے ہاں اکتساب نہیں ودیعت ہے؟

☆☆ گلزار صاحب! بات دراصل یہ ہے کہ آپ خود پر تو کسی نہ کسی طرح کی پابندی لگا سکتے ہیں مگر دوسروں پر کسی طرح کی قدغن لگانا آپ کے بس میں نہیں۔ لہٰذا اس سوال کا جواب وہی صاحب بہتر طور پر دے سکتے ہیں جنہوں نے میرے بارے یہ رائے قائم کی۔ بہرحال میں اُن کے حسنِ ظن کے لیے شکر گزار ہوں۔

☆ جب لوگ آپ کو مشرقی پنجاب کی واحد خاتون افسانہ نگار کے طور پر یاد کرتے ہیں تو آپ کے احساسات کیا ہوتے ہیں، کیا اس طرح آپ کی ذمہ داری نہیں بڑھ جاتی؟

☆☆ مجھے اس بات کا بے حد دُکھ ہے کہ مشرقی پنجاب میں کوئی اور خاتون اردو میں افسانے نہیں لکھ رہی۔ لہٰذا اس صنف کو زندہ بھی رکھنا ہے اور معاشرے کی طرف جو ذمہ داری ہے اسے بھی پورا کرنا ہے خاص طور سے خواتین سے جڑے مسائل کو افسانوں کے ذریعے بے نقاب بھی کرنا ہے۔ ایک خاتون ہونے کے ناطے میں خواتین کی نفسیات کو شاید زیادہ بہتر سمجھ سکتی ہوں اور اس ذمہ داری کا مجھے بخوبی احساس بھی ہے۔ بقول سرور انبالوی:

جانے یہ کس نگر میں خرد لے گئی مجھے
سورج تھا سر پہ اور کوئی جاگتا نہ تھا

سو جناب کم از کم مجھے خواتین کو جگانے کا کام سونپا گیا ہے دیکھئے کامیابی کب ملتی ہے۔

☆ آپ کو صنف نازک سماجی اور معاشرتی تناضی میں جو اختصاص حاصل ہے دور، دور تک اُس کا کوئی ثانی نہیں مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ آپ نے آج کے سب سے زیادہ حساس موضوع دہشت گردی، لاقانونیت اور ناانصافی کو اُس قدر توجہ نہیں دی جس قدر دینا چاہیے تھی؟

☆☆ میں آپ کی اس بات سے متفق نہیں کہ میں نے لاقانونی، دہشت گردی، ناانصافی کے موضوع پر افسانے نہیں لکھے۔ میرا افسانہ ''وہ صبح کبھی تو آئے گی''، ''دہشتگرد'' دہشت گردی کے موضوع پر لکھے گئے ہیں۔ ''اندھیرے اجالے''، ''شاخوں پر سانپ'' معاشرے میں پھیلی لاقانونیت کے حوالے سے لکھے گئے ہیں۔

☆ آپ کی کہانیوں کے کردار درمیانہ طبقہ سے لیے جاتے ہیں جبکہ اوپر اور نیچے کے طبقات آپ کی توجہ سے محروم ہیں؟

☆☆ شاید میں خود متوسط طبقے سے تعلق رکھتی ہوں اس لیے میرے زیادہ تر افسانے اسی طبقے کو لے کر لکھے گئے ہیں مگر یہ نہیں کہ میں نے اوپر اور نیچے طبقات کے لوگوں پر توجہ نہیں دی۔ اس کی مثال آپ میرے افسانے ''چٹان کی پناہ میں آئینہ''، ''اماوس''، ''درد کا رشتہ''، ''ننھی کلی''، ''موہ جال''، ''تاریک راہوں کے مسافر''، ''ایک ہی راہ گزر'' اور ایسے بہت سے افسانے ہیں جن میں دیکھ سکتے ہیں۔

☆ ڈرامے سے آپ کی ملاقات کب اور کہاں ہوئی اور اب تک آپ کتنے ڈرامے اور فیچر تحریر کر چکی ہیں؟

☆☆ گلزار صاحب! میں آپ کے سوال کے جواب میں کسی تفصیل میں جائے بغیر ناصرہ زبیری کا ایک شعر پیش کرنا چاہوں گی:

وہ موم میرے عشق کی تاثیر سے ہوا
لیکن یہ واقعہ بڑی تاخیر سے ہوا

☆ اردو ادب میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی صنف ناول آپ کی توجہ سے کیوں محروم ہے؟

☆☆ میرے خیال میں ہر چیز، ہر کام کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے۔ مجھے لگتا تھا ناول لکھنے کے لیے بہت وقت چاہیے۔ دفتر اور گھر کی مصروفیات کی وجہ سے میں شاید وقت نہ نکال پاؤں مگر اب لگتا ہے ایسا کچھ بھی نہیں۔ ناول کا بیج تو میرے ذہن میں پڑ چکا ہے ابھی تو یہ ذہن میں ہی اپنی دنیا بسا رہا ہے۔ بہت جلد یہ خود کو کاغذ پر بکھرنے کا دباؤ ڈالے گا۔ انشاءاللہ یہ کام بھی اس سال کے آخر تک ہو جائے گا۔ بقول شاعر:

راہ پر لے آئے ہیں اُنہیں کتنی مدارات کے بعد
اور کھُل جائیں گے دو چار ملاقاتوں کے بعد

☆ جس قدر کم وقت میں آپ نے اردو ادب میں نمایاں مقام بنایا وہ آپ کی کڑی محنت اور لگن کا نتیجہ ہی گردانا جا سکتا ہے مگر ناقدین نے اُس قدر توجہ آپ کی جانب نہیں کی جتنا آپ کا حق اور اُن کا فرض بنتا تھا؟

☆☆ میں نے ادب کی دنیا میں قدم رکھتے وقت یہ نہیں سوچا تھا کہ مجھے اس سے کیا حاصل ہوگا۔ مجھے کسی صلے کی توقع بھی نہیں۔ میں تو علامہ اقبال کے خیال کی حامی ہوں:

ملت کے ساتھ رابطہ استوار رکھ
پیوستہ رہ شجر سے اُمیدِ بہار رکھ

☆ اردو ادب کی ناگفتہ صورت حال سے اگر ہم واقف نہیں ہیں تو یہ ہماری سادگی یا بے خبری ہی کہلائے گی۔ ہماری خواہش ہے کہ دو دہائیوں کے سفر کی نسبت اپنے احساسات میں ہمارے قارئین کو شریک کیجیے؟

☆☆ موجودہ دور میں اردو زبان کس موڑ پر کھڑی ہے، یہ سب جانتے ہیں۔ میں دُور کی بات نہیں کرتی اپنے اردگرد کی بات کروں تو دیکھتی ہوں کہ نہ مرے دوست احباب نہ میرے گھر کے افراد نہ میرے دفتر میں کوئی ایسا ہے جو اردو زبان سیکھنا اور پڑھنا چاہتا ہے۔ کوئی اس سے واقف نہیں۔ انہیں اردو پسند ہے مگر رسم الخط ہندی میں پڑھنا چاہتے ہیں۔ کئی بار وہ مجھ سے اصرار کرتے ہیں کہ میں ہندی یا پنجابی میں کیوں نہیں لکھتی؟ کچھ تو یہ تک کہتے ہیں کہ آج کل کوئی اردو پڑھتا بھی ہے؟ کتابیں چھپتی ہیں اردو کی؟ انہیں حیرت ہوتی ہے جبکہ اردو پڑھنے والوں کا ایک الگ حلقہ ہے۔ خود کو خوش قسمت سمجھتی ہوں کہ اس سفر میں قارئین کا بے حد پیار ملا۔ بہت سے نامور، معروف اور تجربہ کار ادیبوں کی سرپرستی بھی نصیب ہوئی جنہوں نے میری رہنمائی بھی کی اور حوصلہ افزائی بھی۔ اردو ادب نے مجھے ایک نئی شناخت سے نوازا ہے۔

☆ یہ تو ہوئی ذاتی صورت حال اب اگر ہم آپ سے اردو زبان و ادب اور شاعری کے مستقبل بلخصوص بھارت کے حوالے سے دریافت کریں تو آپ کا فرمان کیا ہوگا؟

☆☆ میرے خیال میں دونوں طرف صورتِ حال ایک سی ہے۔ شاید اردو زبان اپنے چاہنے والوں سے مصطفےٰ زیدی کی زبان میں کہنا چاہتی ہے:

انہیں پتھروں پہ چل کر اگر آ سکو تو آؤ
میرے گھر کے راستے میں کوئی کہکشاں نہیں ہے

☆ رسم الخط کے حوالے سے اس زبان کو بھارت اور سمندر پار سے بہت خطرات کا سامنا ہے اس حوالے سے آپ کا نقطہ نظر اور تجاویز کیا ہیں؟

☆☆ آپ سے بہتر اس بات کو کون جان سکتا ہے کہ اردو زبان و ادب میرا اوڑھنا اور بچھونا ہے۔ میں تو اٹھتے بیٹھے، سوتے جاگتے، اردو زبان کی ترقی، کامیابی اور کامرانی کے خواب دیکھتی ہوں۔ میری خواہش اور دعا ہے کہ اردو زبان اپنے رسم الخط میں نہ صرف زندہ رہے بلکہ کامیابی اور کامرانی کے مزید

زینے طے کرے۔

☆ کبھی آپ نے اردو اور ہندی زبان کے ادب کا موازنہ اگر کیا ہو تو نتائج میں ہمیں ضروری شریک کیجیے؟

☆☆ گلزار صاحب ادب چاہے ہندی، پنجابی، اردو یا کسی بھی زبان کا ہو ایک جیسا ہی ہے۔ نثر کی مختلف اصناف سب ایک جیسی ہی ہیں۔ صرف ادیب کا اندازِ بیان مختلف ہوسکتا ہے۔ البتہ شاعری کا مزا جو اردو میں ہے وہ ہندی، پنجابی میں نہیں۔ اردو غزل کا کوئی ثانی نہیں۔ آج بھی اسے اوّلیت حاصل ہے آئندہ بھی اس کا جادو سروں پہ چڑھا رہے گا۔

☆ اردو میں تو خیر سے آپ کے نصف درجن افسانوی مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ ہندی میں اُن کی تعداد اور ہندی لکھتے ہوئے آپ کے احساسات کیا ہوتے ہیں؟

☆☆ اردو کی منتخب کہانیوں کا ہندی میں ایک مجموعہ زیرِ طبع ہے جو اس سال منظر عام پر آجائے گا۔ ہندی میں لکھی کچھ کہانیاں ریڈیو پر بھی نشر ہو رہی ہیں۔ میں اپنے افسانوں میں عام بول چال کی زبان استعمال کرتی ہوں اور ہندی اور اردو میں فرق صرف رسم الخط کا ہوتا ہے۔ کہانی ہمیشہ اردو میں ہی لکھتی ہوں اور اُس کے چھپنے کے بعد ہندی میں۔ اردو لکھنے کی ایسی عادت پڑ چکی ہے کہ قلم ہندی کے لیے اُٹھتا ہی نہیں۔

☆ اگر کوئی آپ سے دریافت کرے کہ آپ کی افسانہ نگاری سے آپ کے سماج کو کیا فائدہ ہوا مثلاً آپ اپنے قاری کو نئی سوچ، زاویہ نگاہ یا نئی فکر دینے میں کس حد تک کامیاب رہیں تو آپ کا جواب کیا ہوگا؟

☆☆ میرے افسانے بے مقصد نہیں ہوتے۔ ان میں کوئی نہ کوئی زندگی کا پہلو چھپا ہوتا ہے۔ کوشش رہتی ہے کہ معاشرے کی بُرائیوں کا پردہ چاک ہی نہ کروں اُسے ختم کرنے کا کوئی راستہ بھی نکل آئے۔ اب اس کا قارئین پر کتنا اثر ہوتا ہے یہ میں کیا بتا سکتی ہوں۔

☆ جو اُمیدیں اور خواہشات لے کر آپ نے اردو زبان و ادب کو اپنایا وہ کس حد تک پوری ہوسکیں یا اُن کے پورا ہونے کا کس حد تک امکان ہے؟

☆☆ میں نے کسی صلے کی اُمید میں اُردو دنیا میں قدم نہیں رکھا۔ میں تو یہ کہوں گی کہ مجھے جینے کا مقصد ملا ہے، میری سوچ وسیع ہوئی ہے، نئی پہچان ملی ہے، ایک حلقہ احباب کا ملا ہے۔ مجھے بہت کچھ دیا ہے اس زبان نے اور سب سے اہم بات یہ کہ میرے پنجاب کی سرزمین اردو ادب کے حوالے سے ابھی بھی لہلہا رہی ہے بنجر نہیں ہوئی۔ میرے لیے دعا کیجیے کہ جب تک یہ سانس چلے میرا قلم بھی چلتا رہے اور میں اسی طرح اردو زبان کی خدمت کرتی رہوں۔ میں سمجھتی ہوں کہ مجھ سے زیادہ شعر مذکور میرے احساسات کی درست ترجمانی کر رہا ہے۔

ہم دہری اذیت کے گرفتار مسافر
پاؤں بھی شل، شوقِ سفر بھی نہیں جاتا

☆

غنیمت

کراچی، گجرات (پاکستان)

جناب اکرم کنجاہی کی ادارت میں ۵/جون ۱۹۰۰ء میں پیدا ہونے والے بابائے پنجابی **ڈاکٹر فقیر محمد فقیرؒ** کے ایک سو چودویں یومِ ولادت اور چالیسویں یوم وفات کے مواقع کی مناسبت سے خصوصی اشاعت منظرِ عام پر آئی ہے۔ ہر چند زیرِ نظر شمارے میں اردو ادب کے بہت سے نامور اہلِ قلم کی تخلیقات کی نمائندگی بھی بھرپور ہے مگر شمارہ ہذا نے بابائے پنجابی کے نسبت پروفیسر محمد جنید اکرم، اقبال فیروز، جان کاشمیری، پروفیسر محمد اکرم سعید، اخلاق عاطف، وقار احمد، میاں محمد اسماعیل شمیم، انور مسعود اور جناب احسان دانش مرحوم کے رشحات قلم نے اس اشاعت کو نہایت اہم بنا دیا ہے جس میں بابائے پنجابی **ڈاکٹر فقیر محمد** کے حالاتِ زندگی فن اور کارنامے اور منظوم کلام نے پڑھنے والوں کے لیے بے پناہ معلومات کا ذخیرہ مہیا کر دیا ہے۔ اور اس طرح ان تمام احباب نے نہ صرف بابائے پنجابی **ڈاکٹر فقیر محمد فقیر** کو عمدہ خراجِ عقیدت پیش کیا ہے بلکہ پاکستان کی فراموش کردہ انتہائی اہم زبان ''پنجابی'' کی بھی بے لوث خدمت کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ جناب اکرم کنجاہی اور اُن کے رفقاء غنیمت کی آئندہ اشاعت میں دیگر علاقائی زبانوں کو بھی اپنی توجہ سے نوازیں گے۔

''غنیمت'' کا زیرِ نظر شمارہ ایک سو ساٹھ صفحات پر مشتمل ہے جس کی قیمت ایک سو پچیس روپے مقرر کی گئی ہے جو پوسٹ بکس نمبر ۱۶۰۰۲ کراچی، ۷۵۴۶۰ پر بآسانی دستیاب ہے۔

سب سے بڑا سچ

رتن سنگھ

(نوئیڈا، بھارت)

رینو بہل کا تعلق پنجاب کی سرزمین سے ہے۔ جس نے ہندوستان کو منٹو، کرشن چندر، بیدی، بلونت سنگھ، خواجہ احمد عباس اور جوگندر پال جیسے بڑے افسانہ نگار دیئے لیکن پنجاب میں اس وقت جو اردو کی صورت حال ہے اسے دیکھ کر تو یہی خیال آتا ہے کہ بطور افسانہ نگار رینو بہل کی حیثیت اس پودے جیسی ہے جو بنجر زمین پر اُگا ہو۔

لیکن یہ پودا ہرا بھرا ہے۔ اُن کی کہانیاں اردو رسائل میں چھپ رہی ہیں۔ اردو میں اس حد تک دلچسپی ہے کہ انہوں نے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری بھی حاصل کرلی ہے۔ اس خلوص اور لگن کی وجہ سے یہ امید کی جاسکتی ہے کہ کون جانے کل کو ان کے قلم سے بھی ''ٹائی اسیری'' اور ''لاجونتی'' جیسی بڑی کہانیاں تخلیق ہوں۔

ان کی ایک کہانی ہے ''موہ جال''

کہانی تو صرف اتنی ہے کہ جوانی میں ہی بیوگی کا لباس پہنے کملا اپنے جینے کے لیے سہارا ڈھونڈتی رہتی ہے۔ اسے دو قسم کے سہاروں کی ضرورت ہے۔ پیٹ بھرنے کے لیے روزی روٹی کا سہارا۔ یہ مل جائے تو پھر ایسا ہو جسے وہ اپنا سمجھ سکے، وہ جو اسے اپنا سمجھ لے۔

پیٹ بھرنے کا سہارا تو یوں ہو گیا کہ جس گھر میں اس نے چوکا برتن کرنے کا کام شروع کیا وہاں ایک طرح سے اسے عمر بھر کے لیے سہارا ہو گیا۔ لیکن پھر بھی یہ فکر اسے کھائے جا رہی ہے کہ بوڑھی عمر میں جب اس کے کمزور جسم میں کام کرنے کی سکت نہیں ہوگی تو اس وقت کیا ہوگا۔

رینو بہل عورت بن کر اس کہانی کے سفر میں اپنے کردار کے ساتھ ساتھ چل رہی ہیں۔ لکھتی ہیں:

''ایک نظر میں ہی اس کی بے بسی، لاچاری اور زندگی کی مجبوری اس کے چہرے کے کرب سے نمایاں ہو گئے۔''

اور یہ سب اس لیے ظاہر ہو گیا کیونکہ ''نہ ماتھے پر بندیا، نہ ہاتھوں میں چوڑیاں، نہ پاؤں میں پازیب، سہاگ کی ساری نشانیاں غائب تھیں''

نوکری مانگتے ہوئے منت کرنے یا مدد کے لیے گڑگڑانے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ بیوگی کی نشانیاں اس کی زندگی کی کہانی بغیر بولے ہی بیان کر رہی تھیں۔

ہاں گود میں اٹھائی بچی کی طرف اشارہ کر کے کچھ کہتی ہے تو صرف یہ کہ ''یہ ہی میرے جینے کا سہارا ہے'' یا ساس سسر نے یہ کہہ گھر سے نکال دیا ہے کہ ''اپنا بوجھ خود اٹھاؤ''

غریبی کے جال میں پھنسے لوگوں کے لیے ایک ہی ضرورت ''پیٹ بھرنے کی ضرورت'' کے گرد ہی ساری قدریں گھومتی ہیں۔ اگر وہ کھاتے پیتے لوگ ہوتے تو گھر کی بہو کو خاندان کی عزت سمجھ کر گھر پر ہی رکھتے۔ لیکن اگر ان کے پاس اپنا پیٹ بھرنے کے لیے دو روٹیاں نہیں ہیں، بہو کا پیٹ کیسے بھریں گے۔ بہو بھی وہ جس کی گود میں ایک بچی بھی کھیل رہی ہے۔ ایسے میں تمام رشتے ختم۔

اس مالی پریشانی کی وجہ سے کملا اپنی بیٹی کو پڑھنے کے لیے بھیجتی۔ ہاتھ کی تنگی کی وجہ سے وہ امید کرتی ہے کہ لڑکی بڑی ہو کر اس کے ساتھ میں کام کرے گی تو چاندی کے چند سکے اور مل جائیں گے۔

یعنی غریبی کے اندھیرے میں بھٹکتی وہ مجبور عورت یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ بیٹی کو لاعلمی کے اندھیرے میں دھکیل کر اس کے لیے یہ اندھیرے اور گہرے ہو جائیں گے۔ لیکن وہ ایسے دلدل میں پھنسی ہے جہاں اسے چند سکوں کی روشنی کے علاوہ اور کچھ دکھائی نہیں دیتا۔

اور پھر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔

یعنی کملا کی بیٹی جوانی کی عمر تک چند دنوں کے لیے ماں کی زندگی میں ننھا سا دیا بن کر ٹمٹمائی اور یہ دیا اس وقت بجھ گیا جب ماں نے چھوٹی عمر میں ہی بیٹی کو پرایا دھن سمجھ کر بالی عمر میں ہی بیاہ دیا اور پہلے ہی بچے نے اس کی جان لے لی۔

ڈاکٹروں نے کہا ''یا ماں بچ سکتی ہے یا بچہ''

کملا بتاتی ہے ''مجھے اپنی بیٹی کی فکر تھی اور انہیں بچہ چاہیے تھا۔ بھگوان نے میری فریاد ٹھکرا دی مگر ان کی بھی نہیں سنی، انہیں بیٹا چاہیے تھا اور ممتا نے بیٹی کو جنم دیا تھا۔''

''بھگوان نے میری فریاد ٹھکرا دی مگر ان کی بھی نہیں سنی'' یہ جملہ اس بات کا آئینہ دار ہے کہ رینو بہل کو زبان پر کتنا عبور ہے۔ کیسے چند الفاظ میں، پوری کہانی کے نچوڑ کو سمایا جاسکتا ہے۔ اس میں درد بھی ہے اور طنز بھی۔

اب بیٹی نہیں رہی تھی تو کم از کم بیٹی کی بیٹی ہی اس کے بڑھاپے کی ڈلگوری بنے گی۔ اس امید کے ساتھ وہ لاکھ مصیبتیں جھیلتی ہے وہ بچی کو پالتی ہے۔

لیکن ہائے ری کھوٹی قسمت۔

یہ لڑکی چودہ سال کی عمر میں کسی آوارہ لڑکے کے ساتھ بھاگ گئی تو کملا کی زندگی میں پھر اندھیرا ہو گیا۔ اور پھر ایک دن یہی لڑکی پیٹ میں کسی کا بچہ لے کر گھر لوٹ آتی ہے تو کملا اسے اپنے سینے سے لگا لیتی ہے۔

بھرے پیٹ والی مالکن کھاتے پیتے لوگوں کی سماجی قدروں کو سائے رکھتے ہوئے کہتی ہے ''تو نے پوچھنا تو تھا کہ کس کا پاپ اٹھا لائی ہے پیٹ میں''

ایسے میں کملا کا جواب ہے۔

''نہیں مجھے نہیں پوچھنا۔ میں تو بس اتنا جانتی ہوں کہ اب تو وہ کام

باقی صفحہ ۳۱ پر ملاحظہ کیجیے

''ایک بزم اور''

شرون کمار ورما

(●)

''کوئی چارہ ساز ہوتا'' اپنی کہانیوں کی تیسری کتاب کے نام کے لیے ڈاکٹر رینو بہل نے غالب کے زبان زد عام شعر کا یہ ٹکڑا لیا ہے۔ آخر کیوں، کیا یہ غالب کے شاعرانہ و مفکر مزاج سے ہم آہنگی کی طرف اشارہ ہے۔ لاشعور میں کچھ تو ایسا ضرور ہوتا ہے جو کسی خاص لفظ، جملے یا شعر میں اپنی تخلیق کی معنویت اور مقصدیت تلاش کرتا ہے۔ ایک رشتہ قائم کرتا ہے۔ غالب اس شعر میں ہلکا سا طنز اور تھوڑی سی شکایت کرتے محسوس ہوتے ہیں۔

رینو کے نظریہ حیات، فنی رچاؤ اور زبان و بیان کی نرمی اور روانی کو سمجھنے والے اس سے لطف اندوز ہونے کے لیے کتاب میں شامل ہر کہانی کو اُس کے کہانی پن، سادگی اور سہل پسندی کے لیے پڑھنا مناسب ہوگا یہ مختصر کہانیاں، اِدھر اُدھر بھٹکتی نہیں، کسی بزم، ادبی تحریک یا سیاسی رنگ کا سہارا نہیں لیتیں، علامتوں کے مہیب جنگل میں سے نہیں گذرتیں اور نہ ہی قاری کو کسی بیکار الجھن میں ڈال کر اس کا امتحان لیتی ہیں۔ یہ کہانیاں زندگی سے الگ محسوس نہیں ہوتیں۔ اختصار کے باوجود یہ اپنا مرکزی خیال پوری ایمانداری اور وضاحت سے بیان کرتی ہیں۔ قاری کو یہ اپنی زندگی کا ہی مقصد معلوم ہوتی ہیں اور اسی سادگی ہی کا فن اور معنویت ہے۔ مصنفہ نے زندگی کا مضمر آنکھیں کھول کر اور ذہن کو آزاد رکھ کر کیا ہے۔ وہ ایک ورکنگ وومن تو ہیں ہی گھریلو زندگی کو بھی بہ خوبی نباہ رہی ہیں۔ کردار کی اور مزاج کی ثابت قدمی نے اپنی زندگی کی گہما گہمی، کشمکش اور انسانی رشتوں اور اقدار کے وقار کو قریب سے سمجھنے کے مواقع مہیا کیے ہیں۔ رینو جی کی ہر کہانی اُن کے ماحول سے لئے گئے کرداروں، واقعات و حادثات پر مبنی ہے، یہی وجہ ہے کہ قاری ان میں اپنا عکس اور زندگی کی کروٹیں دیکھتا اور محسوس کرتا ہے۔

میں نے مصنفہ کی پہلی دو کتابیں بھی شوق سے پڑھی ہیں اس لیے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اُن کے فنِ افسانہ نگاری، زبان و بیان میں پختگی اور نکھار آیا ہے۔ انہیں بے جا طوالت اور جذباتیت اور لفاظیت سے دامن بچا کر چلنے کا ہنر آیا ہے۔ کہانی سادہ زبان اور رواں دواں بیان کی متقاضی ہوتی ہے اُس پر اپنی زبان دانی، علمیت اور شخصیت کا بوجھ لادنا اس کا گلا گھوٹنا ہوتا ہے۔ فن کی باریکیاں فن سے صاف ذہن، تعمیری سوچ، انسانی ہمدردی اور سماجی بہتری چاہتی ہیں اور یہ سب زندگی کو سمجھے بغیر ممکن نہیں۔

رینو جی کی کہانیاں عورت کے گرد گھومتی ہیں۔ دبی، کچلی، گھٹیا مردانہ برتاؤ کی ستائی، مرد کی جھوٹی انا کا شکار عورت جو اپنی ممتا، محبت، نرم دلی، شرافت اور پردہ داری کے سبب کمزور بنا دی گئی ہے۔ باہر اُسے دیوی کا درجہ دینے، اس کی تعریف اور عبادت کرنے والا خودغرض مرد گھر میں اسے پاؤں کی جوتی سمجھتا ہے۔ ایک بے مول وجود، اگر وہ کہیں اور کبھی ذرا سی آزادی چاہتی ہے، اپنی خواہشات کی باعزت تکمیل کی خواہاں ہوتی ہے، تھوڑا سا سر اُٹھاتی ہے تو پورا مرد سماج ڈر جاتا ہے اور اپنی شخصیت کی اس کمزوری اور تباہی کو عورت پر مسلسل ظلم کر کے ''مرد'' ہونے کا ثبوت دیتا ہے۔ اسے انا اور عزت و آبرو کا رنگ دے کر عورت کا قتل تک جائز قرار دیتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ اپنی اس کمزوری سے خوفزدہ ہوتا ہے اور تباہی کے احساس کی خوشی کے لیے عورت پر کیے جانے والے ہر ظلم کو جائز قرار دیتا ہے۔

مصنفہ نے یہ سب بہت قریب سے دیکھا ہے۔ عورت سے اُس کا دکھ سنا ہے، اس کی آنکھ میں آنسو اور لب پر آہیں دیکھی ہیں، اُس کے لیے ہمدردی محسوس کی ہے اور آخر اُسے کہانی کا روپ دے کر اس مرد سماج کا آئینہ دکھایا ہے۔ کچھ ادب، کچھ تعلیم، کچھ زندگی میں تبدیلیوں نے عورت کو اس کے وجود کی اہمیت کا احساس دلایا ہے۔ وہ اب اپنی ذات کی اہمیت کا اظہار کر رہی ہے لیکن مرد پر دھان سماج ابھی بہت طاقتور ہے۔

رینو جی کی کہانیوں کی عورت ابھی بغاوت پر تو نہیں اتری، نہ تو آنچل کو پرچم بنایا ہے اور نہ دنیا سے بغاوت کرنے کی ہمت جٹا پائی ہے، لیکن اب وہ زیادہ دب کر رہنے کو تیار نہیں۔ رینو جی کی کہانیوں میں یہ نئی عورت بھی نظر آنے لگی ہے اور یہ خوش آئند بات ہے۔ ابھی یہ کہانیاں عورت کی ناکام محبت، مرد کی خودغرضی اور انا کے سبب برداشت، قربانی اور سکوت کو جنم دے رہی ہے۔ لیکن یہ کہانیاں یہ پیغام بھی دیتی ہیں۔ مایوس نہ ہو، ہر رات کی صبح ہوتی ہے۔ لیکن وہ یا اُن کی کہانی کا کردار جس کے گرد کہانی سانس لیتی ہے نصیحت نہیں کرتے۔ کوئی تو اس مشکل اور مصیبت کا چارہ ساز ہو۔

شائد عورت کی موجودہ سماجی حیثیت، کردار اور عورتوں کی بدحالی اور مرد کی تنگ مزاجی نے، اور ابھی اپنے کمزور ہونے کے احساس نے کسی غم گسار کے ہونے کی بات کہلوائی ہو۔ ہندوستانی عورت کو ابھی اس غم گسار، مددگار کی ضرورت بھی ہے۔

مجھے پوری اُمید ہے کہ رینو جی وقت گزرنے کے ساتھ عورت کی اس جنگ کو بہادری اور ایمانداری کے ساتھ لڑیں گی اور اپنی جدوجہد اُس وقت تک جاری رکھیں گی جب تلک مرد پر دھان سماج سیدھی راہ پر آتے ہوئے عورت کو اس کا صحیح اور جائز مقام نہیں دے دیتا۔

☆

''سادہ بیانی کے مرقعے''

دیپک بُدکی (دہلی، بھارت)

افسانے کی ایک معتبر نسائی آواز ڈاکٹر رینو بہل کی صورت میں ۱۹۹۶ء میں ہمارے سامنے آئی۔ وہ ملک کے اندر اور غیر ممالک میں تواتر کے ساتھ چھپ رہی ہیں۔ اب تک ان کے چھ افسانوی مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ ایک اور ہندی افسانوی مجموعہ زیر ترتیب ہے۔

رینو بہل کو اپنے پتا جی، امی چند بہل کے باعث ادب سے لگاؤ پیدا ہوا۔ وہ اردو شاعری کے رسیا تھے اور بچوں کو اردو شعر سنا سنا کر ان میں شاعری کی رغبت پیدا کرتے تھے۔ ان کی دی ہوئی تعلیم نے رینو بہل کی زندگی میں مشعل راہ کا کام کیا۔ اپنے پتا جی کا خاکہ ڈاکٹر رینو بہل نے اپنے افسانے ''تم نہ جانے کس جہاں میں کھو گئے'' میں بڑی محبت اور عقیدت سے پیش کیا ہے۔ ۶/اگست ۱۹۵۸ء کو جنمی رینو بہل کا ذریعہ تعلیم انگریزی رہا۔ میٹرک کے فوراً بعد سیکریٹیریل کورس مکمل کیا اور ۱۹۷۶ء میں ملازمت جوائن کر لی۔ ملازمت کے دوران بی۔اے اور پھر پبلک ایڈمنسٹریشن اور پولیٹکل سائنس میں ایم۔اے کے امتحانات کامیاب کر لیے۔ اسی دوران میں اردو بھی سیکھی اور اس زبان میں ڈپلومہ اور ایڈوانسڈ ڈپلومہ حاصل کر لیا۔ ۱۹۹۳ء میں ایم۔اے اردو پاس کیا اور بعد میں عصمت چغتائی کے افسانوں کا فنی و فکری جائزہ پر مقالہ لکھ کر پنجاب یونیورسٹی چندی گڑھ سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری بھی حاصل کر لی۔

ڈاکٹر رینو بہل نے شروعات شاعری سے کی۔ ان کی چند غزلیں اور نظمیں پاکستان کے موقر جریدے تخلیق لاہور میں چھپیں مگر انہیں شاعری راس نہ آئی اور پھر افسانے کی ہو کر رہ گئیں۔ ان کا پہلا افسانہ ''پرچھائیاں'' ۳/جنوری ۱۹۹۶ء کے ''ہند سماچار'' میں شائع ہوا۔ پہلا مجموعہ ''آئینہ'' ۲۰۰۱ء میں شائع ہوا جس میں پندرہ افسانے شامل ہیں۔ پیش لفظ میں شرون کمار ورما ان کے فن کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں:

> ''متوسط طبقہ کی زندگی اپنی کچھ مجبوریوں کی بنا پر دھیمی چال سے چلنے والی ندی کی طرح ہوتی ہے۔ اس میں اتار چڑھاؤ اور طوفان کم ہی ہوتے ہیں۔ رینو جی کی یہ کہانیاں بھی دھیمی چال سے چلتی ہیں۔ ایک طے شدہ منزل کی طرف۔ یہ نہ تو شور مچاتی ہیں، نہ تڑک بھڑک سے کام لیتی ہیں۔ اسی لیے یہ چھوٹی چھوٹی کہانیاں زندگی کے نزدیک رہتی ہیں۔ ان مسائل پر گفتگو کرتی ہیں جو ہمیں روز ہی درپیش آتے ہیں۔ لیکن ہم انہیں معمولی اور غیر اہم جان کر نظر انداز کر دیتے ہیں۔''

جہاں تک موضوعات کا سوال ہے، رینو بہل کے افسانوں میں ان کی کثرت صاف نظر آتی ہے۔ ''آئینے کے سامنے'' میں بلا لحاظ طبقہ و مرتبہ بیویوں کی پٹائی ہوتی ہے۔ ''جینا اسی کا نام ہے'' میں رشمی کو پہلے رنجیت غیر ملک میں بس کر دغا دیتا ہے اور پھر لڑکا نہ جننے کی پاداش میں ونیت اُسے بے یار و مددگار چھوڑ دیتا ہے۔ ''خلش'' میں ایکسٹرو ورٹ روما اپنے انٹرو ورٹ شوہر کو چھوڑ کر اس کے دوست میجر وکاس کے ساتھ چلی جاتی ہے۔ اس کے باوجود اس کا شوہر خود کو ہی دوشی مانتا ہے۔ افسانہ ''کچھ ہم سے کہا ہوتا'' میں مرگی میں مبتلا پردیپ اور بانجھ منجو ایک دوسرے سے یہ راز اس لیے چھپاتے ہیں کہ ان کی وجہ سے انہیں الگ نہ ہونا پڑے۔ ''کہرا'' انسانی خود غرضی اور سازش کی گھناؤنی داستاں ہے جہاں رما کے سسرال والے دھوکا دھڑی سے اُس کا اکلوتا بیٹا چھین لیتے ہیں۔ ''انجام وفا، انعام وفا'' میں ساس کا مثبت روپ سامنے آیا ہے حالانکہ آخر کار گھر پراگندہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ عورت کی زندگی کا یہ سب سے بڑا المیہ ہے کہ اس کو خاموش بھیڑ کی طرح ہانکا جاتا ہے۔ اگر شبنم کی شادی ہی نہ ہوئی ہوتی یا پھر فوراً ہی ٹوٹ گئی ہوتی تو شاید وہ اپنی ٹانگوں پر کھڑے ہونے میں کامیاب ہو جاتی لیکن اُسے اتنے برس اہانت اور ذلت کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور پھر ایسے موڑ پر اُسے ٹھکرایا جاتا ہے جب نہ اس میں قوت ہوتی ہے اور نہ ہمت۔

افسانہ ''دودھ کا جلا'' میں جہیز کے قانون کا غلط فائدہ اٹھا کر مادھوری اپنے شوہر اور اس کے خاندان کو نہ صرف بے شرمی سے لوٹتی ہے بلکہ انہیں غربت اور ذلت کے قریب پہنچا دیتی ہے۔ اس افسانے کا موضوع اچھوتا ہے اور افسانہ نگار نے بڑی مہارت سے، جذبات میں بہنے کے بغیر، اس کو قرطاس پر قلمبند کیا ہے۔ ہمارے مادیت زدہ معاشرے میں ایسی کئی کہانیاں وقوع پذیر ہوئی ہیں جن میں حقیقی طور پر عورت کا یہ گھناؤنا روپ دیکھا گیا ہے۔ مادھوری کا شوہر اتنا ٹوٹ جاتا ہے کہ اُسے عورت ذات پر سے ہی بھروسہ اُٹھ جاتا ہے۔ گاؤں سے شہروں کی جانب نقل مکانی پر لکھی گئی کہانی ''چٹان کی پناہ میں آئینہ'' میں منگل اپنی بیوی کو زمیندار سے بچانے کی خاطر شہر لے آتا ہے لیکن وہاں رام رتی اجتماعی زنا کاری کا شکار ہو جاتی ہے۔ ''لاگا چنری میں داغ'' میں ایک معصوم بچے کو اپنی ماں سے الگ کر کے ایک غیر مانوس ماحول میں اس لیے رکھا جاتا ہے کیونکہ قانون اس کو ماں کے پاس جیل میں رکھنے کی اجازت نہیں دیتا۔ اس افسانے کی دلیر عورت شمع اپنے عاشق جو اس کو دھوکا دیتا ہے، کو موت کے گھاٹ اتارنے میں ذرا بھر بھی تامل نہیں کرتی اور اس طرح عمر بھر جیل میں رہنے کو اپمان بھری زندگی پر ترجیح دیتی ہے۔ اس افسانے کا موضوع اور مرکزی خیال بھی فکر و سوچ کو دعوت دیتا ہے تا کہ ان معصوموں کی زندگی محفوظ ہو سکے۔

''تم نہ جانے کس جہاں میں کھو گئے'' الیکٹرا کمپلکس میں مبتلا افسانہ نگار کی ذاتی کہانی ہے۔ افسانہ ''انتظار کی قندیل روشن ہے'' ایک فوجی کنبے کی ویرگاتھا ہے۔ افسانہ نگار نے ''قفس'' میں بچوں پر ہو رہے جنسی اتیاچار اور یتیم

خانوں کے غلط استعمال کو ہنر اور نکتہ رسی کے ساتھ درشایا ہے۔''اماوس'' میں انسانی بہیمیت کی شکار رملا کا دماغی فتور ماں بننے کے احساس سے دور ہو جاتا ہے اور اس پر ترس کھا کر رمیش اور راج اس کو اپنے ساتھ ملک سے باہر لے جاتے ہیں اور اس کے کینسر کا علاج کرواتے ہیں۔''آئینہ حیراں ہے'' میں ایک خوبصورت لڑکی اپنی بدصورت بہن کو اپنے سکول میں برداشت نہیں کرتی جبکہ دوسری جانب مسٹر اور مسز کپور اسی بدصورت لڑکی کی نیک سیرت دیکھ کر اس کو اپنے بیٹے سمیر کے لیے پسند کرتے ہیں۔

دوسرا مجموعہ''آنکھوں سے دل تک''۲۰۰۵ء میں منظر عام پر آ گیا۔ اس میں اٹھارہ افسانے شامل ہیں۔

اس مجموعے کا پہلا افسانہ''لمحوں نے خطا کی صدیوں نے سزا پائی'' میں احساس گناہ کے تحت ایک راشی پولیس والے اور اس کی بیوی گناہ سے تائب ہو جاتی ہے۔''سراب'' کی سدھا اپنے بھولے بھالے عاشق کا گھر ٹوٹنے سے بچاتی ہے۔افسانہ''فاصلے''ایک حسین گھمنڈی عورت بیتا کی کہانی ہے جو نہ صرف خود بلکہ اپنے بیٹے کو بھی اپنے باپ سے الگ کرتی ہے۔آخر کار والد کی موت ہی کنبے کی مراجعت کا سبب بنتی ہے۔''اعتراف'' میں نمرتا اور نینا، دو بہنوں سے لے کر بیٹی تک کا سفر رقم کیا گیا ہے کہ جہاں ایک بھائی اپنی بہنوں کے ارمانوں کا گلا گھونٹ کر ان کی شادی کرتا ہے وہیں اپنی بیٹی کے سامنے مجبور ہو کر گھٹنے ٹیکتا ہے۔افسانہ نگار نے''چٹکی بھر سندور'' میں ایک بے نام رشتے کی دبدھا کو پیش کیا ہے جس کے سبب شاردا کو اپنے محبوب کے درشن کرنے سے محروم رکھا جاتا ہے۔ ظرافت سے بھرپور افسانے''ممتا'' میں ایک کنواری لڑکی اس لیے آفس دیر سے پہنچتی ہے کہ اس کا کُتا بیمار ہوتا ہے۔''شاخ گل پر کیکٹس'' میں پہلی بہو جو نیچی ذات کی ہوتی ہے، کو حقارت سے دیکھا جاتا ہے جبکہ دوسری بہو ساس اور سُسر کو ناکوں چنے چبواتی ہے۔''محافظ'' میں ترویج محرمات کے خیال سے ڈر کر بی بی جی اپنی نوکرانی شانتا بائی کی بیٹی کو گود لینے پر راضی ہوتی ہے۔

''دہشت گرد'' بہت ہی دل سوز کہانی ہے جس میں دہشت گردوں کی گولی باری سے ایک عورت نہ صرف اپنے بچے کھو بیٹھتی ہے بلکہ اس کا شوہر شدید زخمی ہو جاتا ہے۔ وہ رات دن تیمارداری کر کے اپنے شوہر کو صحت یاب کرنے میں کامیاب ہوتی ہے۔ بدلے میں اس کا شوہر بچوں کی کمی محسوس کر کے اس کو چھوڑ کر دوسری عورت کے ساتھ گھر بسا لیتا ہے۔''قبضہ'' میں ایک نوجوان جوڑا بوڑھی مہاجر عورت کا گھر دھوکے سے ہتھیا لیتے ہیں۔''وشی کرن'' تنتر منتروں کے غلط استعمال پر لکھی گئی کہانی ہے جس میں شری کانت کو اپنے کیے کی سزا مل جاتی ہے۔افسانہ''پُرکھ'' میں دل لگی اور سچے عشق میں فرق بتایا گیا ہے۔ ''انتقام'' میں افسانہ نگار نے اونچی سوسائٹی کی مطلقہ دولت مند عورت کی عیاشی کا اثر اس کی بیٹی سواتی پر دکھایا ہے جو آخر کار ماں کے نقش قدم پر چل کر اُسے انتقام لیتی ہے۔''مغرور'' کہانی ہے نیلا کی جس نے لنگڑے ڈاکٹر آنند سے شادی کرنا اپنی توہین سمجھا تھا مگر آخرش اپنے اپاہج بچے کے لیے اسی ڈاکٹر کے پاس جانا پڑتا ہے۔''کوکھ جلی'' مین ایک ماں کو اپنے بچے ایسے فراموش کرتے ہیں کہ وہ کہتی ہے کہ کاش وہ بانجھ ہوتی۔''مرنے کی دعائیں کیوں مانگوں'' ایسے انسان کی کہانی ہے جو مرنے کی دعائیں مانگتا ہے مگر جب موت سامنے کھڑی نظر آتی ہے تو اُسے تھوڑی اور مہلت دینے کی درخواست کرتا ہے۔''ہواؤں کا چلن'' کی پریتی کو جو چھوٹے کیڑے مکوڑوں سے ڈرا کرتی تھی، اس کا خاوند اس خوف و ڈر سے نجات پانے میں مدد کرتا ہے۔''آنکھوں سے دل تک'' میں فوجی عورتوں کی زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ جنگ کے دوران بیوہ ہوئی فوجی عورتیں کیسے زندگی کی لڑائی لڑتی ہیں اور اپنے خاوند کی آرزوؤں کو عملی جامہ پہناتی ہیں۔اس افسانے میں بڑی خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے۔

مندرجہ بالا مجموعوں کے علاوہ ڈاکٹر بہل کے بہت سارے افسانے مختلف رسالوں میں شائع ہوئے ہیں جنہیں وہ آج کل کتابی صورت دینے میں لگی ہوئی ہیں۔ڈاکٹر بہل کے اکثر افسانے بیسویں صدی نئی دہلی میں چھپتے رہے ہیں کیونکہ انہیں اس رسالے سے لگاؤ ہے اور ان کے افسانے اس رسالے کے مزاج سے موافقت رکھتے ہیں۔ڈاکٹر بہل نے اردو کی تعلیم حاصل کرنے کے دوران بھی اسی رسالے سے استفادہ کیا تھا۔

''دھند'' (بیسویں صدی مئی ۲۰۰۴ء) ایک ایسی لڑکی کی کہانی ہے جو اپنے عاشق سے ملنے میں ہچکچاتی ہے۔عاشق کا دوست اپنی کار میں دونوں کو ملنے کی صلاح دیتا ہے مگر لڑکی کو تعجب ہوتا ہے کہ کار کا مالک اس کا اپنا عیاش بھائی ہوتا ہے جس کی آواز سن کر وہ بھاگ جاتی ہے۔''اگنی پریکشا'' (امکان مئی ۲۰۰۴ء) کھوئے ہوئے جوڑے کی کہانی ہے جو مل تو جاتے ہیں مگر شوہر اپنی بیوی پر شک کرتا ہے۔ ''پانچ منٹ'' (گلبن) کی پارو ایک ایسی باحوصلہ عورت ہے جس کی شادی اس کی مرضی کے خلاف کی جاتی ہے مگر وہ امریکہ جا کر طلاق لے کر اپنے عاشق کو بلاتی ہے اور اس کے ساتھ گھر بساتی ہے۔افسانہ''چوڑیاں'' (پرواز ادب جولائی اگست ۲۰۰۵ء) میں چمپا اپنے سارے زیورات اپنے دیور اشوک کو دیئے جانے کے لیے دے دیتی ہے لیکن اشوک اور اس کی بیوی کا مکالمہ سن کر دم بخود ہو جاتی ہے۔آخر کار اس کی طبیعت چوڑیاں پہن کر سنبھل جاتی ہے۔''پھسلن'' بیسویں صدی ستمبر ۲۰۰۵ء) ایک ایسی لڑکی کی کہانی ہے جس کا عاشق اس کو اپنے جال میں پھنسانا چاہتا ہے مگر ناکام ہوتا ہے۔''کس کو کیا ملا؟'' (خاتون مشرق ستمبر ۲۰۰۵ء) قسمت کے مارے ایسے جوڑے کی کہانی ہے جو اپنی حالت کو دیکھ کر ہمسایہ کے کتے کی قسمت پر رشک کرتا ہے۔''سزاوار ہم نہیں'' (رنگ و بو حیدر آباد ۲۰۰۵ء) نئی تعلیم یافتہ پود کی داستان ہے جو اپنے لڑکپن میں اپنے سے زیادہ عمر والے استادوں کو دل دے بیٹھتے ہیں۔افسانہ''محرم ہے اجنبی'' کی بانو بیگم ڈاکٹر سمیر کی توجہ کے باعث صحت یاب ہو جاتی ہے اور مرنے کے سے ڈاکٹر کے نام اپنا بنگلہ کر دیتی ہے (حالانکہ قانوناً کشمیری کی جائیداد غیر کشمیری کے نام منتقل نہیں ہو سکتی!)''دو دلوں کے درمیان'' میں ایک

لڑکی اپنی سہیلی کو راہِ راست پر لانے اور اس کی زندگی سنوارنے میں مدد کرتی ہے اور اس طرح سچی دوستی کی مثال قائم کرتی ہے۔ ''وقت کی انگڑائی'' میں بلراج کا جل کو چھوڑ کر دلی کے ایک امیر بلڈر کی بیٹی روپالی کے دام میں پھنس جاتا ہے۔ دل کا دورہ پڑنے کے بعد اس کی زندگی ایسے ڈاکٹر پر تر بھر ہوتی ہے جو کا جل کا شوہر ہوتا ہے۔ ''موہ جال'' (لاریب لکھنؤ مارچ ۲۰۰۷ء) میں نواسی کے بھاگ جانے اور پھر حاملہ ہو کر لوٹ آنے پر روایت پسند نوکرانی کملا کا ردعمل بالکل مختلف ہوتا ہے کیونکہ اب بڑھاپے میں اس کو اپنی سوشل سیکیورٹی کی فکر لگ جاتی ہے۔

ڈاکٹر رینو بہل کے کردار ہمارے پاس پڑوس میں رہتے ہیں اور زندگی کے مصائب سے جوجھتے رہتے ہیں۔ ان کے ہاں عورت کا کردار مضبوط اور معنی خیز ہوتا ہے چاہے وہ منفی کردار ہی کیوں نہ ہو۔ ان کی عورت ''انجام وفا انعام وفا'' کی شبنم کی طرح مجبور اور بے بس بھی ہے۔ ''دودھ کا جلا'' کی مادھوری کی طرح ڈائن بھی ہے اور ''لاگا چنری میں داغ'' کی شمع ''پانچ منٹ'' کی پاروا اور ''بدلتے موسم'' کی مونا کی طرح اعلیٰ ہمت اور حوصلے کا مجسم پیکر بھی بن سکتی ہے۔ افسانہ نگار ''پانچ منٹ'' میں عورت کی زبوں حالی کا بیاں مندرجہ ذیل الفاظ میں کرتی ہے۔

''اس کے ساتھ یہ کون سا نیا ہونے جا رہا تھا۔ صدیوں سے ہی تو ہوتا آیا ہے عورت ذات کے ساتھ۔ اسے ہی اپنے ارمان، حسرتیں، خواہشیں کچل دینی پڑتی ہیں اور باقی کی زندگی سسکیوں، ناامیدیوں اور سمجھوتوں میں ہی بسر ہو جاتی ہے۔''

افسانہ ''کہرا'' میں رما اپنے جذبات اور زندگی کی حقیقتوں کو یوں بیان کرتی ہے۔ ''نہیں سہیل، میں اپنا بچہ کسی کو نہ دوں گی۔ اس بات کا غم مجھے بھی ہے کہ رجنی کبھی ماں نہیں بن سکتی لیکن اپنے جگر کا ٹکڑا میں کسی کو کیسے دے دوں۔ دنیا میں لاکھوں بچے ایسے ہیں جو والدین کی شفقت سے محروم ہیں۔ ان میں کسی ایک کو گود لے لیں اور اس کی بھی زندگی سنور جائے گی۔''

''تم نہ جانے کس جہاں میں کھو گئے'' میں رینو بہل نے اپنے پتا جی، جو ان کے لیے آئیڈیل بن چکے تھے، کا خاکہ ان الفاظ میں تحریر کیا ہے۔

''ابا جی نہ صرف ہمارے باپ بن کر رہے بلکہ گھر میں لڑکا نہ ہونے کی وجہ سے ہم چاروں بہنوں کے بھائی بھی تھے، دوست بھی، ہمراز بھی اور رہنما بھی۔ ہمارے چہروں کے اتار چڑھاؤ اور ہمارے دل کی دھڑکنوں کو پہچان لیتے تھے۔ انہوں نے لڑکیوں کی پرورش ایک روایتی باپ کی طرح نہیں کی بلکہ گھر میں لڑکا نہ ہونے کی وجہ سے انہوں نے لڑکوں کی طرح ہی ہمیں پروان چڑھایا۔''

''بدلتے موسم'' کا وکرم بدی کا راستہ چھوڑ کر نیکی کی جانب راغب ہوتا ہے۔ افسانہ ''خلش'' میں انٹرووِرٹ پتی اپنے عقیدے کا اظہار یوں کرتا ہے۔

''میری نظر میں پیار زبردستی تو کیا نہیں جاتا اور میں اپنی بیوی کو زبردستی اپنے ساتھ باندھ کے رکھنے کا قائل نہیں۔ یہ رشتہ صرف پھیروں کا نہیں بلکہ دو دلوں کا ہوتا ہے اور مجھے وہم بھی تھا کہ اگر میرے پیار میں کشش ہوگی تو رو ما خود بخود سنبھل جائے گی''

رینو بہل کے یہاں مشاہدہ بھی ہے اور مطالعہ بھی۔ وہ واقعات کو غور سے دیکھتی ہیں، ان کی جانچ پڑتال کرتی ہے اور ان کو اپنی کہانیوں میں ڈھالتی ہیں۔ ان کی منظر نگاری ان کے عمیق مشاہدے پر لبیک کہتی ہے۔ ''انتقام'' اس منظر نگاری کی عمدہ مثال ہے۔ البتہ یہ بات سچ ہے کہ وہ بسیار نویسی کے چکر میں اناج کو بھوسی سے الگ نہیں کر پاتیں۔ ایک طرف ان کے شاہکار افسانے ہیں جو قاری کو سوچنے پر مجبور کرتے ہیں اور دوسری طرف ایسے افسانے ہیں جن کے تھیم کئی فلموں سے دہرائے جا چکے ہیں۔ افسانہ نگار کو تخلیق کرتے وقت اپنے آپ سے صرف ایک سوال کرنا چاہیے ''کیا میں قاری کو کوئی نیا زاویہ نگاہ یا فلسفہ یا فکر دے رہا ہوں؟'' اگر جواب منفی ہو تو اُسے اپنا قلم روک لینا چاہیے۔ رینو بہل کے افسانوں میں اکثر غیر متوقع اختتام بھی ملتا ہے جو موپاساں اور منٹو کے ہاں رائج تھا۔ کبھی کبھی اختتام میں دُم کا ڈنک، Sling in the tail کا طریقہ بھی استعمال میں لایا گیا ہے مثلاً افسانہ ''دھند'' کا اختتام۔

کہیں کہیں کردار خود اپنے مکالموں سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔ افسانہ نگار نے اس تکنیک کا استعمال ''پرکھ'' میں بڑی چابکدستی سے کیا ہے۔ گوری کے مکالمے اس کے کردار کو صاف طور پر عیاں کرتے ہیں۔

''بھول جاؤ میری جان ایسا کچھ نہیں ہونے والا۔ میں محبت عشق وغیرہ ان سب فضول کے جذبات پر یقین نہیں کرتی۔ کوئی کسی سے محبت نہیں کرتا۔ سب رشتے مطلبی ہوتے ہیں اور پھر آدمی ذات سے وفا کی امید؟ توبہ توبہ ایسا گناہ میں نہیں کر سکتی۔''

''نہیں ایسا بھی نہیں۔ مرد مجھے ایسا چاہیے جس کے پاس بے شمار دولت ہو اور جو میری ہاں میں ہاں ملائے۔ میں کہوں دن ہے تو وہ رات کو بھی دن کہے۔ جوتی کی نوک پر رکھوں گی اپنے شوہر کو۔''

اور پھر افسانہ نگار اس کردار کا جواز پیش کرتی ہے۔

''وہ جتنی خوبصورت تھی اتنی ہی سنگ دل بھی۔ شاید اس کے گھر کا ماحول ہی ایسا تھا جس نے اسے بے حس بنا دیا تھا۔ اس نے بچپن میں اپنے باپ کو ماں پر ظلم کرتے اور ماں کو تل تل کر مرتے دیکھا تھا۔ اس کا درد، اس کے آنسو، اس کی بے بسی نے اس کے معصول دل پر جو نقش چھوڑے تھے شاید اس کی شخصیت ایسی ہو گئی تھی۔''

غرض یہ کہ اس کردار کے ذہن پر اس کے والد کے ماں پر کیے گئے ظلم و ستم کے نقوش ثبت ہو چکے تھے اور اب وہ سبھی مردوں کو اسی میزان میں پرکھ رہی تھی۔ رینو بہل کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ اپنے کرداروں کے عمل کا نفسیاتی جواز بھی ڈھونڈتی ہے۔ اسی لیے اس کے کردار دیرپا اثر چھوڑنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

ڈاکٹر رینو بہل سماج کے ہم عصر مسئلوں پر قارئین کو غور و فکر کرنے پر مجبور کرتی ہیں اور ان کے حل ڈھونڈنے کی غیر شعوری دعوت دیتی ہیں۔ البتہ وہ اپنے

باقی صفحہ نمبر ۲۵ پر ملاحظہ کیجیے

باصر افسانہ نگار

اقبال انصاری

(دہلی، بھارت)

۱۹۵۰ء کی دہائی میں لیتھو پریس میں چھپا چار سو صفحات پر مشتمل ایک ناول بازار میں آیا۔ نام تھا ''تصویر'' مصنفہ تھیں اے۔ آر۔ خاتون۔ ہاتھوں ہاتھ وہ ناول فروخت ہو گیا حالانکہ اس کی قیمت چار روپے تھی جو اس وقت کے لحاظ سے زیادہ تھی۔ بہرکیف کہانی کے شوقین تعلیم یافتہ مسلم گھرانوں کو ''تصویر'' نے اپنی طرف اتنا کھینچا کہ اے۔ آر۔ خاتون نے جلد ہی ''شمع'' روشن کر دی۔ قاری کو پانچ سو لیتھو صفحات پر پھیلی ''شمع'' نے ایسا سمیٹا کہ جلد ہی مصنفہ کو سات سو صفحات پر ''افشاں'' بکھیرنا پڑی۔ ''تصویر''، ''شمع'' اور ''افشاں'' کی جیسی پذیرائی ہوئی ویسی پذیرائی اس سے قبل منشی فیاض علی کے ''انور'' اور ''شمیم'' کی ہی ہوئی تھی۔ اے۔ آر۔ خاتون کے تینوں ناول ایک بے حد خوبصورت اور جوان لڑکی سے شروع ہو کر اُس کی شادی پر ختم ہو جاتے ہیں۔ بہر حال ''تصویر'' اتنی خوبصورت ''شمع'' اتنی روشن اور ''افشاں'' اتنی چمک دار ثابت ہوئی کہ کتنی ہی مسلم خواتین نے قلم اُٹھا لیا اور ایسے ناولوں اور افسانوں کی ایک وبا پھیل گئی جو ایک بے حد خوبصورت جوان لڑکی سے شروع ہو کر اُس کی شادی پر ختم ہوتے تھے۔ عصمت چغتائی، واجدہ تبسم اور رضیہ سجّاد ظہیر جیسی معدودے چند ناول نگار اور افسانہ نگار خواتین اس بھیڑ سے الگ رہیں، اس وبا کی چپیٹ میں نہیں آئیں۔ یہ وبا بڑی حد تک آج بھی پھیلی ہوئی ہے۔ بڑی عجیب بات ہے کہ آج جب دنیا تیزی سے سمٹتی سکڑتی جا رہی ہے، جہاں برق رفتار تغیر و جدید آگہی سے استعجاب میں بھی مسلسل اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور تجسس میں بھی، جہاں مسائل زدہ زندگی روز افزوں زیادہ سے زیادہ مشکل (Complicated) ہوتی جا رہی ہے، اردو کی بیشتر افسانہ نگار خواتین (اور متعدد افسانہ نگار حضرات) کے افسانے آج بھی ایک خوب صورت جوان لڑکی سے شروع ہو کر اس کی شادی پر ختم ہو رہے ہیں۔ کہتے ہیں افسانہ نگار صاحب بصیرت ہوتا ہے ہماری ان بصیر افسانہ نگاروں کی بصیرت ایک خوب صورت جوان لڑکی کی شادی تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ ترس آتا ہے ایسی نام نہاد افسانہ نگاروں پر۔

لیکن حالات مایوس کن نہیں ہیں۔ کچھ خواتین آج بھی اس بھیڑ سے الگ ہیں، جن کی نگاہ انسانی سماج پر ہے، اس سماج کے افراد پر ہے جو اپنی تمام اچھائیوں، تمام برائیوں، تمام خوبیوں، تمام خامیوں، تمام الجھنوں، تمام مسائل، تمام خوشیوں، تمام غموں کے ساتھ اپنے اپنے طریقے سے اپنی اپنی زندگی، اپنا اپنا حال، اپنے اپنے لمحات جی رہے ہیں۔ ایسی گنی چنی باصر افسانہ نگاروں میں ایک نمایاں اور اہم نام ڈاکٹر رینو بہل کا ہے۔

غالباً ۱۹۹۷ء یا ۱۹۹۸ء میں میں نے پہلی بار رینو بہل کو پڑھا تھا۔ اب یہ یاد نہیں کہ کس رسالے میں اُن کا افسانہ پڑھا تھا۔ افسانے کا عنوان کیا تھا، صرف یہ یاد ہے کہ یہ چونکہ ایک نیا نام تھا اس لیے افسانے نے متوجہ کیا تھا اور یہ بھی یاد ہے کہ افسانہ پڑھ کر متاثر بھی ہوا تھا، زبان کی سادگی و روانی اور موضوع کے ساتھ اُن کے ٹریٹمنٹ نے انہیں ایک الگ پن، ایک انفرادیت دی تھی۔ یہ سادہ بیانی اور زبان کی دلکش روانی، نیز موضوع کے ساتھ پرخلوص لیکن غیر جانبدارانہ ٹریٹمنٹ رینو بہل کے افسانوں میں آج بھی جاری ہے۔

رینو بہل نے عورتوں کی کہانیاں لکھی ہیں۔ ان کی ہر کہانی میں کوئی نہ کوئی عورت یا تو مرکزی کردار ہے، یا اہم ترین کردار، جو پوری کہانی میں رچی ہوئی ہے۔ کہانی کے تمام واقعات سے اس کا قریبی اور گہرا رشتہ ہے۔ عورت رینو بہل کی کہانیوں میں تحرک کا سرچشمہ ہے۔ اُن کی جو بھی کہانیاں میں نے پڑھی ہیں، اُن میں ایک خاص بات جو میں نے محسوس کی ہے وہ یہ ہے کہ مصنفہ نے اپنی کسی بھی کہانی میں کسی عورت سے کچھ کروایا نہیں ہے۔۔۔ بس سماج کے کسی حصّے، کسی گوشے، کسی گھر سے انہوں نے ایک عورت کو اٹھا کر اپنے افسانے میں اس طرح چھوڑ دیا ہے کہ اسے عمل کرنے کی مکمل آزادی ہے۔ اُن کی کہانی میں عورت اپنی راہ کا ہی تعین نہیں، افکار و افعال کو، اور اُن کے ردّعمل میں وقوع پذیر ہونے والی خوشیوں، غموں، مسئلوں اور اُلجھنوں کو بڑی سادہ زبان میں پوری دیانتداری اور قطعی غیر جانبداری کے ساتھ کھُل کر رقم کر دیا ہے۔ رینو بہل کی کہانیاں کی نسا اچھی و بُری، بامراد و نامراد، طاقت ور و کم زور، خوب صورت و بدصورت، ذہین و کند ذہن، مال دار و مسکین، دانا و نادان، شاد و ناشاد، متکبر و مغرور افراد ہیں۔ ہر کردار ایک مختلف فرد ہے۔۔۔ کسی بھی کردار میں رینو بہل خود کہیں پر نہیں ہیں۔ افسانہ تخلیق کرتے ہوئے، خاص کر کردار سازی کرتے ہوئے اپنے کو لاتعلق، نا وابستہ اور قطعی غیر جانبدار رکھ پانا بڑی بات ہے۔

رینو بہل کی کہانیاں پڑھنے کے لیے دل پر جبر نہیں کرنا پڑتا۔ کہانیاں خود کو پڑھوا لیتی ہیں۔ کم الفاظ میں بہت کچھ کہہ جانا، اور مشکل سے مشکل بات کو بھی بڑی آسان زبان میں کہہ جانا ان کا اسلوب ہے:

''واحد مرد ہونے کی وجہ سے اور بھائی بہنوں میں سب سے بڑا ہونے کی وجہ سے ساری ذمے داری مجھ پر آن پڑی۔ مجھ پر عورتوں کی ذمّے داری کا بوجھ اتنا تھا کہ جوانی کا رنگ مجھ پر چڑھ ہی نہ سکا۔ دوسرے لڑکوں کی طرح نہ ہی میں کہیں آنکھ لڑا سکا اور نہ باپ کے مال پر عیش کر سکا'' یا:

''اس میں تمہارا یا میرا قصور نہیں۔ زمانے کی ہوا ہی ایسی ہے۔ مغربی تہذیب کا اثر نو جوانوں پر زیادہ ہی ہو گیا ہے۔ جو والدین اس ماحول میں ڈھل گئے ہیں وہی سکھی ہیں۔ ہمارے جیسے، جو اپنی تہذیب نہیں بھول پائے، پریشان ہو رہے ہیں۔''

اس طرح یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ رینو بہل کے یہاں جو کچھ

ہے وہ معاشرے سے لیا گیا ہے۔عصری حسیّت اُن کے افسانوں میں بڑی وضاحت سے نمایاں ہے:

''یہ بے حس دہشت گرد تو اپنا کام کر کے آگے نکل جاتے ہیں، مگر اپنی بے رحمی کے نقش ہمیشہ کے لیے اُن لوگوں کے دل و دماغ پر چھوڑ جاتے ہیں جو آدھے ادھورے زندہ بچ جاتے ہیں۔ وہ یہ نہیں جانتے کہ وہ ایک آدمی کو نہیں بلکہ اُس سے وابستہ کئی دوسرے لوگوں کو بھی جیتے جی مار جاتے ہیں۔کون جانتا ہے کہ ایک مرنے والے کے ساتھ کتنے لوگ مر گئے۔''

بگڑے ہوئے حالات اور اُن کے بگڑنے کے اسباب کا جائزہ بھی وہ بڑی باریکی سے لیتی ہیں اور ان کا تجزیہ بھی بڑے سلیقے سے کرتی ہیں:

''میں دُنیا بھر کا سکھ اپنی اولاد کو دینا چاہتا تھا، اسی لیے زیادہ دولت کمانے کے چکّر میں یہ بھول گیا کہ ہر سکھ پیسے سے نہیں خریدا جا سکتا۔ بچے کو پیسے کی نہیں وقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ماں اسے لاڈ پیار تو دیتی رہی مگر اس کی خامیوں کو نظر انداز کرتی رہی، اس پر پردہ ڈالتی رہی۔ میں اسے وقت نہ دے سکا اور ماں ٹھیک سے راہنمائی نہ کر سکی۔آج حالات بگڑ گئے تو میرے پاس وقت ہی وقت ہے مگر میری بیٹی کے پاس ہمارے لیے وقت نہیں۔کل وہ میرا انتظار کرتی تھی آج میں اس کا انتظار کرتا ہوں۔اس کے لوٹنے کا انتظار کرتا ہوں۔''

اس طرح رینو بہل حقیقتوں سے فرار اختیار کرتی ہوئی نہیں بلکہ حقیقتوں سے نبرد آزما ہوتی ہوئی نظر آتی ہیں۔اپنے ہر افسانے میں وہ کسی الجھن کا نظارہ کرتی ہوئی اور پھر اُس الجھن کے اسباب کی تلاش میں سرگرداں دکھائی دیتی ہیں۔ یہ ''کیوں ہے؟'' کی تلاش ان کی افسانوں کو حسن بھی عطا کرتی ہے، وزن بھی۔

رشتوں اور نفسیاتی الجھاوؤں، اور کہانی پن سے لبریز افسانہ ''سراب''۔ جذباتی نادانیوں کا افسانہ ''فاصلے'' جذبات کی وقتی پائداری اور قوانینِ قدرت کے مستقل استحکام کے تصادم کا افسانہ ''چٹکی بھر سندور'' اور انسانی حیوانی رجحانوں کا نہیں بلکہ حیوانی اور ناحیوانی رجحانوں کا افسانہ ''کوکھ جلی'' وہ افسانے ہیں جنہیں پڑھ کر بڑے اعتماد کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ رینو بہل کا حال تابناک ہے، مستقبل مزید تابناک۔

بقیہ: سادہ بیانی کے مرقعے

اسلوب میں کسی انتہائی پن یا میلوڈراما کا سہارا نہیں لیتیں۔مثال کے طور پر ایک معصوم بچہ اپنے باپ کے گناہوں کے لیے ماں سے الگ کیوں کر دیا جاتا ہے؟ یا پھر عورتیں ہر طبقے میں گھریلو ہنسا کا شکار کیوں ہوتی ہیں؟ پنجاب میں شراب کی لت کے باعث پیدا شدہ مصیبتوں کا ذکر ان کے کئی افسانوں میں ملتا ہے۔جہیز کی بدعت کو دور کرنے کے لیے حکومت نے قانون تو نافذ کر دیا لیکن اس قانون کے سبب کتنے معصوم مرد شاطر عورتوں کے ہاتھوں نہ صرف لٹ گئے بلکہ اپنا دماغی توازن بھی کھو بیٹھے۔اس نکتے کو افسانہ نگار نے ''دودھ کا جلا'' میں بڑی خوبی سے ابھارا ہے۔

آئے دن کی گمشدگیوں اور پولیس انکاؤنٹروں پر افسانہ نگار نے ''آنکھوں سے دل تک'' میں واقعے کو یوں پیش کیا ہے۔

''دو مہینے ہوئے تھے اس کی شادی کو کہ اپنے پولیس افسروں نے اس کے پتی کو دہشت گرد سمجھ کر مار دیا۔رات کے وقت وہ کسی مریض کو دیکھ کر لوٹ رہا تھا اور پولیس کسی دہشت گرد کا پیچھا کر رہی تھی۔ غلطی سے اُسے دہشت گرد سمجھ لیا گیا۔وہ سرکاری ہسپتال میں ڈاکٹر تھا۔بعد میں شناخت ہوئی تو ان افسران کو معطل کر دیا گیا مگر اس سے کیا ہوتا ہے۔بے گناہ تو جان سے جاتا رہا اور اس کی دلہن جس کے ہاتھوں کی مہندی بھی نہیں اتری تھی لوٹ کر میکے آ گئی۔''

غور سے دیکھا جائے تو ہر افسانے میں کسی سماجی، اقتصادی یا بشریاتی مسئلے کو پیش کیا گیا ہے۔اور اس میں ایک زیریں مقصد بھی ہوتا ہے۔مقصدی ادب کی یہی کوشش ان کے افسانوں کو پریم چند اسکول سے جوڑتی ہے۔رینو بہل کا بیانیہ انداز، علامتوں اور استعاروں کی عدم موجودگی اور حقیقت نگاری اس اسکول کی پرم پرا ہے۔وہ عورت کی پرابلمز کو کھلے طور پر پیش کرنے میں کامیاب ہوئی ہیں۔ان کی عورت ممتا سے بھری ماں بھی ہے جو اپنے بچوں کے لیے سسک سسک کر زندگی گزارتی ہے، وہ پیار کی مورت بیوی بھی ہے جو برس ہا برس اپنے پتی کے انتظار میں تڑپتی ہے مگر اس کی خواہشوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچاتی ہے، وہ ایک بیوہ بھی ہے جو بری نگاہوں کا مقابلہ خندہ پیشانی اور دلیری سے کرتی ہے اور وہ ایک باہمت معشوقہ بھی ہے جو اپنی بے عزتی نہ سہہ کر اپنے عاشق کو موت کے گھاٹ اتارتی ہے۔

بقول ڈاکٹر سلطان انجم ''زبان و بیاں کے اعتبار سے یہ افسانے سادہ بیانی کے خوبصورت مرقعے ہیں۔یوں بھی کہانی تو دریا کے بہتے پانی کی طرح ہوتی ہے اور آنکھوں سے دل تک کے افسانے اس روانی کی بہترین مثالیں ہیں''۔

مجموعی طور پر میں یہ سمجھتا ہوں کہ رینو بہل کے یہاں حساس دل ہے، سوچنے والا دماغ ہے اور لکھنے والا قلم ہے۔ان سے اُردو ادب کو بہت ساری امیدیں وابستہ ہیں۔ضرورت بس اس بات کی ہے کہ وہ بسیار نویسی کو چھوڑ کر معیار نویسی کو اپنا لے۔ مجھے یقین ہے کہ آنے والی نسلیں ان کی افسانہ نگاری سے مستفید ہوتی رہیں گی۔

''بدلی میں چھپا چاند''

پروفیسر قیصر نجفی
(کراچی)

اگر یہ سچ ہے کہ فنکار پیدا ہوتا ہے تو ہمیں یہ کہنے میں باک نہیں کہ ڈاکٹر رینو بہل پیدائشی کہانی کار ہیں۔ ان کے یہاں جس نوع کی تخلیقی قوت کا احساس ہوتا ہے، وہ ودیعت ہوتی ہے، اکتساب نہیں کی جاسکتی۔ رینو بہل کو اپنے اس فطری وصف کا جب احساس ہوا تو انہوں نے اسی کو ارتقائے زیست کا نقطۂ آغاز بنالیا۔ اس تخلیقی عمل کا پہلا مثبت نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی زندگی میں پھیلتے ہوئے یاسیت کے اندھیرے سمٹنے لگے اور دل و دماغ میں نمو پانے والے رجائیت کے اجالوں نے ان کے اس یقین کو قوی سے قوی تر کردیا کہ:

''اندھیرے کو مٹانے کے لیے ایک دیے کی لَو بھی کافی ہوتی ہے''

یہ جملہ رینو بہل کا ہے۔ جو انہوں نے اپنے پانچویں افسانوی مجموعہ ''بدلی میں چھپا چاند'' کے ابتدائیہ بعنوان ''مجھے کہنا ہے کچھ'' میں لکھا ہے۔ اس ابتدائیہ میں وہ اپنی افسانہ نگاری کے محرکات پر روشنی ڈالتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ''زندگی کبھی ایک سیدھے راستے سے ہو کر نہیں گزرتی۔ کئی اتار چڑھاؤ پار کرنے پڑتے ہیں۔ کبھی ہم ڈگمگا جاتے ہیں، کبھی پھسل جاتے ہیں، کبھی ٹوٹ کر بکھر جاتے ہیں تو کبھی سنبھل جاتے ہیں۔ مایوسیوں کے کچھ ایسے ہی بادل میری زندگی پر بھی چھائے۔ مگر بروقت میرے ہاتھوں نے قلم تھام لیا اور میں نے ان بادلوں کو دوسری طرف موڑ دیا۔''

رینو بہل، ادبی نظریہ کے طور پر ''ادب برائے زندگی'' میں یقین رکھتی ہیں۔ یہ نظریہ سب سے پہلے فنی ذات کا مقاضی ہے۔ اس نظریہ کے تحت طے ہونے والے تخلیقی سفر میں فرد اجتماع کا استعارہ بن جاتا ہے۔ اس سفر میں تخلیق کار ''مَیں'' کا حصار توڑ کر ''ہم'' کی بسیط فضاؤں میں کھو جاتا ہے اور فرد سے اجتماع تک کا جادہ استوار کرنے کے لیے زندگی کے متنوع رنگوں کے سنگ ہائے میل نصب کردیتا ہے۔ رینو بہل نے یہ عمل اپنے افسانوں کے ذریعے پایۂ تکمیل تک پہنچایا ہے۔ ''بدلی میں چھپا چاند'' کا ہر افسانہ زندگی کا کوئی نہ کوئی رنگ لیے ہوئے ہے۔ مگر رینو بہل کے تخلیقی تجربہ کی وحدت نے ان تمام رنگوں کو فن کے کینوس پر بننے والی زندگی کی تصویر میں یکجا کردیا ہے۔

انیس ناگی نے سعادت حسن منٹو کے افسانوں کے حوالے سے کہا تھا:

> ''منٹو کے افسانے اپنے عہد کے تناظر سے منسلک ہیں۔ ان کے کرداروں کی نفسیاتی حالتیں، ان کے عوامل و محرکات ان کی معاشرت میں ہیں۔''

ہمارے خیال میں یہی بات رینو بہل کے افسانوں پر بھی صادق آتی ہے۔ رینو بہل نے اپنے افسانوں کو اپنے عصر کے سماج و معاشرہ کے انسان کی زندگی سے متصل رکھا ہے۔ وہ اساطیر، روایت، تاریخ وغیرہ میں غوطہ زن نہیں ہوتیں بلکہ پیش نظر معاشرتی زندگی کے فعال و متحرک کرداروں کے دورن ذات جھانکتی ہیں۔ امر واقعی یہ ہے کہ جتنی گہرائی تک عورت کے اندر ان کی بینائی جاسکتی ہے، مرد کے اندر بھی اتنی ہی گہرائی تک ان کی بصارت کی رسائی ہے۔ ان کے یہاں مرد یا عورت کی تخصیص نہیں۔ ان کے مدنظر صرف حیاتیاتی انسان ہے۔ لیکن ایسا کہ جو کسی جنس یا صنف کا قیدی نہیں ہے اور نہ ہی کسی نظریہ یا سیاسی نقطۂ نظر کا اسیر ہے۔

ہر چند رینو بہل کے کرداروں کی طبقاتی و سماجی حیثیت بھی ہے، مگر وہ ان کی انفرادی حیثیت بھی قائم رکھتی ہیں۔ ہمارے اس دعویہ پر افسانہ ''ناکردہ گناہ کے مجرم'' دال ہے۔ مرد، عورت، ہیجڑا۔۔۔ چاہے کسی بھی جنس کا فرد ہو، بنیادی طور پر وہ انسان ہے اور انسان ہی انسان کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا۔ اور ایثار و قربانی سے کام لیتا ہے۔ بشرطیکہ اس میں جذبۂ انسانیت موجود ہو، اس میں یہ شرط ہرگز نہیں کہ اس کی جنس فلاں ہو یا فلاں!

رینو بہل کے یہاں خیال کی رنگینی بھی ہے اور حقیقت کی سنگینی بھی۔ ہر دو تناظر میں ان کی نگارشات انہیں ایک قلمکار سے زیادہ ایک عکاس ثابت کرتی ہیں، ایک ایسی عکاس جو کیفیات تک کا عکس اتار لیتی ہے۔ اقبالؔ نے تو شاعر کو دیدۂ بینائے قوم کہا تھا لیکن ہمیں رینو بہل جو کہ ایک افسانہ نگار ہیں، سماج و معاشرہ کا دیدۂ بینا لگتی ہیں۔ رینو بہل کو متنوع معاشرتی مسائل کا ناقابل یقین حد تک شعور حاصل ہے اور یہی ان کا خصوص ہے جو بیک وقت ان کی شناخت بھی ہے اور بحیثیت افسانہ نگار ان کے مقام کا تعین بھی کرتا ہے۔

رینو بہل کی کہانی کاری کی روح مشرقیت ہے۔ اس بنا پر نہیں کہ وہ ایک مشرقی عورت ہیں بلکہ اس بنا پر کہ مشرقیت کا فروغ ان کا آدرش ہے۔ ان کے بیشتر افسانوں کا مرکزی کردار عورت ہے۔ لیکن وہ خوابوں خیالوں میں بسنے والی عورت نہیں ہے، عصری زندگی کی تلخیوں میں گھری ہوئی عورت ہے، قیامت کی اس بھیڑ میں اپنے راستہ کی تلاش میں سرگرداں عورت ہے، سماجی و معاشرتی حقیقتوں کے چیلنجز قبول کرنے والی عورت ہے۔ یہ وہ عورت ہے جو کسی بیساکھی یا سہارے کی طلبگار نہیں..... بلکہ آپ اپنا سہارا بننے کی متمنی ہے۔ ایسی عورت رینو

بہل کے افسانوں ''بدلی میں چھپا چاند'' کی شبنم اور ''مد دچاہتی ہے حوّا کی بیٹی'' کی ہوا کے روپ میں سامنے آئی ہے۔

ہم بلاخوف تردید اس امر کا اعتراف کرتے ہیں کہ دیہاتی زندگی کے موضوع پر کہانی کاری کا شعور پریم چند کے بعد احمد ندیم قاسمی نے بیدار کیا۔ یہ انہی بزرگان ادب کی کاوشوں کا ماحصل ہے کہ فی زمانہ بھی افسانہ نگاروں لیکن خال خال نے دیہاتی زندگی کی ترجمانی کی ہے۔ ان میں رینو بہل بھی شامل ہیں۔ رینو بہل کے بعض افسانوں میں دیہی معاشرت کے متنوع رخ سامنے لائے گئے ہیں۔ بالخصوص گھریلو زندگی کی عکاسی کی گئی ہے۔ قاسمی صاحب نے دیہی کسان کی شہر کی طرف ہجرت کو ایک سماجی مسئلہ کے طور پر اپنے افسانہ ''ٹریکٹر'' میں پیش کیا ہے۔ رینو بہل نے بھی اس مسئلہ کی گمبھیرتا کا ادراک کرتے ہوئے اس کو اپنے افسانہ ''بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے'' میں نشان دہی کی ہے۔

ہم زیر تبصرہ افسانوی مجموعہ ''بدلی میں چھپا چاند'' میں شامل افسانوں کے حوالے سے اعتراف کر چکے ہیں کہ ان میں معاشرتی زندگی کے متنوع رنگ پیش کئے گئے ہیں۔ ان میں سے چند ایک کا ذکر تو سطور بالا میں ہوا ہے۔ ذیل میں ہم باقی ماندہ پر اجمالاً اظہار خیال کرتے ہیں۔

''محبت کا حق'' مکافات عمل کے موضوع پر ایک نہایت اثر آفرین کہانی ہے۔ تجسس (Suspence) کہانی کی فنی ضرورت ہے مگر یہاں افسانے کی اساسی خصوصیت بن گیا ہے اور کہانی کی ادبی اہمیت میں اضافہ کرتا ہے۔ موت کے بعد روح کا مجسّم ہو کر لوٹنا خواب و خیال تصوّر ہوتا ہے۔ لیکن اس تناظر میں بعض واقعات Quote ہوئے ہیں۔ رینو بہل نے ''مجھے کیا برا تھا مرنا'' میں ایسے ہی ایک واقعہ سے اپنی کہانی کے حسن انجام کو دوبالا کیا ہے۔ بڑے شہروں کی زندگی کی بوقلمونیاں دیہات و قصبہ سے آنے والوں کے لیے بوالعجبوں سے کم نہیں ہوتیں۔ کیونکہ زندگی کے ایسے رخ ان کے شعور یا لاشعور کی کسی پرت میں محفوظ نہیں ہوتے اور نہ ہی وہ ان سے مانوس ہو پاتے ہیں۔ ''تہذیب کے دوراہے پر'' میں اسی موضوع پر کہانی کا تار و پود تیار کیا گیا ہے۔ ''لغزشِ آدم'' رینو بہل کا ''بدلی میں چھپا چاند'' میں شامل ''ناکردہ گناہ کے مجرم'' کے بعد دوسرا افسانہ ہے، جس کے مرکزی خیال میں آفاقیت پائی جاتی ہے۔ کسی ملک سے تیسری دنیا میں تحفظ انسانیت کے لیے جانے والے محافظین کا دامن انسانیت کو تار تار کر دینا ایک ناقابل معافی و تلافی جرم ہے۔ رینو بہل نے اسی اہم نکتہ پر اپنی فکری و فنی نگاہ مرکوز رکھی ہے۔ ''اندھیرے اجالے'' رینو بہل کا ایک کمزور افسانہ ہے۔ جس کا حقیقت سے دور پار کا تعلق نہیں ہے۔ کسی گاؤں میں نوجوانوں کی ایک تنظیم کا وجود جو آئین و قانون سے بالاتر ہو کر فیصلے صادر کرے اور انہیں عملی جامہ بھی پہنائے، ایک خواہش تو ہو سکتی، عملی طور پر ممکن نہیں۔ آسیب، بدروح، بھوت ہماری زندگیوں کے اب ایسے کردار بن چکے ہیں، جن کے بغیر ہماری ہر کہانی ادھوری لگتی ہے۔ ان ماورائی مخلوقات کا زندگی میں دخل ہونے کے حوالے سے مختلف آراء ہو سکتی ہیں۔

لیکن قدرت اللہ شہاب ایسے ایک زیرک افسانہ نگار نے بھی اپنی کتاب ''شہاب نامہ'' میں ایسی ہی ایک بے چین روح کا واقعہ درج کیا ہے۔ جیسی روح کا رینو بہل نے اپنے افسانہ ''بدگمانیوں کی آنچ'' میں ذکر کیا ہے۔

فنی اعتبار سے رینو بہل کے یہاں کرافٹ سٹوری (Craft Story) کی روایات کی پاسداری کی گئی ہے۔ تجرید و علامت سے انہوں نے ابلاغ میں ابہام لانے کی سعی نہیں کی ہے اور نہ ہی اظہار کو لسانی تشکیلات کا رہین کرنے کی کاوش کی ہے۔ انہوں نے بیانیہ افسانے لکھے ہیں۔ ان کا اسلوب اظہار صاف اور سیدھا سادہ ہے۔ جسے انہوں نے زبان کی جاذبیت، بیان کی ندرت، معاشرتی شعور، نفسیاتی دانش اور تخلیقی فن سے اثر آفرین بنایا ہے۔ ان کی افسانہ نگاری کی نمایاں خصوصیات گہرا مشاہدہ، وسیع تجربہ، موضوعاتی تنوع، جذبات نگاری اور وحدت تاثر ہے۔ ہمیں ان کے یہاں کردار، مکالمہ، منظر کشی، پلاٹ، عروج، انجام کہیں بھی کوئی فنی کمزوری نظر نہیں آئی۔ ہمارے نزدیک رینو بہل ایک مکمل افسانہ نگار ہیں۔

''روح کا موسم''

سوچتے اور جاگتے سانسوں کا ایک دریا ہوں میں
اپنے گم گشتہ کناروں کے لیے بہتا ہوں میں

جل گیا سارا بدن ان موسموں کی آگ میں
ایک موسم روح کا ہے جس میں اب زندہ ہوں میں

میرے ہونٹوں کا تبسم دے گیا دھوکا تجھے
تُو نے مجھ کو باغ جانا دیکھ لے صحرا ہوں میں

دیکھئے میری پذیرائی کو اب آتا ہے کون
لمحہ بھر کو وقت کی دہلیز پر آیا ہوں میں

○

اطہر نفیس

(●)

''آنکھوں سے دل تک''

انورایوبی گنگوہی

(بھارت)

دنیا عجائب وغرائب کی طویل وفراخ بستی ہے، تلوّن مزاجی اس کی فطرت ہے، اس میں اہل وناا ہل ہر قسم کے افراد بستے ہیں، فنائیت اس کی عمر کو اقلیت کے دائرے میں رکھتی ہے، مگر یہاں باقیات وصالحات کو بھی ثبات۔۔۔ اور عروج حاصل رہتا ہے کیونکہ وہ افراد جو اپنی ذاتی صلاحیتوں، علم وشعور کو فلاح انسانیت اور ملک وقوم کے چمن کی آبیاری میں صرف کرتے ہیں ان کو بعد الممات بھی ثبات وحیات کا مرتبہ حاصل رہتا ہے بایں وجہ کہ نثر ونظم، شعروسخن، ہر قسم کا ادب نہ صرف فنونِ لطیفہ کے زمرے میں آتا ہے بلکہ احیائے علوم کا سرچشمہ بھی ہے۔ قابلِ فخر ہیں وہ نفوس جو پرورشِ لوح وقلم کے شغلِ لطیف میں درک رکھتے ہیں۔ وہ تحریرات وتقاریر جو مخلوقِ عالم کے مفاد میں ہوتی ہیں وہ نہ صرف خود بقا حاصل کرتی ہیں بلکہ اپنے خالق کو بھی زندہ رکھتی ہیں۔ تاوقتیکہ وہ عالمِ شہود میں باقی رہتی ہے۔ کہاوت ہے ''چراغ سے چراغ جلتا ہے۔'' سچا تخلیق کار اور صالح وصحت مند تخلیق کبھی نہیں مرتے۔ اس کا فن اس کو عوام وخواص میں ہمیشہ زندہ رکھتا ہے، مگر یہ سب جب ہی ممکن ہوسکتا ہے جب قلمکار، علم وشعور اور بصیرت اور دانش سے کماحقہ بہرہ ور ہو۔ چنانچہ جس اہل فن وہنرور ہستی پر اظہار خیال کیا جارہا ہے وہ کوئی اور نہیں بلکہ ایک معروف ومقبول شخصیت ڈاکٹر رینو بہل مسکونہ چندی گڑھ ہے۔

۶/اگست ۱۹۵۸ء کے یوم مبارک کو محترم اے سی بہل کے یہاں پیدا ہوئی اور اپنی والدہ محترمہ اوناش بہل کی گود میں پرورش پائی، پبلک ایڈمنسٹریشن، پولیٹکل سائنس اور اردو میں ایم۔ اے کیا۔ نیز ''عصمت چغتائی کے افسانوں کا فنی وفکری جائزہ'' مقالہ لکھ کر ۲۰۰۰ء میں پنجاب یونیورسٹی چندی گڑھ سے پی ایچ دی کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۹۶ء سے اردو زبان میں مسلسل کہانیاں تحریر کررہی ہیں۔ جو ملک اور بیرونِ ملک کے مشہور ومعتبر رسائل میں شائع ہوتی آرہی ہیں۔ اردو زبان میں آپ کے چھ افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ۲۰۰۱ء میں ''آئینہ'' شائع ہوا جس پر اردو اکادمی یوپی نے انعام سے نوازا، ۲۰۰۵ء میں دوسرا افسانوی مجموعہ ''آنکھوں سے دل تک'' شائع ہوکر مقبول عام ہوا، ۲۰۰۸ء میں تیسرا مجموعہ ''کوئی چارہ ساز ہوتا'' زیورطبع سے مرصّع ہوا اس پر بھی یوپی اردو اکادمی نے انعام سے سرفراز کیا، ۲۰۱۰ء میں چوتھا افسانوی مجموعہ ''خوشبو میرے آنگن کی'' کے عنوان سے اشاعت پذیر ہوا جس پر بہار اردو اکادمی سے انعام حاصل ہوا۔ اسی طرح ۲۰۱۲ء میں پانچواں افسانوی مجموعہ ''بدلی میں چھپا چاند'' منظرِ عام پر آکر سندِ مقبولیت کا حصول ہوا۔ آپ کے دامن میں یہ دو اعلیٰ ایوارڈ بھی اوّل ۲۰۰۳ء میں لالہ جگت نارائن ایوارڈ، دوم ۲۰۱۰ء میں نصیر سلونی ادبی سوسائٹی رائے بریلی نے امرتا پریتم سمرتی سمّان سے نوازا۔

رینو بہل کی افسانہ نگاری (آنکھوں سے دل تک کی روشنی میں) کے موضوع پر جموں یونیورسٹی سے ۲۰۰۸ء میں ایم فل کی گئی۔ علاوہ ازیں ریڈیو FM'' اور AIR سے کہانیاں نشتر ہورہی ہیں۔ ایک کہانی ڈی ڈی اردو پر ٹیلی کاسٹ کے لیے پسند کی گئی ہے۔ آپ کی ادبی خدمات کی فہرست کافی طویل ہے، آپ ہمہ وقت خدمتِ اردو میں مصروف ومنہمک رہی ہیں۔ اسی لیے گرامی قدر پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی صاحب نے تحریر فرمایا ''یہ بات قابلِ قدر ہے کہ آپ علاقہ پنجاب و ہریانہ میں واحد خاتون ہیں جو اردو میں افسانے لکھ رہی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک اپنے بل بوتے پر آپ اردو کا چراغ روشن کئے ہوئے ہیں اور یہ بہت بڑی بات ہے، میں نے آپ کے افسانے جگہ جگہ سے دیکھے اور محظوظ ہوا، آپ نے عصرِ حاضر کے مسائل کو بڑی خوبی سے افسانوں میں برتا ہے اور خارجی دنیا کی بہت کامیاب عکاسی کی ہے۔''

افسانہ لکھنے کے لیے پلاٹ نہایت اہم شے ہوتی ہے جو چونکا دینے والا ہونا لازمی ہے پھر اس کے لیے زبان پر زبردست عبور ہونا ضروری ہے تب ہی خیال انگیزی اور احساس جمال، تخلیق کو غیر معمولی بنا پاتے ہیں۔ رینو بہل نہایت اعلیٰ تعلیم یافتہ اور باصلاحیت خاتون ہیں، انہوں نے تین مضمونوں میں ایم۔ اے کیا ہوا ہے اس پر طرّہ یہ کہ وہ پی۔ ایچ۔ ڈی بھی ہیں، ان کے افسانوں کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ ان کا علمی ادراک بہت بڑھا ہوا ہے اور مطالعہ کائنات اور مشاہدۂ سماج ومعاشرہ نہایت وسیع ہے، اسلوبِ نگارش عام فہم، سنجیدہ وسلیس ہے۔ وہ افسانے کیوں لکھتی ہیں؟ اردو میں کیوں لکھتی ہیں؟ عورت ہوکر عورتوں کی خامیوں پر کیوں قلم اٹھاتی ہیں؟ ان سب باتوں کا جواب انہوں نے بڑے دل نشیں پیرائے میں دیا ہے اور کئی اعتراضات کو یک قلم رڈ کر دیا ہے۔ وہ اعتراضات ان کے افسانے ''خمیدہ سروں کی جستجو'' میں موجود ہیں جو انہوں نے عوام میں گشت کرتے سوالوں کے جوابات بڑی جرأت کے ساتھ دیئے ہیں۔ چند سطور میں زبان وبیان کی بھی چاشنی دیکھئے۔ لکھتی ہیں ''مجھے ایسے لوگوں کی سوچ پر حیرت بھی ہوتی ہے اور افسوس بھی ''زبان'' ادب اور محبت کا کوئی مذہب نہیں ہوتا؟ یہ تو ہر قید سے آزاد ہیں۔ یہ تو خوش رنگ ہوا ہے جس نے اسے چھولیا اس کی ہوگئی۔ کم ظرف لوگ اسے کبھی مذہب، کبھی سرحدوں کے دائروں میں تقسیم کرتے رہتے ہیں۔'' رینو بہل سماج کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھتی ہیں۔ اپنے ایک دوسرے افسانے ''موہ جال'' میں انہوں نے ایک ایسے موضوع پر قلم اٹھایا ہے جو بیوگی، مفلسی اور بے آسرا عورتوں کے ساتھ روز بروز ہوتا رہتا ہے۔ اس افسانے میں انہوں نے یہ دکھایا ہے کہ ایک بیوہ عورت اپنی کمسن بچی کے ساتھ کیسے مشکل کے

باقی صفحہ ۳۱ پر ملاحظہ کیجیے

''جادو بیاں قلمکار''

ڈاکٹر سلطان انجم
(چندی گڑھ، بھارت)

ایک مشہور غزل کا مطلع ہے:

کہانی کہنے والے، ہائے کیوں ذکرِ جوانی ہے
جوانی کی کہانی کیا، جوانی خود کہانی ہے

اس شعر کے خالق کی نظر میں کہانیاں شاید صرف جوان جسموں کے تذکروں تک ہی محدود ہیں مگر قصے کہانیوں کی کوئی عمر نہیں ہوتی، کوئی موسم نہیں ہوتا۔ کہانی تو اس سدا بہار پھول کی مانند ہے جو خوشبو بکھیرنے کے لیے بہاروں کی آمد کا منتظر نہیں رہتا بلکہ اُس رُت میں بھی، جب پیڑ پودے اپنے ہی جسم کا حصہ رہے برگ و بار سے بھی نجات حاصل کرنے کے متمنّی نظر آتے ہیں، گھر آنگن مہکاتا رہتا ہے۔ بعینہٖ کہانی بھی ہر موسم، ہر عمر میں فسوں کاری سے اپنے ہونے کا احساس دلاتی رہتی ہے:

نہ تھا کچھ تو خُدا تھا

کے زمانے میں بھی کہانی معرضِ وجود میں آنے کے لیے پر تول رہی تھی۔ قصّۂ آدمی کو رنگین کرنے والے ابلیس سے ہابیل و قابیل تک کہانی کی پرچھائیاں کسی نہ کسی صورت میں عالمِ موجودات پر سایہ فگن نظر آتی ہیں۔

''آنکھوں سے دل تک'' پہنچتے پہنچتے کہانی نے اپنا رنگ روپ بدلا ہے، چولا تبدیل کیا ہے مگر خود کو کبھی بے روح نہیں ہونے دیا۔ کہانی میں کہانی پن قوسِ قزح کے سات رنگوں میں موجود سفید رنگ کی طرح ہے جس کی آمیزش کے بغیر ست رنگی اِندر دھنش اپنے وجود کو قائم نہیں رکھ سکتی۔ کہانی پن کے بغیر کہانی ایک بے روح جسم کی طرح لگنے لگتی ہے۔ یہ امر باعثِ مسرّت ہے کہ زیرِ نظر کہانیاں کہانی پن کی مہک اور مہکار کے لحاظ سے گلِ نورستر سے کم نہیں۔

کائنات کے بے شمار رنگوں میں سے ایک رنگ وہ بھی ہے جو کبھی پیشانی کو چومتا ہے تو کبھی کلائی پر محبتوں کے پھول کھلاتا ہے اور کبھی سرتاپا چاہت کے گلابوں سے چمنستاں بن جاتا ہے۔ ڈاکٹر رینو بہل کی بیشتر کہانیوں میں یہ رنگ اپنی بہار پر ہے۔ معاشرے کو صالح معاشرے میں مبدّل کرنے والی ہستی کو ''صنفِ نازک'' قرار دینا ایک لحاظ سے جذبۂ شفقت و مرّوت کی اہمیت سے منکر ہونا ہے۔ عورت تو صحیح معنوں میں تخلیق کار ہے۔ اس کے قلم سے کہانیوں کی کونپلیں پھُوٹنا تعجب خیز امر نہیں۔ ''آنکھوں سے دل تک'' میں صرف ''اُس'' (عورت) کی ہی نہیں بلکہ ہماری، آپ کی بھی کہانیاں ہیں۔

''سراب'' کی سُدھا ہو یا ''فاصلے'' کی نیتا، دونوں پرائی عورت سے جتنا دُکھی ہیں اُس سے زیادہ اپنے اپنے شوہروں سے نالاں ہیں۔ عورت کتنی بھی فراخ دل کیوں نہ ہو مگر اپنے خاوند کی محبت میں کسی دوسری عورت کی شراکت ہرگز گوارا نہیں کر سکتی۔ محبت لاکھ بانٹنے، تقسیم کرنے کی چیز سہی لیکن اس پر جس کا حق ہو، اُس کی تو حق تلفی نہ ہونی چاہیے۔

''اعتراف'' نمرتا اور نندھی کے جذبات و احساسات کی ہی کہانی نہیں بلکہ دراصل دو نسلوں کے سوچنے کے ڈھنگ، طرزِ زندگی اور انسانی قدروں کے تئیں اُن کے رویہ میں تفاوت و تضاد کی کہانی ہے۔ نمرتا پُرانی قدروں کی پرستار ہے۔ وہ جس کھونٹے سے باندھ دی گئی اُس کو اپنا مقدر سمجھ کر مطمئن ہو رہی۔ مگر نندھی الٹرا ماڈرن سوسائٹی کی پروردہ ہے جو بغیر شادی کیے اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ رہنے میں کوئی بُرائی نہیں سمجھتی۔

''چٹکی بھر سیندور'' میں ایک غیر عورت (شاردا) کے چنگل میں پھنسے ونود کی نہیں بلکہ شاردا کی حالتِ زار بیان ہوئی ہے جسے ونود کی بے رُخی کی بدولت آخر ایک دن اپنی بھُول پر پچھتانا ہی پڑا:

''پہلی بار اُسے احساس ہوا کہ شادی صرف ایک رسم ہی نہیں بلکہ ایک مضبوط بندھن ہے جو طوفانوں کے بعد بھی نہیں ٹوٹتا۔ آدمی کی فطرت تو ایک پرندے کی مانند اُڑان بھرنے کی ہے مگر شام کو لوٹ کر وہ واپس اپنے گھروندے میں ہی آتا ہے۔''

افسانہ 'شاخِ گلاب پر کیکٹس'' ایک اہم سماجی مسئلے، ذات پات کے امتیازات پر مبنی ہے۔ نیچی ذات کی سروج نے اونچی ذات کے رمیش سے شادی ضرور کر لی مگر اُسے گھر میں وہ عزت و مرتبہ نہیں ملا جو گھر کی دوسری رئیس زادی بہو رادھا کے حصّہ میں آیا۔ لیکن رادھا نے جب اپنی برتری کے غرور سے گھر والوں کا ناک میں دم کر دیا تب اُنہیں یہ احساس ہوا کہ چھوٹی ذات کی سروج اس رئیس زادی رادھا سے کہیں بلند مرتبہ اور قابلِ احترام ہے۔

''دہشت گرد'' میں یکبارگی انتہا پسندی کے مسئلہ کی جانب توجہ منعطف ہوتی ہے مگر افسانہ نگار کا کمال یہ ہے کہ افسانہ کا اس انتہا پسندی سے کوئی تعلق نہیں، تشدد اور خوف و ہراس جس کی علامتیں ہیں۔ بلکہ یہ تو ''ہم دو ہمارے دو'' کے مروجہ فیشن کا کریہہ پہلو ہے جس میں ایک گھر کے دونوں بچے بس حادثہ میں مارے جاتے ہیں۔ اس انہونی کے بعد وشال اپنی بیوی سُدھا سے صرف اس لیے تعلقات منقطع کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ سُدھا ماں بننے کا سُکھ اپنی مرضی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تیاگ چکی تھی۔ وشال کے ان الفاظ کو:

''آج سوچتا ہوں تو تمہارے اس فیصلے پر افسوس ہوتا ہے۔ وکرم کی پیدائش کے بعد آپریشن کرانے کا تمہارا فیصلہ کتنا غلط تھا۔ اگر تم آپریشن نہ کراتیں تو آج تمہیں یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔ تم دوبارہ ماں نہیں بن سکتیں لیکن میں تو باپ بن سکتا ہوں''

باقی صفحہ ۳۱ پر ملاحظہ کیجیے

''لفظوں میں زندگی کے رنگ''

رومانہ رومی
(کراچی)

ہر تخلیق کار کو ستائش اور صلے کی تمنا سے بالا تر ہو کر مشکل سے مشکل حالات میں تخلیقیت کے مراحل طے کرنا چاہیے اور اس کا نقطۂ ارتکاز اس کا ادبی کمٹ منٹ ہونا چاہیے جس سے قوتِ نمو اخذ کر کے وہ ایسے فن پارے تخلیق کرے جس سے ادب کے سرمائے میں اضافہ ہو۔ایک خوبصورت افسانہ نگار اگر ایسے ہی اپنی کمٹ منٹ کے ساتھ جڑا ہو تو وہ اپنے مطالعے، مشاہدے اور احساسات کو لفظوں کے پیراہن میں پروتے ہوئے ایک لازوال افسانہ تخلیق کر سکتا ہے۔غور کیا جائے تو ہر اچھے افسانے کا عنصر دوسرے سے الگ ہوتا ہے اور یہی بات ایک افسانہ نگار کو ایک تخلیق کار کا روپ دیتی ہے۔کسی بھی افسانے کی کامیابی اُس کے موضوع کی حساسیت اُس کے ٹریٹمنٹ اور اُس کی روانی پر منحصر ہوتی ہے جب کہ کہانی کو افسانے کے روپ میں ڈھالنے کا ہنر تخلیق کار کی اپنی تخلیقی صلاحیت پر منحصر ہوتا ہے۔

اُردو افسانہ نگاری میں جن خواتین نے اپنی فنی ریاضت اور توازنِ اظہار کے ساتھ اپنا مقام بنایا ہے اُن میں ہاجرہ مسرور، قرۃ العین حیدر، نیلم احمد بشیر، پروین عاطف، عصمت چغتائی، خدیجہ مستور، جیلانی بانو، واجدہ تبسم، بانو قدسیہ، خالدہ حسین، رضیہ فصیح احمد، فرخندہ لودھی، نیلوفر اقبال، زہداہ حنا، طاہرہ اقبال اور شہناز شورو، بہت نمایاں ہیں۔مگر افسانہ نگاروں کا یہ کارواں یہاں رُکا نہیں بلکہ اب اس میں کئی اور نام بھی اُبھر کر سامنے آرہے ہیں جن میں فہمیدہ ریاض، اُم عمارہ، شہناز پروین، فرحت پروین، فرخندہ شمیم، عذرا اصغر اور ڈاکٹر رینو بہل شامل ہیں۔

ڈاکٹر رینو بہل صاحبہ کا افسانوی مجموعہ ''خاموش صدائیں'' ایک ایسی افسانہ نگار کا مجموعہ ہے جو زندگی کے رنگ اور وقت کے چلن کو لفظوں میں ڈھالنے کا ہنر جانتی ہیں۔وہ ایک حقیقی تخلیق کار ہیں اس لیے اُن کے افسانے اپنے اندر ایک خاص لطف، تاثیر و گہرائی اور گیرائی لیے ہوئے ہیں۔وہ زندگی کی حقیقتوں کو دل اور ذہن کی کھلی آنکھوں سے دیکھتی ہیں۔اُن کی قوتِ مشاہدہ بہترین اور مطالعۂ زندگی بہت گہرا ہے وہ رشتوں، ناتوں اور سماج میں انسانوں کی حیثیت اور اُن کے مقام کو اچھی طرح جانچنے کا فن بھی جانتی ہیں۔'خاموش صدائیں' کے افسانے زندہ لوگوں کے مردہ ضمیر پر تحریر کیے گئے ہیں۔اور میں سمجھتی ہوں کہ زندہ انسانوں سے زیادہ مردہ ضمیر کو تحریر میں لانا زیادہ مشکل کام ہے۔جیسے منٹو، عصمت، واجدہ اور ہمارے اُردو افسانے کے وہ بڑے بڑے نام جو ہماری بنیاد ہیں اُنھوں نے بھی ایسے ہی کرداروں کو اپنے افسانوں میں پینٹ کیا ہے۔بس سب کا اندازِ بیان اور دیکھنے والی نگاہ ذرا مختلف ہیں۔ڈاکٹر رینو بہل بھی اپنے افسانوں میں اُن خود غرض، مفاد پرست اور کم ظرف لوگوں کے چہروں سے نقاب اُٹھاتی دیکھائی دیتی ہیں جو معاشرے کے ناسور ہیں۔

مذکورہ افسانوں میں ''موہ جال'' ایک ایسی ہی عورت کی کہانی ہے جو عمر کے آخری حصّہ میں خود غرضی کی انتہا کو چھو لیتی ہے۔''لفٹ'' ایک ایسا شاہکار افسانہ ہے جو اُن مردوں کی نفسیات کو سامنے لاتا ہے جو عورت کو کسی نا کسی بہانے چھو کر ہی اپنے جذبات کی تسکین حاصل کرتے ہیں۔بوڑھے ماں باپ اب ہمیں اپنی ذمہ داری نہیں بلکہ بوجھ محسوس ہونے لگے ہیں اور اس معاشرتی المیہ کا احساس اُنھوں نے اپنے افسانے ''حاصلِ زندگی'' میں بہت خوبصورتی سے دلایا ہے۔''بادِ نو بہار چلے'' عورت کی ہمت اور جرات کی ایک ایسی داستان بیان کرتا نظر آتا ہے جو طوفانوں کے رُخ بدلنے کا ہنر جانتی ہے۔''اور طلسم ٹوٹ گیا'' میں وہ اکیسویں صدی کی اُس عورت کا چہرہ پینٹ کرتی دکھائی دیتی ہیں جو ہماری تہذیب، روایت اور ترقی پسند ذہن نے بھی ابھی تک قبول نہیں کیا۔

ڈاکٹر رینو بہل نے سماج کے ہر اُس مسئلے کو افسانہ کے قالب میں ڈھالا ہے جو ناسور کی شکل اختیار کر چکا ہے''بندھے ہاتھ'' ایک ایسی ہی عورت کی کہانی ہے جو ہمارے سماج میں بیوہ کے نام سے پہچانی تو ضرور جاتی ہے مگر اس کو بیوہ مان کر اُس کے حقوق کو تسلیم کرنا اور اُن کی ادائیگی اور تحفظ کے لیے کبھی کوئی عملی قدم نہیں اُٹھایا جاتا۔''ایک خواہش ایک سوال'' اُن کا وہ خوبصورت افسانہ ہے جو انسان کے دل میں حسرتِ ناکام کی طرح پلتی ہوئی لامحدود خواہشات کو ڈسکس کرتا ہے جن کی تکمیل کی خواہش انسان کو کبھی کبھی بہت مہنگی بھی پڑتی ہے۔''خواب سے حقیقت تک'' ایک لاجواب افسانہ ہے جو انسانوں کے منفی رویوں کو مثبت رویوں میں تبدیل کیے جانے اور اپنی زندگی کو با مقصد بنانے اور دوسروں کے لیے کچھ کر نے کا جذبہ رکھنے والے پر لکھا گیا ہے۔''ایک ہی رہ گزر'' تیسری دنیا کے ہر اُس شہر کا فسانہ ہے جہاں لوگوں کو جانوروں کی طرح سمجھا اور برتا جاتا ہے۔جہاں ہر سیاسی و سماجی ادارہ لوگوں کو خریدنے اور اُن پر کاروبار کرنے کا ہنر جانتا ہے۔مگر مصنفہ نے اپنے اس افسانے میں اُس عام عوام کی بدلتی ہوئی سوچ اور اپنے مستقبل کی فکر کرتے دکھایا ہے۔غربت، افلاس، لاچاری اور معصوم اور نوجوان لڑکیوں سے سماج کے منفی کرداروں کے ہاتھوں اُن کی زندگی کے خوبصورت لمحات چھین لیے جانے کے موضوع پر لکھے گے افسانے''سفر در سفر'' میں ڈاکٹر صاحبہ نے قاری کے ذہن کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے اور اپنا پیغام بہت خوبصورتی سے اُن تک پہچانے میں کامیاب رہی ہیں۔''زخمِ انا'' اُن محبت کرنے والوں کی داستان ہے جو محبت میں دوسرے فریق کو اپنی ذاتی ملکیت تصور کرنے لگتا ہے اور اس حد تک آگے بڑھ جاتا ہے کہ اُن کی یہ حقِ ملکیت دوسرے کو اُن سے بدظن کر دیتی ہے۔

ڈاکٹر رینو بہل کی سادہ زبان اور سلیس طرزِ بیان نے افسانوں کو

ایک نیا پن دیا ہے۔اس مجموعہ کے اکثر افسانوں کا اختتام ایک خاص طرح کی ملال انگیز اُداسی پر ہوتا ہے جو قاری کو اپنی گرفت میں لے کر اُسے سوچنے اور نتیجہ اخذ کرنے پر مجبور کرتا ہے۔

اُمید کی روشنی کو روکنے کی کوتاہی ڈاکٹر رینو بہل کی افسانہ نویسی میں کہیں نہیں ہے انہوں نے انسانی فطرت پر گہری نگاہ رکھی ہے اور افسانوں میں اس کی گہرائی و گیرائی کا اظہار بھی کیا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے ان کے افسانے آس پاس بکھری کہانیاں لگتے ہیں جنھیں دھیمی آنچ پر پکی اس عورت نے گہری تاپ کے احساس کے ساتھ قلمبند کر دیا ہے۔ڈاکٹر رینو بہل ایک خوبصورت افسانہ نگار ہیں اور مجھے یقین ہے کہ وہ آئندہ بھی تخلیق کے اس گہرے سمندر سے ہمارے لیے بیش قیمت اور نایاب افسانے تحریر کریں گی۔

بقیہ: سب سے بڑا سچ

کرے گی۔کہتی ہے وہ اس بچے کے لیے جئے گی، اب مجھے کوئی فکر نہیں۔ جہاں وہ اس بچے کو پالے گی وہاں مجھے بھی پال لے گی۔۔۔''

کملا کا یہ الفاظ سن کر سماجی قدروں کے محافظوں کو ہضم ہو یا نہ ہو لیکن کملا کو راس آتا ہے۔اور جو اسے راس آ رہا ہے اس کی نظر میں وہ غلط نہیں ہو سکتا۔ وہی سب سے بڑا سچ ہے۔

زندگی کی حقیقت جو کملا کی زندگی میں امید جگا رہی ہے، ایک سہارے کی۔سہارا جو اس کی بقا کے لیے ضروری ہے وہ اسے غلط کیسے سمجھ لے۔

ایک پل کے لیے کملا کے نقطۂ نظر سے سہمت ہو کر دیکھیں تو آپ رینو بہل سے اس سے بھی اچھی کہانیوں کی امید کر سکتے ہیں۔اس انجام کی طرف رینو بہل کا آخری جملہ اشارہ کر رہا ہے۔

''آشاورما، بڑھاپے کی لاچاری، مجبوری، اس کی سوچ اور کملا کے نئے روپ کو دیکھتی ہی رہ گئی۔''

بقیہ: آنکھوں سے دل تک

ساتھ گزر بسر کرتی ہے اور حالات پر نظر رکھتے ہوئے اسے آج کے خراب ماحول سے کس طرح بچاتی ہے، اسی افسانے میں یہ بھی دکھایا گیا ہے کہ کچھ گھرانوں کی عورتیں کتنی رحم دل اور ہمدرد ہوتی ہیں۔ یہ غریب عورت کملا آخر کار ہزار مشکل اور ہزار خرابیوں کے ساتھ اس کی ایک جگہ شادی کر کے مطمئن ہو جاتی ہے، ممتا کے سسرال والے اور شوہر لڑکا پیدا ہوا اس امید میں تھے مگر ممتا نے لڑکی جنی تو انہوں نے ممتا کی دیکھ بھال میں کمی کی جس کے نتیجہ میں ممتا زندہ نہ رہ سکی اور اس کی لڑکی کو نانی کی گود میں ڈال دیا گیا۔ پھر یہ لڑکی جب بڑی ہوئی تو نانی بوڑھی ہو گئی اور جوان لڑکی اس کے بڑھاپے میں سنبھل نہ سکی۔''موہ جال'' کیا رینو بہل کی تمام افسانوی تحریرات زبان و بیان کا اعلیٰ ترین مرقع ہیں، سیدھی سادی عوامی زبان استعمال کی گئی ہے۔ پیچیدگی اور گنجلک پن بالکل نہیں، ان کے افسانے پڑھتے وقت قاری محویت و بیخودی میں، بے خبری کے عالم میں چلا جاتا ہے۔

رینو بہل کی جرأت تحریر ان کی ادبی صلاحیت اور ان کی تخلیقی جہدِ عمل قابلِ رشک ہے۔ وہ اپنے کردار کی خوب خوب تجسیم کرتی ہیں، وہ آدمی کے جذباتی عکاسی کے منفرد پہلوؤں کو تلاش کر کے ان پر پورے اطمینانِ قلب کے ساتھ، جملہ جزئیات و منظر نگاری کے ساتھ لکھتی ہیں، جو قابل قدر و قابلِ ستائش ہے۔ ان کے افسانے معیار و اقتدار، اعتبار و وقار کے لحاظ سے نہایت جامع ہوتے ہیں۔ جو اُن کی ریاضت و لگن کی شاہد دلیل ہے، ان کی زبان ابہام و اشکال سے پاک و شستہ ہے، ان کو معاشرہ و سماج کی حقیقی ترجمان کہا جانا مناسب ہے، ان کی تخلیقات بلاشبہ اجماعی اثاثہ قرار دیا جانا چاہیے۔ اللہ کرے ان کا قلم منزلِ ارتقا کی جانب یوں ہی رواں دواں رہے۔

بقیہ: جادو بیاں قلم کار

صرف وشال کی خود غرضی مان لینا ہی اُس نازک مسئلہ کا حل نہیں ہے۔اس درد کا درماں تو کچھ اور ہی ہے۔

''آنکھوں سے دل تک'' کے چند اور افسانے مثلاً ''کوکھ جلی''، ''انتقام'' اور ''وشی کرن'' کماؤ بچوں کے بے سہارا ضعیف والدین کے باطنی کرب، غلط راستوں پر نکل جانے والی ماؤں کی بگڑی بیٹیوں، عصمت مآب بیویوں کی بدکرداری اور بھروسہ مند دوستوں کی بدعہدی اعتماد شکنی جیسے عصری مسائل کا آئینہ ہیں۔

زبان و بیان کے اعتبار سے یہ افسانے سادہ بیانی کے خوبصورت مرقعے ہیں۔ یوں بھی کہانی تو دریا کے بہتے پانی کی طرح ہوتی ہے۔ واقعات و کردار اور زبان کہانی کو آگے بڑھاتے ہیں، روکتے نہیں۔ قاری بنا رُکے، بنا ٹھہرے، بنا دم لئے کہانی کی لہروں کے ساتھ بہتا چلا جائے، یہی افسانہ کا حُسن ہے اور۔۔۔''آنکھوں سے دل تک'' کے افسانے اس روانی کی بہترین مثالیں ہیں۔

اس دورِ کشاکش میں اتنا وقت کس کے پاس ہے کہ سب کچھ تج کر صرف مطالعۂ ادب کے لیے خود کو وقف کر دے۔ آج، جبکہ فرصت کے لمحات خواب و خیال ہوئے جاتے ہیں، ڈاکٹر رینو بہل کے یہ افسانے اپنی خوش بیانی کی بدولت سکون و اطمینان کی ہواؤں کے فرحت بخش جھونکوں کی طرح یقیناً آپ کو تازہ دم کریں گے۔ خدا اس جادو بیاں قلم کو زندہ و پائندہ رکھے۔ آمین!

دروپدی جاگ اُٹھی

ڈاکٹر رینو بہل

خاموش رات کے سائے بڑھنے لگے تھے۔ گاؤں کی سرحد پر ٹین کی چھت والے دیسی شراب کے ٹھیکے میں ابھی بھی گہما گہمی تھی۔ نہال سنگھ شام ڈھلتے ہی چرن سنگھ کے ساتھ وہاں آ گیا تھا۔ چرن سنگھ اُس کے بچپن کا دوست اُس کی تکلیف سے بخوبی واقف تھا۔ وہ جانتا تھا کہ بے بے کے چلے جانے کے بعد اب اپنا ہی گھر اُسے پرایا لگنے لگا ہے وہ اپنی زندگی سے بیزار ہو گیا ہے۔ شراب پیتے پیتے وہ اُسے زندگی کی طرف واپس لانے کی کوشش کرتا رہا۔ حسبِ وعدہ وہ خاموش اُس کی باتیں سنتا رہا۔ نشہ چڑھنے کے بعد اُسے چپ سی لگ جاتی تھی۔ وہاں سے اٹھنے سے پہلے ایک بار پھر اس نے نہال کو اپنے ساتھ چلنے کا زور ڈالا۔ ڈگمگاتے قدموں اور لڑکھڑاتی زبان سے کبھی اُونچی تو کبھی دھیمی آواز میں کچھ کہی، کچھ ان کہی باتیں کبھی خود سے تو کبھی اِک دوسرے کو کہتے سناتے دونوں گاؤں کی طرف روانہ ہو گئے۔ پھر اک موڑ پر دونوں کے راستے الگ الگ ہو گئے۔ رات کے اس پہر گاؤں کی گلیاں ویران ہو چکی تھیں۔ دور سے مینڈک کے ٹرٹر کی آوازیں چُپی کو توڑ رہی تھیں۔ بے ترتیبی سے اُٹھتے قدم نکڑ پہ سوئے کُتے پر جو پڑے جو وہ پُوں پُوں کرتا ہوا اٹھ کر پہلے پیچھے ہٹا پھر اُسے آگے چلتے دیکھ پیچھے سے بھونکنے لگا۔ اُس نے رک کر پیچھے دیکھا اور موٹی سی گالی دی پھر آگے بڑھ گیا۔ گھر کا دروازہ بند تھا۔ دو تین بار زور زور سے کھٹکھٹانے کے بعد دروازہ پمو نے کھولا۔ منہ میں کچھ بُڑ بُڑاتی ہوئی رسوئی کی طرف بڑھ گئی۔ وہ صحن میں بچھے تخت پر جا کر بیٹھ گیا۔ اس کی بے بے تو ہمیشہ کام سے فارغ ہو کر اسی تخت پر بیٹھتی تھی۔ اس نے پیار سے بستر پر ہاتھ پھیرا اور پھر آستین سے ہی بہتی آنکھیں صاف کرنے لگا۔ پمو دو منٹ بعد تھالی میں دال روٹی لے کر اُس کے پاس آئی۔ بنا کچھ کہے تخت پر تھالی رکھی اور مڑنے لگی تو اُس نے پمو کی کلائی پکڑ لی اور پوچھنے لگا۔

''مکھنی سو گیا کیا؟''

اپنے چھوٹے بھائی مکھن سنگھ کو وہ پیار سے مکھنی ہی کہتا تھا۔

پمو نے ایک جھٹکے سے اپنی کلائی چھڑالی اور بنا کسی بات کا جواب دیئے رسوئی کی طرف بڑھ گئی۔

''تجھے اب میں زیادہ تکلیف نہیں دوں گا۔ چلا جاؤں گا یہاں سے''

یہ کہتے ہوئے وہ کھانا کھانے لگا۔ شراب پی کر وہ گلے تک رج چکا تھا، دو نوالے ہی منہ میں ڈالے باقی کھانا وہیں چھوڑ وہ زینہ چڑھ کر چھت پر پہنچ گیا۔ کھُلے آسمان کے نیچے ہر روز کی طرح اس کا بستر لگا ہوا تھا۔ وہ جاتے ہی بستر پر گر گیا۔ تاروں بھرے آسمان کی طرف دیکھا تو اُسے بادلوں میں بے بے کی شکل نظر آنے لگی۔ آنکھیں کھول کر دوبارہ دیکھنا چاہا تو آنکھیں کھولنے کی طاقت ہی نہ رہی۔ دو منٹ میں ہی وہ بے سُدھ ہو کر سو گیا۔

نہال سنگھ کوئی شرابی نہیں تھا۔ سال میں پانچ چھ مرتبہ ہی شراب پیتا، کبھی زیادہ غم ہو یا پھر کوئی خاص شادی بیاہ کا پروگرام ہو تو۔ ہاں اگر کبھی تین چار مہینے بعد چرن سنگھ کے ساتھ شہر میں نتھنی والی کے پاس جانے کا پروگرام بن جاتا تو وہ چُپ چاپ شراب گٹکا لیتا تھا مگر گاؤں میں بے بے کے سامنے پی کر جانے کی اُس کی ہمت نہ ہوتی۔ گھر میں صرف وہ ہی تو تھا جو بے بے کی گھوری سے ڈرتا تھا یا یوں کہو کہ بے بے کو تکلیف نہیں دینا چاہتا تھا۔ اُس کے دکھ میں تڑپ اُٹھتا تھا۔ اس کے دو چھوٹے بھائی مکھن سنگھ اور بیسا کھا سنگھ ڈٹ کر شراب پیتے تھے اور روڈا سنگھ تو بے بے کے قابو میں بالکل نہیں تھا۔ وہ تو پکا نشئی ہو چکا تھا۔ ہزاروں نوجوانوں کی طرح اُسے بھی افیم گانجے کی لت لگ چکی تھی۔ اُسے نہ کسی کا خوف تھا اور نہ لحاظ۔

رات بھر وہ بے سُدھ پڑا رہا۔ صبح سُورج سر پر چمکنے لگا تو مکھن نے آ کر بھائی کو جگایا۔ نہال تو پو پھٹنے سے پہلے ہی اُٹھنے کا عادی تھا۔ ہر روز صبح بے بے کی گُربانی کی آواز رس گھولتی ہوئی کانوں میں ٹپکتی تو وہ نیند سے جاگ اٹھتا۔ اُسے صبح بہت میٹھی لگتی تھی جس کا احساس اُسے بے بے کے گزر جانے کے بعد ہوا۔ اب اسے صبح پھیکی اور زندگی بے رنگ لگنے لگی تھی۔ گھر سُونا سُونا لگنے لگا تھا۔ وہ پہلے کہا جاتا تھا کہ بھرا پورا پریوار اور گھر کی رونق صرف بے بے کے دم سے ہی ہے۔ صحن میں تخت پر بیٹھی بے بے کی نظریں چاروں جانب گھومتیں۔ آواز اتنی دم دار کہ پمو کی آواز حلق میں ہی اٹک جاتی۔ اُس نے تو پمو کی آواز بھی کبھی ڈھنگ سے نہیں سُنی تھی۔ کبھی پمو سے بات کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔ بے بے کی ایک آواز پر وہ اس کے لیے کھانے پینے کا سامان لے آتی۔ سر پر دوپٹہ اوڑھے چپ چاپ سب کام کرتی رہتی اور منہ سے زبان تک نہ نکلتی۔ نہال سنگھ نے کئی بار پمو کو سُناتے ہوئے بے بے سے بات کی تھی، وہ بھی کن انکھیوں سے اُسے دیکھتی، اُسے محسوس ہوتا کہ وہ اُس کی باتیں سُن کر مسکرا رہی ہے۔ ایک روز اس نے پمو کو سُناتے ہوئے بے بے سے اُس کے بنائے کھانے کی تعریف کی تو وہ سب سُن رہی تھی۔ تعریف کے دو بول بے بے نے بھی بول دیئے تو خاموش مندمند مسکراتی رہی۔ نہال نے بے بے سے پوچھا۔

''بے بے کہیں مکھن کے ساتھ کوئی ظلم تو نہیں ہو گیا؟''

''وہ کیا پُتر؟ بے بے نے حیرانگی سے پوچھا۔

''یہ گنگی تو نہیں؟''

''چل ہٹ چندریا۔ میسنی ہے سب سُنتی بھی اور بولتی بھی ہے۔ مکھن سے پوچھ لینا کتنے کان بھرتی ہے اُس کے۔

''لگتی تو نہیں بے بے۔'' اُس نے دھیرے سے کہا۔

وہ چپ چاپ سُنتی رہی اور کام کرتی رہی۔ بے بے نے بات بدلتے ہوئے کہا۔

''میں سوچتی ہوں چانن سے بات کروں''

''کس لئے؟''

''اس کی بیٹی کا ہاتھ مانگ لوں تیرے لیے''

''بے بے اُس کی عمر دیکھی ہے؟ کم سے کم پندرہ سال چھوٹی ہے وہ مجھ سے۔ چاچا کبھی اس رشتے کے لیے نہیں مانے گا۔ تو بس اُمید چھوڑ دے۔''

''ہائے ہائے اکال پڑ گیا لڑکیوں کا۔''

''بے بے کیوں فکر کرتی ہے ہم اکیلے تو چھڑے نہیں ہیں اس گاؤں میں۔ یہاں نہیں ہوگی تو کہیں اور ہوگی۔ اگر قسمت میں لکھا ہوگا تو مل ہی جائے گی۔ ہمارے مکھنی کو بھی تو مل ہی گئی تیری پمو۔''

''میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے تو نہیں بیٹھ سکتی۔'' یہ تو میں ہی جانتی ہوں کہ کیسے اس کا باپ راضی ہوا تھا رشتے کے لیے۔ میں تو تیرا رشتہ لے کر گئی تھی مگر اُسے گوراچٹا مکھن پسند آ گیا تھا۔

''پھر کیا ہوا بے بے میں بھی جیٹھ ہوں۔ اور سال میں ایک مہینہ جیٹھ کا بھی ہوتا ہے''۔ اس نے شرارت سے مسکراتے ہوئے پمو کی طرف دیکھ کر کہا جو کپڑے دھو کر پانی سے نکال رہی تھی۔ اس نے پھر بات سُنی ان سُنی کر دی اور بے بے نے اُس کے سر پر پیار سے چپت لگا دی۔

''چھوٹی بھابی ہے، مذاق مت کیا کر''

وقت گزرتا گیا، بے بے کی کوششیں ناکام ہوتی رہیں۔ سچ مچ لڑکیوں کا اکال ہی پڑ گیا تھا۔ وہ بھی تو چار چار بیٹے جن کر کتنی خوش تھی۔ اُس نے بھی تو جانے انجانے قدرت کے فیصلے کو نکارا تھا۔ بغاوت کی تھی قدرت سے۔ شاید اسی کی سزا آج وہ بھگت رہی ہے۔ اُس کا ضمیر اُسے دُھتکارتا۔ وہ تڑپ اُٹھتی مگر کسی سے کچھ نہ کہتی اپنی تکلیف اپنے اندر ہی پی جاتی۔

بے بے نہال کو بہت مانتی تھی۔ چاروں بیٹوں میں وہ اُسے سب سے زیادہ عزیز تھا۔ شاید اس لیے کہ وہ اُس کی پلیٹھی کی اولاد تھی۔ نہیں پلیٹھی کی اولاد کو تو اُس کی ساس نے دنیا میں آنے سے پہلے ہی اس کی کوکھ میں مروا ڈالی تھی۔ انہیں بیٹی نہیں چاہیے تھی اور اس کا مجازی خدا، ماں کے فیصلے کے خلاف ایک لفظ بھی نہ بولا، بُت بنا اس کی بے بسی دیکھتا رہا۔ اس کی فریاد کو نظر انداز کر دیا۔ اس کے سامنے دو راستے تھے یا اپنی کوکھ کو بچا لے یا پھر اپنی شادی کو۔ اور اس وقت کمسن، لاچار، نمانی کیسرو نے اپنی شادی کو بچانے کے لیے اپنی پلیٹھی کی اولاد قربان کر دی۔ بہت روئی تھی، بہت سسکی تھی پھر اس چوٹ نے اسے توڑنے کے بجائے اور مضبوط بنا دیا تھا۔ ایک لمبے عرصے تک اُس نے اپنے مجازی خدا پر یتم سنگھ کو اپنے پاس نہیں بھٹکنے دیا تھا۔ اس کی مردانگی چکنا چور کر دی تھی۔ ہتھوڑے کی طرح کیسرو کی بات اُس کی انا پر برسی تھی جب ایک رات کیسرو نے اس کا ہاتھ اپنے جسم سے حقارت سے یہ کہہ کر جھٹک کر پیچھے دھکیل دیا تھا۔

''اپنی بے بے سے اجازت لے کر آیا ہے کہ نہیں؟ نہیں لایا تو پہلے پوچھ لے اپنی بے بے سے، پھر آنا۔ ماں کا دینا۔''

یہ گالی اُس نے دھیمی آواز میں دی تھی جو پگھلتے سیسے کی طرح اس کے کانوں میں پڑی تھی۔

اتنا کہہ کر وہ کمرے سے نکل کر صحن میں آ گئی تھی اور اُس رات پریتم سنگھ انگاروں پر لوٹتا رہا۔ اس رات اسے احساس ہو گیا تھا کہ وہ مرد ہو کر بھی اُس سے زیادہ کمزور، کم ظرف ہے۔ اُس رات کے بعد اس نے اپنی بے بے کا پلو چھوڑ کر بیوی کا آنچل تھام لیا تھا۔ بے بے تلملاتی رہی اور کیسرو دن پر دن نکھرتی گئی سنورتی گئی۔ ایک کے بعد ایک کیسرو نے چار بیٹے جنے۔ سب سے بڑا بیٹا پیدا ہوا تو دادا دادی اسے دیکھ کر نہال ہو گئے تو دادی نے اس کا نام ہی نہال سنگھ رکھ دیا۔

اس کے دو سال بعد گوراچٹا بیٹا پیدا ہوا تو کیسرو نے اس کا نام مکھن سنگھ رکھ دیا۔ پھر اُس کے اگلے سال ایک اور بیٹا پیدا ہوا جسے دیکھتے ہی دادی نے کہا تھا۔

''پریتم یہ کیا؟ سردار کے گھر روڈا بچہ؟''

''اس روز سے پریتم نے اسے روڈا ہی کہہ کر بلانا شروع کر دیا۔

تین سال لگاتار اِدھر کھیتوں میں فصل کی کٹائی ہوتی تو اُدھر گھر میں کیسرو کی فصل بھی تیار ہو جاتی۔ سب سے چھوٹا بیٹا بیسا کھا، بیسا کھی والی شام کو ہی پیدا ہوا تھا۔ اس سال بیسا کھی کی خوشیاں دوبالا ہو گئی تھیں۔

جیسے جیسے کیسرو کے پیر جمتے گئے، ساس کے ہاتھوں سے گھرہستی کی کمان ڈھیلی ہوتی گئی۔ دادی پوتوں کی ریل پیل دیکھ کر خوش تھی مگر پریتم سنگھ بیٹوں کی جوانیاں نہیں دیکھ سکا۔

نہال جوان ہوا تو کیسرو کے دل میں بیٹے کے سر پر سہرا دیکھنے کی خواہش جوان ہونے لگی۔ اس نے رشتے کے لیے اِدھر اُدھر ہاتھ پیر مارنے شروع کر دیئے۔ نہال سے بڑی عمر کے کئی جوان گاؤں چھوڑ کر شہر جا بسے تھے صرف اس وجہ سے کہ اُن کو گاؤں میں شادی کے لیے لڑکیاں نہیں مل رہی تھیں۔ اس کی بے بے نے بھی نہال کے لیے کئی دروازے کھٹکھٹائے، آس پاس کے گاؤں تک جا پہنچی مگر اس کے سنجوگ سوئے رہے۔ بے بے نے تو خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ اس کے ہیرے جیسے بیٹے کے لیے دلہن ملنا اتنا مشکل ہو جائے گا۔ جب خالی جھولی لے کر گھر لوٹتی تو اکثر کہتی۔

''لگتا ہے لڑکیوں کا اکال پڑ گیا۔ جس کے گھر دیکھو لڑکے ہی لڑکے ہیں اور اگر کہیں لڑکی ہے تو ان لوگوں کے نخرے ہی بہت ہیں زیادہ بڑے زمیندار چاہیے انہیں''

''چہارسُو''

وقت گزرنے لگا تو بے بے کی فکر بھی بڑھنے لگی۔ چار چار جوان بیٹے، وہ بھی بِنا باپ کے، نہ کسی کا ڈر نہ کسی کا لحاظ مشٹنڈوں کی طرح سارے گاؤں میں دندناتے پھرنے تک گاؤں کے کسی کونے میں وقت گزاری کے لیے کبھی دارو، کبھی تاش، کبھی تالاب کے پاس آتی جاتی گاؤں کی لڑکیوں، عورتوں کا سر سے پاؤں تک بے باک جائزہ لیتے تو کبھی موبائل پر دیکھی فلموں پر تبصرہ کرتے۔ بے بے ان کے پاؤں میں ذمہ داری کی بیڑیاں پہنانے کو بے چین تھی۔ اب تو صرف نہال ہی نہیں بیسا کھا تک کی عمر شادی کے لائق ہو چکی تھی۔ اس میں اتنی قوت نہیں تھی کہ اُن کی جوانیاں سنبھال کر رکھتی۔ اُسے تو ہر وقت یہ ڈر لگا رہتا کہ کہیں کوئی ایسا کام نہ کر بیٹھیں جس کی شرمندگی سبھی کو تا عمر اُٹھانی پڑے۔ گاہے بہ گاہے وہ انہیں اشاروں اشاروں میں تاکید کرتی رہتی۔ وہ اکثر اپنی بوڑھی ساس سے کہتی:

''دیکھ لیا چار چار پوتوں کا سُکھ۔ کیا اسے گھر کہتے ہیں؟ نہ کسی کے آنے جانے کا وقت، نہ انہیں اُٹھنے بیٹھے کا سلیقہ، گھر میں بہن ہوتی تو اس طرح ننگ دھڑنگ بے شرموں کی طرح سارے گھر میں نہ گھومتے پھرتے۔ گاؤں کی کوئی بھی عورت ہمارے گھر آنا اسی لیے پسند نہیں کرتی کہ ان کم بختوں کو زندگی کے طور طریقے نہیں آتے۔ اب تو میں سوچتی ہوں کسی کی بھی شادی ہو جائے۔ گھر میں ایک لڑکی آ جانے سے کم سے کم یہ گھر گھر تو بن جائے گا اب تک تو یہ راکھشوں کا اکھاڑا لگتا ہے۔''

بوڑھی دادی پوتے کے سر پر سہرا دیکھے بنا ہی پوری عمر بھوگ کر چل بسی۔ کھیتوں کا کام چاروں بھائی سنبھالتے تھے۔ گھر اور مویشیوں کی ذمہ داری بے بے کے سر تھی۔ اکیلی جان گھر کا بوجھ ڈھوتے ڈھوتے اب تھک چکی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اب نسل آگے کیسے بڑھے گی۔ اس روز منجیت بتا رہی تھی کہ چودھری کالڑکا گاؤں کے ایک لڑکے کے ساتھ بھاگ گیا۔ کل کو اگر اس کا کوئی بیٹا ایسا نکلا تو۔۔۔؟ یہ خیال آتے ہی وہ لرز اٹھی۔ وہ ہاتھ پر ہاتھ رکھے نہیں بیٹھ سکتی۔ بہو تلاشنے کی مہم ایک بار پھر تیز کر دی تھی۔ اس بار وہ کامیاب ہو گئی تھی۔ رشتہ تو وہ نہال کے لیے مانگنے گئی تھی مگر پمو کے گھر والوں کو مکھن زیادہ پسند تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی نہال کو چھوڑ کر اسے پہلے مکھن کے سر سہرا سجانا پڑا۔ دُلہن کے گھر آ جانے سے گھر کے نقشے میں کچھ سدھار تو ہوا تھا۔

نئی نویلی دُلہن کو گھر میں گھومتے دیکھ نہال کو کچھ اٹ پٹا سا لگا تھا۔ وہ گھر کا بڑا بیٹا، اگر اُس کی شادی پہلے ہو جاتی تو یہ چوڑیوں کی کھنک یہ پازیب کا مدھم سنگیت وہ بے جھجک اس رس میں ڈوب جاتا پر اب وہ ان سب سے کترانے لگا تھا۔ زیادہ سے زیادہ وقت وہ گھر سے باہر ہی گزارتا۔ پمو کے آنے سے پہلے وہ گرمیوں میں صحن میں بستر بچھا کر اپنے بھائیوں کے ساتھ سو جاتا تھا مگر اب انہوں نے صحن کے بجائے چھت پر سونا شروع کر دیا تھا۔ پہلے تین بھائی چھت پر سوتے تھے پھر دورہ گئے۔ روڈے کی راتیں اکثر گھر سے باہر گزرنے لگیں تھیں۔

اُسے نشے کی اسی لت لگ چکی تھی کہ بے بے اور نہال کوششوں کے باوجود اُسے اس جنجال سے نکال نہیں پائے تھے۔ پھر وہ دن بھی آیا جب لاکھ کہنے کے باوجود اس نے کھیتوں پر آنا تو چھوڑ ہی دیا تھا اوپر سے اپنے حصے کا تقاضا بھی کرنا شروع کر دیا۔ سب جانتے تھے اُسے اپنا حصہ کس لئے چاہیے۔ اس کے پردادا کے پاس پچاس ایکڑ زمین تھی جو بٹتے بٹتے اس کے والد کے حصے میں دس ایکڑ ہی رہ گئی تھی۔ اب اس دس ایکڑ کے بھی چار حصے لازمی تھے۔ بے بے نے جب اسے پیار سے، ڈانٹ سے، غصہ سے منانا چاہا وہ پھر بھی اپنی ضد پر اڑا رہا تو بے بے نے چار کی جگہ زمین میں پانچواں حصہ مانگ لیا۔ وہ پانچواں حصہ خود اس کے لیے تھا۔ دو ایکڑ کا حصہ لے کر وہ گھر سے الگ ہو گیا۔

پمو نے بہت جلد گھر کے سبھی کام اپنے ہاتھ میں لے لئے۔ بے بے صحن میں بیٹھی بیٹھی اس کے کاموں میں ہاتھ بٹانے لگی تھی۔ کام بھی کرتی جاتی، پاٹھ بھی کرتی رہتی، بہو سے باتیں بھی کرتی اور نہال اور بیسا کھا کی ہر ضرورت کا خیال بھی رکھتی۔ ایک بار نہیں ہزار بار اُس نے یہ بات سُنا کر پمو کو پکّا کر دیا تھا کہ:

''دیکھ نُورانی یہ بات پلّے باندھ لے جب تک تیرے جیٹھ اور دیور کی شادی نہیں ہو جاتی، ان کے سب کام تو ہی دیکھے گی۔ ان کی ہر ضرورت کا خیال تو نے ہی رکھنا ہے۔ جب ان کی بیویاں آ جائیں گی تو وہ جانیں یا یہ جانیں تو اپنے فرض سے پیچھے مت ہٹنا۔''

وہ سر کو ذرا سی جنبش دے کر ''ہاں'' میں سر ہلا دیتی۔

ایک رات نہال اور بیسا کھا کھانا کھا کر چھت پر سونے کے لیے پہنچ گئے۔ دونوں دیر تک باتیں کرتے رہے پھر بیسا کھا نے کچھ رُک کر کہا:

''ویرے میں نے ضروری بات کرنی ہے تجھ سے''

''اتنی دیر سے غیر ضروری باتیں کر رہا تھا''۔ اس نے کروٹ اس کی طرف بدل کر کہا۔

''سوچتا تھا کہوں یا نہ کہوں؟''

''ایسی بھی کون سی بات ہے، اب کہہ بھی دے۔ نیند آ رہی ہے مجھے اب۔ جلدی سے بتا کیا بات ہے؟''

''بُدھ کو جگتار ٹرک لے کر کلکتہ جا رہا ہے۔ مجھے بھی ساتھ چلنے کو کہہ رہا ہے۔ میں سوچتا ہوں میں بھی چلا جاؤں۔''

جگتار اور کلکتے کا ذکر سُن کر اُس کا ماتھا ٹھنکا۔ نیند یکدم غائب ہو گئی اور وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

''تو نے کیا کرنے جانا ہے اُس کے ساتھ؟''

''میں۔۔۔'' وہ ہکلانے لگا۔

''دیکھ بیسا کھے مجھے صاف صاف سب بتا دے میں جگتار کو بھی جانتا ہوں اور تیرے ارادے بھی مجھے ٹھیک نہیں لگ رہے۔ بتا کیا بات ہے؟''

''تھک گیا ہوں میں میرے، لوگوں کی باتیں سُنتے سُنتے۔ کل کے چھوکرے پھبتیاں کستے ہیں، اپنے ہی یار دوست جن کے ساتھ بچپن میں کھیل کر جوان ہوئے، ہمیں دیکھ کر راستہ بدل لیتے ہیں اور اگر اُن کے گھر چلے جاؤ تو باہر دروازے سے ہی بھگا دیتے ہیں۔ ویرے ہماری شادی نہیں ہوئی، اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ ہماری کوئی عزت ہی نہیں''

''یہ عزت والی بات کہاں سے آ گئی؟ بے بے نے کتنی کوشش کی۔ ہمارے لیے لڑکی دیکھنے کی اگر قسمت میں نہیں بیاہ لکھا تو کوئی کیا کر سکتا ہے؟ اور پھر ہم اکیلے ہی تو اس گاؤں میں چھڑے ملنگ نہیں ہیں اور بھی تو ہیں ہمارے ساتھی۔''

''مجھ میں تم جیسا صبر نہیں۔''

''کیا مطلب؟ تُو کہنا کیا چاہتا ہے صاف صاف بتا۔''

''میں جگتار کے ساتھ کلکتہ جاؤں گا اور وہیں سے اپنے لیے دُلہن لے آؤں گا۔ وہ کہتا تھا وہاں آسانی سے لڑکیاں مل جاتی ہیں''

''اوہ! تو یہ بات ہے۔ تُو دلہن خرید کر لائے گا؟''

''ایسا ہی سمجھ لو''

''مگر بے بے اس کے لیے کبھی راضی نہ ہوگی۔ کسی بنگالن کو وہ اپنی بہو کبھی نہیں مانے گی۔ اور یار سوچ تو کل تیرے بچے ہوں گے۔ سردار کے بچے، جٹ کے بچے بنگالی صورت والے'' سوچتے ہوئے اسے بے ساختہ ہنسی آ گئی۔

''جو بھی ہوگا ٹھیک ہوگا۔ ہونگے تو میرے ہی بچے'' وہ جھنجھلا کر بولا۔

''دیکھ بیسا کھے یہ تیری زندگی ہے تُو اپنی مرضی کا مالک ہے مگر میں جانتا ہوں بے بے کبھی راضی نہ ہوگی۔ وہ تو نائی کی کملیشو کا سُن کر بھڑک اٹھی تھی تو کیا ہوا اگر وہ نائی کی بیوہ بیٹی تھی، تھی تو اپنے علاقے کی۔ اگر تُو بنگالن لے آیا تو اُس کی بات کون سمجھے گا؟''

''کچھ بھی ہو۔ اچھا ہے نہ وہ کسی کی بات سمجھے اور نہ کوئی اس کی بات سمجھے۔ کم سے کم میرا گھر تو بس جائے گا۔ لوگوں کے منہ تو بند ہو جائیں گے''

''سوچ لے ایک بار پھر۔ اور سُن بے بے سے بات کر لینا اُسے منا کر ہی جگتار کے ساتھ جانا۔''

''یہ ہی تو مشکل کام ہے۔ دیکھتا ہوں بے بے سے بات کر کے''

''ویرے تو ہی بے بے سے میری سفارش کر دینا''

''اگر مجھے کبھی بات کرنی ہوگی تو میں اپنے لیے کروں گا تیرے لیے کیوں کروں؟''

''بڑا بھائی نہیں تُو میرا؟''

''چل اچھا سو جا صبح ہوتی ہے تو دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے؟''

جس بات کا اُنہیں ڈر تھا وہی ہوا۔ بے بے کو پتا چلا تو اُس نے سارا گھر سر پر اٹھا لیا۔ وہ کسی بھی قیمت پر راضی نہیں ہوئی۔ نہال بیچ میں پڑا تو بے بے نے رونا شروع کر دیا۔ آنسو اور وہ بھی بے بے کی آنکھوں میں، نہال نے ہتھیار ڈال دئے اور بیسا کھا غصّے سے پیر پٹکتا نکل گیا۔ اُس رات وہ گھر نہیں آیا۔ نہال اُسے تلاش کرتا کرتا جگتار کے اڈے پر جا پہنچا اُسے سمجھا بجھا کر گھر تو لے آیا مگر اُس نے اپنی ضد نہیں چھوڑی اور بدھ کی صبح وہ بیگ لے کر گھر سے نکل گیا۔ بے بے روتی چلاّتی رہ گئی مگر وہ رُکا نہیں۔ تین مہینے اس کی کوئی خیر خبر نہیں آئی اور پھر ایک روز اچانک ایک بنگالی دلہن کو ساتھ لے کر گھر لوٹ آیا۔ آتے ہی بے بے کے قدموں میں گر گیا۔

''بے بے تیری بہو۔ آشیرباد دے دے''

وہ ٹکّی ٹکّی اُس آدھی پسلی کی مریل سی لڑکی جس کے سانولے چہرے پر دو بڑی بڑی کالی آنکھیں خوف اور بے بسی کی دہائی دے رہی تھیں۔ جسے دیکھتے ہی بے بے نے اپنا سر پکڑ لیا اور بے ساختہ منہ سے نکلا:

''وے جیبن جوگیا، اے کیہہ لے آیا اوے؟ نہ منہ نہ متھا جن پہاڑوں لتھا''

''بے بے تیری بہو ہے۔ شادی کرا کے لایا ہوں''

''کتنے میں خریدی''

''بے بے خریدی نہیں۔ غریب باپ کی بیٹی ہے۔ اس کے باپ کی نہیں اپنے سسر کی صرف مدد ہی کی ہے''

''اوئے اسے خریدنا ہی کہتے ہیں اور بکی ہوئی عورت کی کوئی عزت نہیں ہوتی۔ نہ گھر میں نہ سماج میں۔ نہ ہی لوگ اس کی عزت کریں گے اور نہ ہی کل تُو اس کی عزت کرے گا۔''

''بے بے بیوی ہے میری۔ ایسا مت کہہ۔ گھر بسانا ہے مجھے اس کے ساتھ تُو بس آشیرباد دے دے''

''ایک بات تُو میری سُن لے۔ تو نے اپنی مرضی کی، ہماری ایک نہ سُنی۔ تُو اپنی مرضی کا مالک۔ اسے لے کر اپنی الگ سے گھر ہستی بسا لے۔ اب اس گھر میں تیرے لئے کوئی جگہ نہیں۔''

''مگر بے بے میں اسے لے کر جاؤں گا کہاں؟''

''یہ تو تجھے پہلے سوچنا چاہیے تھا۔ تیرے بڑے بڑے خیرخواہ ہیں یہ صلاح بھی دے دیں گے''

اب تک بات سارے گاؤں میں پھیل چکی تھی اور نہال بھی یہ خبر سُن کر گھر کی طرف لپکا۔ اپنے گھر کے باہر لوگوں کو اُچک اُچک کر اندر دیکھتے بھڑک اٹھا۔

''تماشا ہو رہا ہے کوئی؟ بھاگو اپنے اپنے گھروں کو''

اس کی زوردار آواز سن کر لوگ تتر بتر ہو گئے۔

''بے بے یہ کیا کر رہی ہو؟ کیوں تماشا بنا رہی ہو؟ بیاہ کر لایا ہے بھگا کر نہیں لایا۔'' بے بے کے کاندھے پر پیار سے ہاتھ رکھ کر اُسے سمجھانے لگا۔

''مگر دیکھ تو کیا گُل کھلایا ہے اس چندرے نے'' بے بے کی آنکھیں برسنے لگی تھیں۔

''چپ کر بے بے رونا۔ جو ہو گیا سو ہو گیا۔ تو بس ٹھنڈ رکھ۔'' ماں کو سینے سے لگا کر چُپ کرانے لگا۔

بیسا کھا اپنی دلہن کے ساتھ وہیں پریشان کھڑا رہا۔ پمو رسوئی میں کام کرتے کرتے باہر دیکھ رہی تھی۔

''چل اوئے بیسا کھیا لے جا اپنی دلہن کو اندر۔ جا منہ ہاتھ دھو کر کچھ کھا پی لے۔''

یہ سنتے ہی بیسا کھے نے راحت کی سانس لی اور بیوی کو پیچھے آنے کا اشارہ کرتے ہوئے جلدی جلدی کمرے میں چلا گیا۔

''پمو۔ جا کر دیکھ انہیں کیا چاہیے'' بہت کم وہ پمو کو اُس کے نام سے بُلا کر کوئی کام کہتا تھا۔

پمو کو اُس نے کمرے میں اُن کے پیچھے جاتے دیکھا اور خود وہ بے بے کو منانے کی کوشش کرنے لگا۔ بیسا کھے کا اس طرح بنگالی لڑکی بیاہ کر لے آنا اُسے بھی اچھا نہ لگا تھا۔ اُس کا درد، اُس کی محرومیاں، اُس کی خواہش، اُس کی ضرورتیں اُس کی تشنگی کو محسوس کر سکتا تھا۔ وہ بھی تو اسی کشتی کا مسافر تھا فرق صرف اتنا تھا کہ وہ بے بے کو دُکھ دے کر کوئی کام نہیں کرنا چاہتا تھا۔ جی تو اُس کا بھی چاہتا تھا کوئی اُس کی راہ دیکھے اُس کے سب کام کرے، تھک ہار کر جب کھیتوں سے لوٹے تو دو بول پیار کے بولے۔ اُس کے بھی گھر میں بچوں کا شور ہو۔ وہ صرف ٹھنڈی آہ بھر کر رہ گیا۔

بہت جلد آٹھ ایکڑ زمین کے پھر حصّے ہو گئے۔ دو ایکڑے اپنے حصّے کی زمین لے کر بیسا کھا اپنی بیوی کو لے کر الگ گھر بسانے کے لیے دہلیز پار کر گیا۔

زمین اور گھر کے بٹوارے تو سب نے دیکھے مگر بے بے کے دل کے کتنے ٹکڑے ہوئے، کتنے ارمان سسک سسک کر ٹوٹے، یہ کسی کو دکھائی نہیں دیا۔ اسے جسمانی تکلیف کوئی نہیں تھی بس موہ کا روگ لگ گیا۔ بیٹوں کا موہ دیمک کی طرح اُسے اندر سے کھوکھلا کرتا رہا۔ اپنے سب سے فرمانبردار لاڈلے بیٹے کے گھر نہ بسا سکنے کی ناکامیابی اُسے تڑپاتی رہی اور ایک روز یہ ارمان لئے وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئی۔

بے بے کے گزر جانے کے بعد مکھن اور پمو اُس کا پورا خیال رکھتے۔ مکھن کھیتوں پر اُس کے ساتھ کام کرتا۔ منڈی بھی ایک ساتھ جاتے اور کوشش کرتا کہ وہ کہیں دوستوں کے ساتھ رُک نہ جائے، سیدھے اس کے ساتھ ہی گھر چلے۔ پمو بھی اُس کی ہر ضرورت کا خیال رکھتی۔ وقت پر کھانا دینا، اس کے کپڑے دھونا، اس کا بستر چھت پر لگانا، سب وہ بِنا کہے ہی کرتی۔ پھر بھی نہال کو وہ اپنا گھر نہیں لگتا تھا وہ اسے پمو کا گھر کہنے لگا تھا۔ بے بے کے جاتے ہی اُس کے سر کا پلو بھی ڈھلک گیا تھا۔ اپنے گھر کا احساس شاید بے بے اپنے ساتھ ہی لے گئی تھی۔ روڑا تو اپنی زمین بیچ کر نہ جانے کہاں نکل چکا تھا۔ بیسا کھا اپنی بنگالن کے ساتھ خوش تھا بس وہ ہی تنہا رہ گیا تھا۔ اُسے چرن سنگھ کی بات بار بار یاد آ رہی تھی۔ سُنتے ہی جس بات کو اس نے انکار دیا تھا، اب وہ ہی بات اُسے بھلی لگنے لگی تھی۔ وہ سوچنے لگا کب تک وہ ایسے ہی بے مقصد زندگی جیتا رہے گا؟ کب تک وہ چوروں کی طرح نتھنی والی کے پاس اپنی ضرورتیں پوری کرنے جاتا رہے گا؟ اُسے بھی کوئی اپنا چاہیے۔ بیسا کھا بھی تو خوش ہے، لوگ ایک دن باتیں کریں گے، دو دن کریں گے، پھر خاموش ہو جائیں گے۔ بچے کالے پیلے پیدا ہو بھی گئے تو کیا؟ ہونگے تو اُسی کے۔ جب یہ ہی بات بیسا کھے نے اُس سے کہی تھی تو وہ کیسے کھلکھلا کر ہنستا تھا۔ اب وہ بھی تھک گیا ہے۔

رات صحن میں تخت پر بیٹھے دونوں بھائی کھانا کھا رہے تھے اور پمو رسوئی سے ایک ایک کر کے گرم گرم روٹی اُن کو پروس رہی تھی۔ نہال نے باتوں باتوں میں چرن سنگھ کا ذکر چھیڑ دیا۔

''مکھن یار چرن سنگھ بڑا زور ڈال رہا ہے ساتھ چلنے کو''

''کیا؟''

''کہہ رہا ہے کچھ دنوں کے لیے اُس کے ساتھ بہار چلوں''

''بہار؟ وہاں کیا ہے؟''

''اس کے کچھ رشتے دار رہتے ہیں۔ اُن کی بہت جان پہچان ہے۔ ہو سکتا ہے کوئی لڑکی پسند آ جائے۔''

''ویرے تو بھی۔۔۔؟'' اُس نے حیرت سے بھائی کو دیکھا۔

''کیا کروں یار؟ میری بھی تو کچھ ضرورتیں ہیں کچھ ارمان ہیں۔ اب اکیلے زندگی نہیں کٹتی۔ پنجاب کی زمین تو ہمارے لیے بنجر ہو گئی۔'' اُس کی آواز میں مایوسی اور بیزاری نمایاں تھی۔ پمو کے ہاتھ روٹی سیکتے رُک گئے۔ اُس نے کان اُن کی باتوں کی طرف لگا دئے۔

اس رات نہ جانے کیوں پرموچین سے سو نہیں سکی۔ بے بے کی باتیں اُسے رہ رہ کر ستانے لگیں۔ اس نے تو وعدہ کیا تھا بے بے سے کہ وہ اس کی ہر ضرورت کا خیال رکھے گی، اُسے کوئی تکلیف نہیں ہونے دے گی۔ ساتھ سویا مکھن سنگھ خراٹے بھرتا رہا اور وہ کروٹیں بدلتی رہی۔

پتا نہیں وہ زمین کے ایک اور بٹوارے، گھر کے بٹوارے، اپنی حکومت کے بٹوارے یا پھر مرد کے بٹوارے، نہ جانے کس کے خوف نے اس کے اندر کی سوئی ہوئی دروپدی کو بیدار کر دیا۔ وہ سوچنے لگی کہ اگر کل کی طرح اس نے دوبارہ اس کی کلائی پکڑ لی تو وہ اُسے چھڑوائے گی نہیں اور نہ ہی بھگوان کرشن کو اپنی مدد کے لیے پکارے گی۔ اسے تو اپنے فرائض پورے کرنے ہیں، اسے تو بے بے سے کیا ہوا وعدہ پورا کرنا ہے۔

☆

ڈرامہ

قبضہ

ڈاکٹر رینو بہل

سین(۱)

مقام

(پنجاب کے پرانے شہر کے محلے میں بنا ایک مکان)

کردار

(پون، ونیتا اور بوڑھی مکان مالکن)

(دسمبر کی سرد رات اور گیارہ بجے کا وقت کنڈی کھڑکتی ہے)

ونیتا: سُنو باہر کوئی دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے (شوہر کو جھنجھوڑ کر اٹھاتی ہے)

پون: سو جاؤ چُپ چاپ کوئی نہیں ہے۔ (کروٹ بدل کر سو جاتا ہے)

دروزاہ پھر کھڑکتا ہے۔ پون رضائی سے نکل کر بتی جلاتا ہے۔

پون: اتنی رات کو کون ہو سکتا ہے؟ (بُڑبڑاتا ہے)

(ونیتا بھی اُٹھ کر بیٹھ جاتی ہے)

پون: (دروازہ کھولتا ہے) مائی آپ اس وقت اور اکیلے؟ (آنکھیں ملتا ہے)

مائی: اب اندر آنے بھی دے گا یا باہر کھڑے کھڑے باتیں کرے گا۔

(پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ مائی ڈیوڑھی پار کر کے آنگن سے ہوتی ہوئی کمرے میں داخل ہو جاتی ہے)

سین(۲)

مقام

(مائی کا کمرا)

کردار

(مائی پون اور ونیتا)

ونیتا: پرنام مائی (پاؤں چھوتی ہے) آپ اس وقت اکیلے کیسے آ گئیں؟

مائی: سدا سہاگن رہو (سر پر ہاتھ پھیرتی ہے)

بھلا اس وقت کیا ہوا ہے؟ اپنے گھر تو میں کسی بھی وقت آ سکتی ہوں اور پھر مجھ اکیلی کا کیا ہے؟ ساری عمر اکیلی ہی تو رہی ہوں۔ (بستر پر آرام سے بیٹھ جاتی ہے)

ونیتا: آپ تو غصّہ کر گئیں۔ میں تو صرف یہ کہہ رہی تھی کہ اتنی سردی میں اتنا لمبا سفر اور وہ بھی اکیلے جبکہ آپ کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں رہتی۔

مائی: میں نے سُنا ہے تم نے جو مکان بنانا شروع کیا تھا وہ مکمل ہو گیا ہے اور تم لوگ بہت جلد وہاں جا رہے ہو۔ میں نے سوچا میں بھی تمہارا گھر دیکھ آؤں۔

(دونوں ایک دوسرے کا چہرا دیکھنے لگے۔ رنگ اڑ گئے)

پون: تم کھڑی کھڑی باتیں ہی کرتی رہو گی یا کچھ چائے پانی بھی لاؤ گی۔ دیکھ نہیں رہی مائی کتنی تھک گئی ہیں۔

ونیتا: اوہو! مائی کے آنے کی خوشی میں باؤلی ہو گئی (سر پر ہاتھ مارتی ہے) ابھی لائی۔

(کمرے سے نکلنے لگی)

مائی: رہنے دے بہو۔ مجھے ابھی کچھ نہیں چاہیے۔ میں کھا پی کے آئی ہوں۔ تو اِدھر آ میرے پاس آ کر بیٹھ (اشارے سے اپنے پاس بلاتی ہے)۔

ونیتا: ایک کپ گرم گرم چائے پی لیتیں۔ (مائی کی ٹانگیں دبانے لگتی ہے)

مائی: میرا اپنا گھر ہے جب جی میں آئے گا کھا لوں گی تو فکر مت کر۔ میری بات سُن۔ بڑی قسمت سے اپنی چھت نصیب ہوتی ہے۔ مجھے خوشی ہے تم اب اپنے مکان میں جاؤ گے۔ کب لے جائے گا مجھے اپنا نیا گھر دکھانے؟

پون: آپ کہیں گی تو صبح ہی لے جاؤں گا۔ رات کافی ہو گئی ہے اب آپ آرام کریں۔

مائی: ٹھیک ہے صبح بات کرتے ہیں۔ بتی بجھاتے جانا۔

(رضائی اوڑھ کر لیٹ جاتی ہے)

(پون بتی بجھانے لگتا ہے)

مائی: بیٹا کمرے میں میرا سامان نظر نہیں آ رہا؟

پون: وہ کمرے کی صفائی کروائی تھی (ہکلاتا ہے) دوسرے کمرے میں رکھا ہے سارا سامان۔

مائی: اچھا اچھا۔ بتی بجھا دے۔

(بتی بجھا کر وہ باہر نکل جاتا ہے)

سین(۳)

مقام

(بیڈ روم)

کردار

(پون اور ونیتا)

پون: کس نے خبر دی بڑھیا کو کہ مکان تیار ہو گیا ہے؟

(غصّے سے تکیہ اٹھا کر پٹکتا ہے)

ونیتا: مجھے کیا معلوم؟ مجھ سے کیا پوچھ رہے ہو۔ مجھے تو چنتا لگی ہے کہ اب

کیا ہوگا؟ (بستر پر بیٹھ جاتی ہے)

پون: سب سے پہلے تو اٹھ کر اس کا سامان جو باہر پھینکا ہے اس کو دوسرے کمرے میں رکھ لو۔ اگر اُس نے سامان اس طرح باہر پڑا ہوا دیکھ لیا تو مصیبت ہو جائے گی۔

ونیتا: آپ شانتی رکھوا بھی بڑھیا سو جائے تو سامان مِل کر اندر رکھ دیتے ہیں۔

(دونوں کے چہروں پر فکر کی لکیریں نظر آ رہی ہیں)

ونیتا: آپ نے ایک بات پر غور کیا؟ (قریب کھسک آتی ہے)

پون: کیا؟

ونیتا: بڑھیا تو اور تندرست ہو گئی ہے۔ ایسا لگتا ہے وہ دس سال پہلے والی مائی ہو۔ کتنا نور ہے چہرے پر۔ چال میں بھی پھرتی ہے۔ پچھلی بار جب آئی تھی تو کیسے رُک رُک کر چلتی تھی لمبے لمبے سانس لیتی تھی اور کمزور اتنی کہ اب گئی کہ گئی۔

پون: وہ حالت دیکھ کر ہی تو سوچا تھا کہ بڑھیا تھوڑے دن کی مہمان ہے۔ اپنا مکان تیار کر کے کرایہ پر دے دوں گا اور یہ مکان ہمیشہ کے لیے اپنے قبضے میں لے لیں گے۔ پچھلے دس سال سے اس مکان کی حفاظت کر رہے ہیں۔ ہمارا بھی تو حق ہے اس پر۔

ونیتا: اجی کیوں نہیں بنتا ہمارا حق؟ آپ نے جو اتنے سال مہندر کی طرح ان کا خیال رکھا، اُس کا کیا؟ خود تو دلی جا بسا اور بڑھیا یہیں چھوڑ گیا۔ اس وقت اُن کے اکیلے پن کو ہم نے ہی دُور کیا، کبھی الگ سے کھانا نہیں پکانے دیا، گھر کے بزرگ سی عزت دی اب دیکھو مکان خالی کروانا چاہتی ہے۔ بھلا ایسے کیسے چھوڑ دیں یہ مکان؟

پون: اگر اُس وقت یہ مکان کسی غیر کے حوالے کر کے جاتے تو میں دیکھتا کس طرح یہ مکان خالی کرواتے۔ (غصّے سے)

ونیتا: غصے سے نہیں صبر اور عقل سے کام لینا ہوگا۔

پون: ہوں! ٹھیک کہتی ہو تم۔

ونیتا: بڑھیا کو مکان دکھانے لے کر جاؤ گے؟

پون: ٹالنے کی کوشش کروں گا۔

ونیتا: اتنی آسانی سے پیچھا چھوڑنے والی نہیں ہے۔

پون: جانتا ہوں۔ پھر بھی کوئی نہ کوئی راستہ نکالنا ہی پڑے گا۔ چلو اُٹھو سامان اندر رکھ دیتے ہیں۔ صبح کوئی اور ہنگامہ نہ ہو جائے۔

ونیتا: چلیں۔ بڑھیا کو بھی ابھی آنا تھا۔ (غصّے سے بستر سے اترتی ہے)

(دونوں اُٹھ کر کمرے سے چلے جاتے ہیں)

سین (۴)

مقام

(گھر کا آنگن۔ صبح کا وقت)

کردار

(ونیتا اور مائی)

(ہلکی ہلکی دھوپ آنگن میں بکھری ہوئی ہے۔ تخت بچھا ہے اور مائی بیٹھی ہے)

ونیتا: آپ صبح صبح ہی تیار ہو گئیں۔ پانی گرم کیا تھا یا نہیں؟

مائی: گرم کی کیا ضرورت ہے۔ بس جیسا تھا اُس سے نہا لیا۔

ونیتا: مائی سردی بہت ہے اور آپ بھی کمال کرتی ہیں۔ اتنی بھی کیا جلدی تھی نہانے کی، میں اٹھ کہ پانی گرم کر ہی دیتی۔

مائی: تو فکر نہ کر مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ پون اُٹھا کہ نہیں؟

ونیتا: ابھی سو رہے ہیں۔ ویسے آپ صبح صبح کہاں جانے کو تیار ہوئی ہیں؟

مائی: میں نے کہاں جانا ہے؟ تمہارا گھر دیکھنے ہی تو جانا ہے۔ پون کتنے بجے اُٹھ جائے گا؟

ونیتا: ابھی تھوڑی دیر میں اُٹھ جائیں گے۔ میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔

(رسوئی میں چلی جاتی ہے اور مائی آلتی پالتی مار کر آنکھیں مُوند کر پوجا کی مُدرا میں بیٹھ جاتی ہے)

سین (۵)

مقام

(بیڈ روم)

کردار

(پون اور ونیتا)

ونیتا: اُٹھو چائے لے لو (رضائی ہٹا کر ہلاتی ہے)

پون: رکھ دو پی لوں گا (رضائی پھر اوپر لے لیتا ہے)

ونیتا: باہر بڑھیا تیار ہو کر بیٹھی ہے آپ کا انتظار کر رہی ہے اور آپ لحاف اوڑھے چین سے سو رہے ہو۔ (چائے Side Table پر رکھ دیتی ہے)

پون: اُف! یہ صبح صبح کیا مجبوری ہے (اُٹھ کر بیٹھ جاتا ہے)

ونیتا: لو پکڑو (چائے کا کپ تھماتے ہوئے)

پون: (چائے کی چُسکی لیتے ہوئے) پلیز تم باہر جا کر کہہ دو میری طبیعت خراب ہے میں سو رہا ہوں۔

ونیتا: کتنے دن خراب طبیعت کا بہانہ کرو گے؟ مجھے نہیں لگتا بڑھیا کو ٹال سکو گے۔

پون: آج کا دن تو ٹالو پھر کوشش کرتا ہوں مہندر سے بات کرنے کی۔

(وہ کمرے سے نکل جاتی ہے اور پون چائے پی کر دوبارہ رضائی میں گھس جاتا ہے)

سین (۶)

مقام

(گھر کا آنگن)

کردار

(مائی اور ونیتا)

مائی: بہو پون اُٹھا کہ نہیں؟

ونیتا: مائی طبیعت ٹھیک نہیں اُن کی۔ دوائی دے کر آئی ہوں۔ تھوڑی دیر میں اُٹھ جائیں گے۔

مائی: کوئی بات نہیں تھوڑا آرام کرے گا تو ٹھیک ہو جائے گا۔ لا ادھر میں بیٹھے بیٹھے کاٹ دیتی ہوں (دونوں مل کر سرسوں کا ساگ کاٹنے لگتی ہیں)

مائی: تو جانتی ہے نا بہو کہ جب ۱۹۴۷ء میں بچتے بچاتے تین تین بچوں کو ساتھ لے کر یہاں پہنچی تو اُس وقت میری عمر شاید تیس کے قریب ہوگی۔

(ساگ کی گندل صاف کر کے اُسے پکڑاتی ہے)

ملک کے بٹوارے میں میرا سب کچھ کھو گیا۔ فسادیوں نے مجھے بیوہ اور میرے چھوٹے چھوٹے بچوں کو یتیم کر دیا۔ (بہتی آنکھوں کو اپنے سفید دوپٹے سے صاف کرتی ہے)

لاہور کی محل جیسی بھری پوری حویلی چھوڑ کر جب یہاں آئے تو سرکار نے یہ مکان دیا۔ ٹوٹا پھوٹا۔ مجبوری تھی کیا کرتے۔ اس وقت اس مکان نے میرے بچوں کو باپ کی طرح سایہ دیا، انہیں سمٹ لیا۔ پھر دھیرے دھیرے اس پر پیسہ لگا کر اتنا بڑا کیا۔ تُو تو جانتی ہی ہے مجھے اس مکان سے کتنا لگاؤ ہے۔

ونیتا: مائی یہ بات میں ہی نہیں ساری دُنیا جانتی ہے۔

(ساگ کاٹتے کاٹتے جواب دیا)

مائی: مگر یہ مکان مجھے مہندر سے بڑھ کر نہیں۔

اُسے کاروبار میں اتنا نقصان ہوا ہے کہ مجھ سے اس کی، اُس کے بچوں کی تکلیف دیکھی نہیں جاتی۔ میں تو اتنے دن صرف اس لیے چپ تھی کہ تمہارا بھی مکان بن جائے۔ ایک بیٹے کی تکلیف دُور کرنے کے لیے دوسرے کو تو مشکل میں نہیں ڈال سکتی تھی۔ پون بھی تو میرا ہی بیٹا ہے۔ مہندر کے ساتھ ہی اُس کا بچپن گزرا ہے۔ ہے تو اُس کا جگری دوست مگر مہندر اُسے بھائی سے کم نہیں سمجھتا۔

ونیتا: لو مائی۔ باتوں باتوں میں ساگ بھی کٹ گیا۔

آپ ہاتھ دھو لیں میں ساگ کو چولہے پر چڑھا کر آئی۔

(ساگ اٹھا کر رسوئی میں چلی جاتی ہے اور مائی آنگن میں لگے نلکے پر ہاتھ دھونے لگتی ہے)

سین (۷)

مقام

(پون کا بیڈ روم)

کردار

(پون اور ونیتا)

ونیتا: آج کا دن تو بیماری کا بہانہ کر کے ٹال دیا مگر یہ چلے گا نہیں۔ مجھے تو ڈر ہے کہ محلے میں اگر مائی کے آنے کی کسی کو بھنک بھی پڑ گئی تو وہی لوگ منہ اُٹھا کر ملنے چلے آئیں گے اور اُس وقت اُن کی زبان پر کوئی روک نہیں لگا سکے گا۔

پون: مہندر سے فون پر بات کرنے کی کوشش تو کی تھی مگر نہ جانے کیوں نمبر لگ نہیں رہے۔

ونیتا: پھر اب کیا کریں گے؟

پون: میرا ایک جانکار ہے وہاں، اُسے فون کیا ہے وہ صبح ہی جائے گا مہندر کے گھر۔

ونیتا: وہ تو ٹھیک ہے مگر تب تک کیسے روکو گے مائی کو؟

پون: سوچتا ہوں صبح لے ہی جاؤں۔

ونیتا: اور مکان دیکھتے ہی وہ ہمیں یہ مکان خالی کرنے کو کہہ دینگی پھر؟ پھر کیا کرو گے؟

پون: میں کئے کرائے پر پانی نہیں پھرنے دوں گا۔ اتنی جلدی ہار ماننا میں نے بھی نہیں سیکھا۔ تم فکر نہ کرو سوچتے ہیں کیا کرنا ہے۔

(دونوں دماغ کے گھوڑے دوڑانے لگے)

سین (۸)

مقام

(نئے علاقے میں بنا پون کا نیا گھر)

کردار

(پون اور مائی)

مائی: پون تُو اسے مکان کہتا ہے؟ تُو تو کہتا تھا چھوٹا سا مکان ہے۔ یہ تو اچھا خاصا مکان ہے۔ (حیرت سے دیکھتی ہے) بہت خوبصورت مکان بنایا ہے تو نے۔

پون: یہ سب آپ کا آشیرواد ہے مائی۔

(سارا گھر گھوم گھام کر دیکھ رہی ہے)

مائی: اتنے بڑے گھر میں اپنی مائی کے لیے بھی کوئی کمرا بنایا ہے یا نہیں؟

پون: کیسی باتیں کرتی ہیں مائی؟ سارا گھر آپ ہی کا ہے جہاں چاہیں رہیں۔

(پوجا والے کمرے میں رُک جاتی ہے)

مائی: یہ تُو نے بڑا اچھا کیا جو پوجا کے لیے الگ سے کمرا بنا دیا۔ نند گوپال کی مورتی تو اس جگہ رکھنا (اشارے سے جگہ بتاتی ہے) گھر میں مندر بنا کر تُو نے خوش کر دیا۔

پون: مائی آپ خوش تو سمجھیں میرا رب خوش۔

مائی: یہ کمرا تو بہت شاندار ہے۔ بالکل مندر کے ساتھ۔ یہ ٹھیک رہے گا۔ بیٹا یہ کمرہ تو تُو مجھے دے دے۔ یہ کمرا سمجھ لے میرا ہوا۔

پون: آپ ہی کا ہے مائی (ماتھے سے پسینہ صاف کرتے ہوئے)
(زمین پر ہی آلتی پالتی مار کر بیٹھ جاتی ہے)

مائی: جا بیٹا جا کر میرا سامان یہیں لے آ۔ میرا تو یہاں سے جانے کو دل نہیں کر رہا۔

پون: (گھبرا کر) مائی ابھی مکان میں پوجا کرائیں گے پھر سامان لائیں گے۔

مائی: پوجا تو رہنے کے لیے کروانی ہے۔ رہوں گی تو میں بعد میں ابھی تو میرا سامان لے آ۔ وہ سامان جو تم لوگوں نے میرے کمرے سے اُٹھا کر باہر پھینک دیا ہے۔ جا بیٹا لے آ۔

پون: جی۔۔۔جی۔۔۔ابھی لایا۔

(گھبراتا ہوا چہرے کو رومال سے صاف کرتا وہاں سے نکل جاتا ہے)

سین(۹)

مقام
(مائی کا گھر)
کردار
(پون اور ونیتا)

ونیتا: کیا ہوا؟ اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟ مائی کو کہاں چھوڑ آئے؟

پون: بڑھیا بڑی شاطر ہے۔ کہتی ہے وہ سامان جو تم لوگوں نے میرے کمرے سے اُٹھا کر باہر پھینکا ہے اُسے لے آ۔

(جلدی جلدی کمرے میں جاتا ہے)

ونیتا: مگر اُسے یہ سب بتایا کس نے؟

پون: مجھے نہیں معلوم۔ تم جلدی سے کچھ سامان مجھے دے دو۔ وہیں بیٹھی انتظار کر رہی ہے۔

ونیتا: کیا کہہ رہے ہو؟ دماغ تو ٹھیک ہے نہ؟ ابھی تو ہم نے ''گرہ پرویش'' کی پوجا بھی نہیں کی اور میں اُس کا سامان دے دوں؟

پون: (مائی کا ٹرنک اُٹھاتے ہوئے) کیا کروں اس مصیبت سے چھٹکارا بھی تو کروانا ہے۔ تم فکر نہ کرو۔ سامان کمرے میں رکھ کر اُسے اطمینان ہو جائے گا اور اُس کے جاتے ہی میں اسے باہر پھینکوا دوں گا۔ (کمرے سے نکلتا ہے)

ونیتا: (پیچھے پیچھے آتی ہے) مجھے سمجھ نہیں آتا اُسے سامان وہاں رکھنا کیوں ہے؟

پون: پوجا والے کمرے کے ساتھ والا کمرا کہتی ہے میرا ہے۔

ونیتا: کیا؟ دماغ خراب تو نہیں ہو گیا بڑھیا کا؟

پون: وقت نہیں ہے میرے پاس تمہاری فضول باتوں کا۔ ہٹو پیچھے جانے دو مجھے۔ بڑھیا کو واپس بھی لانا ہے۔

(ٹرنک اٹھا کر بُڑبڑاتا ہوا گھر سے نکل جاتا ہے)

سین(۱۰)

مقام
(نیا گھر)
کردار
(پون اور مائی)

پون: لو مائی اپنا سامان سنبھالو۔ (ٹرنک مائی کے پاس زمین پر رکھتے ہوئے)

مائی: یہ کیا؟ صرف یہ چھوٹا والا ٹرنک ہی لایا ہے؟ باقی سامان؟

پون: مائی باقی کا سامان ہمارے سامان کے ساتھ آ جائے گا۔ آپ بے فکر رہیں۔

مائی: تو سچ کہہ رہا ہے نا؟

پون: آپ تسلی رکھیئے مائی۔ آپ کا سامان ہمارے سامان کے ساتھ ہی آئے گا۔

مائی: چل یہ ٹھیک ہے۔ اب یہ کمرہ میرا ہوا۔ اب اس میں سے سامان مت نکالنا نہیں تو میں تالا لگا دوں گی۔

پون: کیسی باتیں کرتی ہیں آپ؟ بھلا آپ کا سامان کیوں نکالوں گا۔ آپ کا اپنا گھر ہے۔ چلئے اٹھیے گھر چلتے ہیں۔

(ایک نظر کمرے کو دیکھتی ہے اور اس کے پیچھے نکل جاتی ہے)

سین(۱۱)

مقام
(مائی کا گھر)
کردار
(پون، مہندر اور ونیتا)

پون: یار بہت اچھا کیا جو تو چلا آیا (اُسے دیکھ کر راحت محسوس ہوتی ہے)

مہندر: مگر بات کیا ہے؟ تو نے اس طرح جلدی کیوں بلایا ہے؟ سب ٹھیک ہے نا؟

پون: ویسے تو سب ٹھیک ہے بس مائی کی خراب طبیعت دیکھ کر ہم گھبرا گئے۔

مہندر: مائی کی خراب طبیعت؟

ونیتا: جس روز سے آئی ہیں طبیعت خراب چل رہی ہے۔

مہندر: کیا کہہ رہا ہے؟ کیا مائی یہاں آئی ہیں؟

ونیتا: آپ کو بتا کر نہیں آئیں؟ دیکھا میں تو پہلے ہی کہتی تھی مہندر بھائی صاحب مائی کو اکیلے نہیں بھیج سکتے۔

مہندر: مگر مائی ہیں کہاں؟

پون: اپنے کمرے میں؟

مہندر: چلواُن کے پاس چلتے ہیں

(سبھی مائی کے کمرے کی طرف بڑھ جاتے ہیں)

سین(۱۲)

مقام

(مائی کا گھر)

کردار

(پون،مہندراورونیتا)

مہندر: کدھر ہے مائی؟ یہاں تو کوئی نہیں۔

ونیتا: ارے ابھی تو یہیں تھیں۔

مہندر: مگر کمرے میں تو کوئی بھی نہیں۔

پون: یار ابھی کچھ دیر پہلے تو یہیں تھیں نہ جانے کہاں چلی گئیں؟ دیکھ بستر بھی کہہ رہا ہے کہ کوئی ابھی ابھی اٹھا ہے۔

(دونوں پریشان ہیں)

مہندر: کس دن آئی تھیں وہ یہاں؟

پون: سوموار کو۔

مہندر: سوموار کو؟

پون: ہاں سوموار رات گیارہ بجے کے قریب آئی تھیں۔

(مہندر سر پکڑ کر وہیں بیٹھ جاتا ہے)

ونیتا: کیا ہوا بھائی صاحب؟

مہندر: کیا کہوں اب۔سوموار کو جب صبح کسی نے فون پر یہ بتایا کہ تم لوگوں نے اس مکان پر قبضہ کرنے کے لیے اُن کا سامان اُٹھا کر باہر پھینک دیا ہے تو اُن کو زبردست دل کا دورہ پڑا۔

ونیتا: کیا؟ دل کا دورہ؟

مہندر: ہاں! اُنہیں شاید سُن کر بے حد تکلیف ہوئی تھی۔ایک ہی بات اُن کی زبان سے نکلی ''وہ ایسا نہیں کر سکتے۔میں ایسا نہیں ہونے دوں گی'' اور وہ ہمیں ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر چلی گئیں۔

(مہندر بچوں کی طرح رونے لگا اور اُن دونوں کے چہرے زرد پڑ گئے۔آنکھیں پھٹی پھٹی مہندر کو دیکھتی رہیں)

تناظر۳......(گجرات)

۔ کتابی سلسلہ ۔

کتاب ناشناسی کے اس دور میں کتاب یا کتابی سلسلے کا اجرا و اشاعت علمی و ادبی حلقوں کے لیے بڑی خبر سے کم نہیں۔تناظر کا زیرِ نظر شمارہ بے پناہ علمی، ادبی اور سماجی امکانات لیے ہوئے ہے۔سماجی علوم کے مطالعے کے عنوان سے چارلیز ڈارون کا مذہب، ہندوستان کو ایک نئے دھرم کی ضرورت، انسانیت نواز ریڈیکل ازم، اشتراکیت اور صوفی ازم کے اشتراکات، ترقی پسندی، لیفٹ اور ہم عالمی ادب کے عنوان سے ایلس منرو: ایک تعارف، وین لاک ایج، اس کے علاوہ مضامین، افسانے، مطالعہ خالد فتح محمد، مطالعہ شائستہ فاخری، مضامین، غزلیں، آرٹ، کتاب گھر، آپ کے خیال میں، خطوط کے علاوہ خصوصی مطالعہ: میلان کنڈیرا کی نسبت خالد جاوید، نجم الدین احمد اور ڈاکٹر ارشد وحید کے مقالہ جات، نئی سوچ، فکر اور معلومات کے خزینے سے پُر ہے۔

تناظر کی زیرِ نظر اشاعت قریب آٹھ سو صفحات پر محیط ہے جس کی قیمت پانچ سو روپے۔

۔ رابطہ ۔

ایم خالد فیاض معرفت آئیڈیل بک سنٹر، ڈاکٹر سرور والی گلی، ریلوے روڈ، گجرات۔

''عمراں دی تھکان''

۔ گورمکھی سے ترجمہ ۔

ڈاکٹر رینو بہل

سارے سازاں سنگ
سُراں وچ ولیٹ
دُدھ دے پہلے ٹیپے لئی
تیریاں فُل پتیاں ورگیاں
کومل بُلیاں نوں
کلیجے نال لا
کوج کوج، سانبھ سانبھ رکھی
جوآنی دادرشن کرایا
امرت چکھایا

اُس توں پچھوں
جد دھرتی تے کھلو
توں امبر ول بانہاں پساریاں
تاں پہلی بار
وِنگی ٹیڈھی چال نال
بھج کے میرے تک آؤندا
ہس ہس رالاں بھرے منہ نال
میرا منہ چُمدا
ٹھنڈیاں پاؤندا
تے
میں نہال ہو جاندی۔۔۔

پر
ہُن توں جوان ہو گیاں
میرے پُتر
توں اوپرا جیہا میرے کول

پُتر

تارن گجرال
(چنڈی گڑھ، بھارت)

جدوں توں بیج بن
پہلی بار
میرے ڈھڈ دی جھیل اندر
نماں نماں دھڑکیا
کدی گیت تے کدی لوری گا
پلوس پلوس اپنی آندر نال
میں تیرا نالو، آبنھیاں
توں مینوں گھٹ کے جھپی پائی
تے میں
وسماد ہنڈایا

ایہہ جگ وکھاؤن لئی
میں تینوں پوترمہاں دروازے دا
راہ وکھایا
اپنے لہو وِچ نُہا
پہلا پوتر اشنان کرایا
اپنیاں اکھاں تے روح دے

آ ؤندا ایں
تے میرے پیریں ہتھ لا
پرے ہو۔۔۔بیہہ جاندا ایں
میں تاں اینے ورے
تینوں پوٹا پوٹا ودھدا ایکر دا
ویکھدی رہی ساں
کہ بھر جوان ہو، توں مینوں
اپنی بھی وِچ اینا ں گھٹیں، انج گھٹیں
کہ میری عمراں دی تھکان لیہہ جاوے
تے کئی جنماں تک ٹھنڈ پے جاوے

پر
ہُن ایہہ تیریاں اکھیاں
میرے تے کی سوال کر دِیاں نیں
میرے ول اوپرا جیہا جھانک
کس اوپرے پن دی شاہدی بھر دیاں نے
میں تاں ہُن جین پنڈھ تے
تھکّے پیریں تُر دی
جیرے سانبھدی سبھ لئی دُعاواں کر دی
تیرے توں بس اینا ہی تاں
منگدی ہاں
آ تے مینوں صرف
ٹھنڈی پا جا۔۔۔

پر
ہُن توں مینو ٹھنڈ نہیں پا ؤندا
توں جوان ہو گیا ایں
توں وڈا ہو گیا ایں

پر
توں کیوں اِنج ہو گیا ایں۔۔۔؟

☆

لائف سٹائل

ڈاکٹر ونیتا
(دہلی، بھارت)

بے بے نوں ملدا اسی جد مہینا
سدھا آپ جاندی جاں
بھیجدی لمی لِسٹ پنساری نوں
منگوا ؤندی راشن ٹبّر لئی
صابن، تیل، دالاں۔آٹے، چول۔کھنڈ
پیہندی گرم مسالے گھر ہی
ور تیندا کُھلا، دُودھ گھیو
بنا ؤندی کھوآ ؤندی بیہہ انگھیٹی اگے
سارے ٹبّر نوں، آئے گئے نوں
بھاویں ہُندی گئی مہنگائی
پاندی چیں۔چیہاڑا
کر دی سیاپا مہنگای دا

پر
کسے بٹوے، صندوق، پٹاری
جاں ٹرنک کسے الماری
دی نوکروں۔کھونجیوں
کڈھ ہی لیندی جوڑے
لُکا ئیے۔بچا ئیے
پیسے راشن چوں

''چہار سُو''

کجھ بھان بُگنیاں چوں کُج نوٹ
تے بنوالیندی کسے دن تیوہار
جاکے کسے سنیار پاس
کوئی گہنا۔ گٹا
کوئی چھاپ۔ چھلا
جاں جاکے بجاج پاس
ٹبّر لئی سوہنیاں پوشاکاں
جاں کوئی جوڑا اچدّر، کھیس کمبل
گھر لئی، رسوئی لئی
کوئی بھانڈہ۔ ٹینڈا
کڑاہی۔ پتیلا

ہُن ہوگئی اے بے بے بڈھی
نظر بھی ہوگئی اے کمزور
تاں آکھدی نوہاں دِھیاں نوں
سامبھو گھر نوں بی بی او، رہو ہوشیار
کنستر نہ ہووے خالی نی اڑیو
رکھنا آئے گئے دا وی خیال
ہُن
کڑیاں بناؤندیاں نے لمبی چوڑی لسٹ
پہلاں پڑھدیاں نے اخباراں
فلائرز اشتہار تے
کدے کردیاں نے فون تے آڈر
ہُندیاں نے تیار
پھڑدیاں نے کار
جاندیاں نے مال
لے آؤندیاں نے کار وِچ لدّ کے
کاردی ڈگی توں باہلا سمان
بارن ویٹا/ مالٹووا
سکم سوپ/ ٹوتھ پیسٹ
دالاں، چول، آٹا، کھنڈ
سکیم پیکٹ، پروٹین پیکٹ
لوفیٹ، ٹوپلس ون فری
تھک جاندیاں نے سمان اکٹھا کردیاں
جاں گڈی وِچ رکھواؤندیاں ہی
کی بناؤن گیاں کھانا گھر جاکے
لے ہی آؤندیاں نے گھر والیاں لئی
ریڈی میڈ فوڈ
کھا ہی آؤندیاں نے
پیزا، برگر، چائنیز فوڈ
گھر جا ڈھیندیاں نے صوفے تے دھڑم
پیندیاں نے آکے، ٹک دی لیاندی
کولڈ ٹی ود آئیس
تے لگاؤندیاں نے حساب اج دے راشن دا
دسدیاں نے حساب آکے بے بے نوں
بے بے خرچہ سُن غش کھاندی ہے،
جدوں اکھیاں نے بے بے نوں
بے بے! نہیں بچے رات دی روٹی لئی پیسے
اسیں تاں ختم کرآئیاں ہُنے ہی
ساڈے کول تاں بچے نہیں سن
پٹرول جوگے وی پیسے
پوایا ہے کریڈیٹ کارڈ تے ہی اسیں
مار گئی اے بے بے سانوں
ایہہ لک توڑویں مہنگائی

☆

جیون ٹیچا

مہندر رشم
(چندی گڑھ، بھارت)

میتھوں آس نہ کریں بابلا
کہ میں تیری بے زبان دھی بن
تیری کھوکھلی عزتاں دی
بیدی تے شہید ہوواں گی
میں تیری عزت کراں گی

پر
اپنے سنہرے بھوِ کھلئی
تیرے کسے پگے رواج
تے اوپرے نک نال سمجھوتا نہیں کراں گی۔

میں جاتی، برادری دے
تنگ بندھن توڑ
گنڈاسیاں دامنہ کھنڈا کراں گی
میں تیری سیوا کراں گی
پُتاں وانگ تیرے نال کھڑاں گی

پر
میتھوں ایہہ آس نہ کریں
کہ میں تیری بے زبان۔۔۔

میتھوں ایہہ آس نہ کریں ویرنا
کہ رکھڑی دے اوہلے
میں تیرے کو جھے غصّے دی بھینٹ چڑھاں گی۔

میں تیرا موہ پالاں گی
پر، اپنی جیون لوچا
تیرے متھے دِیاں تیوڑیاں
تے گز دے بولاں توں قربان نہیں کراں گی
بھیناں۔ پرایاں دے ارتھ بدلاں گی
لوڑ ویلے تیری بانہہ بناں گی

پر
میتھوں ایہہ آس نہ کریں
کہ میں تیری ہرایں۔۔۔

میتھوں ایہہ آس نہ کریں چیرے والیا
کہ میں ہتھ بنہیں غلام
ریشم چہ لپٹی تیرے پچھے پچھے تُراں گی۔
میں تینوں مان دیواں گی
پر، جیون ڈھنگ، جیون مقصد دے
سارے حق اپنے کول رکھاں گی۔
موڈھے نال موڈھا لا
تیرا بھار ونڈاں گی
تیرا گھر سانبھاں گی
ہر قدم برابر دھراں گی

پر
میتھوں ایہہ آس نہ کریں
کہ میں تیرے پچھے۔۔۔
میں جس تان نال جیواں گی
اُسے مان نال موت نوں ملاں گی
میں اپنے راہ آپ چناں گی
اپنا جیون ٹیچا آپ متھاں گی

☆

نہیں پروان

سکھوندرامرت
(لدھیانہ، بھارت)

نہیں پروان
کہ رُکمنی بن کے
رادھا تے کرشن دِی محبت دیاں
کنسو آں سُناں
تے عمر بھر تکھدی رہاں

نہیں پروان
کہ یشودھرا بن کے
بچھوڑے دا سل جراں

شکنتلا بن
اُڈیک دی سولی تے چڑھاں
تے اِک مندری کھنوں
بے۔ پہچان ہو جاوے
میرا اوہ چہرہ
جس نوں اوہ آکھدا سی
''ایہہ میرا ہے، صرف میرا
کہ اس چہرے نوں تاں میں
گھپ ہنیر وِچ بھی پہچان سکدا ہاں
اس چندنوں تاں میں ہزاراں چنداں چوں وی سیان سکدا ہاں''

میں تاں چوہندی ہاں
سوہنی وانگ
تیرے عشق داڈونگھا جھناں تراں
جاں
سُندراں وانگ
تیری جدائی وچ
محلاں توں ڈِگ مراں
جاں ہیر ہوواں
تے جھوٹی موٹھی داسپ لڑا
کھیڑیاں نوں دیہو وانگ چڑھاں
تیری جوگن بن کے
تیرے نال نال ہوتُراں

رکمنی
یشودھرا
تے
شکنتلا بن کے جیون نالوں
چنگا ہے
سوہنی
سُندراں
تے
ہیر بن کے مرجانا

فریبی
رِیتاں رسماں تے قِلیاں نوں
سر کرنا
تے آزاد ہوا وانگ
گزر جانا

☆

''آئینہ بادِ بہاری''

فاری شا

(اسلام آباد)

ڈاکٹر رینو بہل کی کہانیوں میں جہاں خاتونِ مشرق اپنے مکمل آدرش پیکر اور مثالی کردار کے ساتھ جلوہ گر نظر آتی ہے وہاں آج کی تعلیم یافتہ عورت فرسودہ روایات، جاہلانہ ڈھکوسلوں اور بنیاد پرستانہ سماجی عقائد کے بتوں کو توڑنے کی جدو جہد میں بھی تیز گام ہے۔ صنفِ نازک کا ازل سے ہوتا آیا استحصال، زر پرست نظام میں اُس کی امنگوں اور آرزوؤں سے کھلواڑ، اور اُس کے ردّعمل میں وقت اور ماحول کے نئے تقاضوں کو خوش آمدید کہتی ہندوستانی عورت اُن کے افسانوں کے مرکزی کردار کے روپ میں نمایاں ہوتی ہے، جو وقت اور ماحول کے زائیدہ نئے مسائل ومحرکات کی بھی پہچان سے لیس ہے۔

رینو دورِ حاضر کے سماجی مسائل اور معاشرتی واردات وحقائق کے حوالے سے اپنی کہانیوں کا تانا بانا تعمیر کرتی ہیں۔ ان کی کہانیاں ہماری عوامی زندگی سے گہرا رشتہ رکھتی ہیں۔ سماج کے درماندہ اور پچھڑے ہوئے طبقات کے حقوق اور فلاح واصلاح کے تئیں اُن کے سروکار بھی اُن کی کہانیوں میں اُبھر کر سامنے آتے ہیں۔ ان افسانوں میں خیر وشر کی معرکہ آرائی بھی ہے اور اُس کے مثبت نتائج بھی قاری کو ایک خوشگوار تاثر سے ہمکنار کرتے ہیں۔ یہ کہانیاں روشنی کے کئی اندر دھنشی دائرے تخلیق کرتی ہیں۔ رینو کے افسانوں کی شائستہ اور محتاط رومانویت، گہرا سماجی شعور اور ان کا تعمیری اور سبق آموز کلائمکس، ایک سنجیدہ فنکار کے ہم پہلو انہیں ایک ذمہ دار شہری کا اسناد بھی دیتا ہے۔

شباب للت

عورت صرف عورت نہیں ماں، بیوی، بہن اور بیٹی بھی ہوتی ہے۔ ڈاکٹر رینو بہل نے عورت ذات کے ہر روپ، ہر رنگ اور رشتے کی ترجمانی اپنے افسانوں میں کی ہے جن سے ان کے مشاہدے کی گہرائی اور وسعت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ہر افسانہ اپنے خاتمے پر قاری کو کچھ نہ کچھ سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ یہی ایک اچھے افسانے کی دلیل ہے کہ وہ پڑھنے والے کو اپنے ساتھ ہی بہالے جائے۔ یہ جادو رینو بہل کے قلم میں موجود ہے۔ خدا کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

کرشن پرویز

میں نے آج تک رینو بہل جیسی باصلاحیت، باوفا، باہنر لڑکی نہیں دیکھی زندگی کے تمام روّیوں سے لے کر ادب تک جس روش اور چلن کی بنا رینو بہل نے ڈالی ہے اُس کی مثال تلاش کرنا ہی کارِ دارد ہے۔ رینو بہل نے قلم کو تفریح، شغل یا وقت گزاری کے لیے نہیں تھاما بلکہ معاشرے میں پلتے ناسوروں اور ناہمواری کی نشانی کے لیے اُٹھایا ہے۔ اب تک رینو بہل کے چھ افسانوی مجموعے منظرِ عام پر آئے ہیں کسی ایک بھی مجموعے، افسانے یا مکالمے میں آپ کو سولیدہ فکری کا شائبہ تک نظر نہ آئے گا۔ رینو کی ہر تحریر اپنے سماج اور دکھی انسانیت کی آواز بن کر معاشرے کے سدھار کا کام بھی انجام دے رہی ہے اور قاری کے ذوق کی تہذیب بھی عمدگی سے کر رہی ہے۔

ڈاکٹر یوگیندر بہل تشنہ

اردو افسانے کی صنف اگرچہ بہت پرانی نہیں ہوئی ہے لیکن آج کا افسانہ سماجی، سیاسی، نفسیاتی، تاریخی، تہذیبی اور تکنیکی صورت حال کا براہِ راست یا علامتی طور پر ترجمان رہا ہے، اس ضمن میں ڈاکٹر رینو بہل کا نام ان افسانہ نگاروں میں لیا گیا ہے جنہوں نے افسانے کے فارم، تکنیک کے کئی نکات اور افسانے کے تشکیلی عناصر کی واضح نشاندہی کی ہے اور سماج کے کھوکھلے پن اور ان ناسوروں کی عکاسی کی ہے جو بظاہر نظر نہیں آئے۔

ان افسانوں میں اظہار اور افکار کی روشنی میں گھر کی سالمیت، ازدواجی رشتوں کی حفاظت اور ان رشتوں سے پھوٹتی کونپلوں سے انسیت اور انسیت سے وقت، شعور اور مٹی کا مطالع ڈاکٹر رینو بہل کی فکری ترجیحات میں شامل ہیں۔ انہوں نے گھر اور گھر کے ہی جھروکے سے گھر سے باہر کی دنیا کو اپنی کہانیوں میں الگ الگ انداز سے دیکھا اور سماجی حقوق اور صلاحیتوں کا جائزہ استعمال کر کے عورت کو علامتی روپ اور انفرادی حیثیت میں اس کے کردار کو اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے۔ افسانہ ''بدلی میں چھپا چاند'' کے تجزیاتی مطالعہ کی روشنی میں ان کے اسلوب اور ہیئت کی جھلک کچھ یوں نمودار ہوتی ہے۔ ''سبھی رشتے دار ماں کی موت کی خبر سن کر ماتم پرسی کے لیے آئے ہوئے تھے۔ ان سب میں بیٹھ کر وہ ماضی کی کھرونچوں کو مٹا دینا چاہتا تھا مگر رہ رہ کر یہ بات اسے پریشان کر رہی تھی کہ جو بات اس سے ماں بیٹے نے چھپا کر رکھی تھی وہ ماں نے جاتے جاتے شبنم کو بتا دی۔ اس کی زندگی میں ایک اور طوفان کیوں کھڑا کر دیا؟''

وہ باتیں جو کبھی باسی نہیں ہوسکتیں وہ عبارتیں جو فکر کی گہرائیوں میں اُتر کر ایک سوال کھڑا کرتی ہیں۔۔۔ وہ ڈاکٹر رینو بہل کی ذہنی اور تخلیقی پختگی کے ثبوت کے طور پر قاری کے سامنے آتی ہیں۔

اشرف وارثی

رینو بہل کے افسانوں میں مرد کرداروں کے ساتھ ہر طرح کے نسوانی کردار ہیں۔ وہ ماں بھی ہے، بہن بھی ہے، بیٹی بھی ہے، بہو بھی ہے، بیوی بھی ہے، معشوقہ بھی ہے، لیکن ہر کردار ایک خوبصورت جمالیاتی دائرے میں ہے۔ ان کے یہاں پدری نظام معاشرہ نہ تو ان نسوانی کرداروں کے سینوں پر ترشول ہے، نہ اس نظام پدری کی گونج ان کے یہاں زندہ باد مردہ باد کے نعروں کی شکل اختیار کرتا ہے۔ وہ اس کھوئے ہوئے جڑ کی تلاش کرتی نظر آتی ہیں

جہاں عورت اور مرد باہمی اعتماد و یقین کی ڈور سے بندھے منزلوں کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔

وہ رشتوں کے ٹوٹنے بکھرنے کی کہانی بیان کرتی ہیں۔لیکن اخلاقی قدروں کو پھلانگ کر آسمان پر پرچم نصب نہیں کرتی نظر آتی ہیں۔ان کے یہاں عورت آج بھی ماں ہے جو اپنے جگر پارے کے دور ہونے کی بات سوچ کر امتزاج سے کہانیاں بنیں ہیں۔مکالمے فطری ہیں جن سے محسوس ہوتا ہے کہ بیان کردہ درد وتعب، رنج وعلم مصنفہ کے اپنے دکھ ہیں۔گرچہ یہ اس نئے وسعت پاتے معاشرے کا دکھ ہے جس میں ہمارا آج سانسیں لے رہا ہے۔

انور شمیم

میری نظر میں رینو کو جو کچھ ملا وہ ریاضت کا ثمرہ ہے۔ان کے افسانوں میں تجربہ زندگی ہے۔محض تخیلاتی منڈیر پر آ کر ڈیرہ نہیں جماتیں بلکہ آج کی جیتی جاگتی زندگی کی ہولناکیوں کی سچی تصویر کو سماج ومعاشرے کے بیچ لا کر رکھ دیتی ہیں۔مصنفہ نے اپنی سچی محنت، لگن، دھن سے کہانی لکھنے کی راہ نکالی ہے اور زندگی سے کہانیوں میں فن کو تلاش کیا ہے۔رینو کے یہاں خاموش ادبی سفر کی چاپ دور تک سنائی دیتی ہے۔رینو حقیقتوں سے نظریں نہیں چراتی ہیں کیونکہ وہ جانتی ہیں کہ عملی زندگی بے عملی کی زندگی سے ٹکراتی ہے تو احساسِ مایوسی خود اپنی موت مر جاتا ہے۔دراصل ان کے افسانے انہی قدروں کو پورا کرتے ہیں جن میں افسانہ پن بھی ہوتا ہے اور بیانیہ بھی۔منظر نگاری، المیہ نگاری، کرداری نگاری اور مکالموں وغیرہ سے تو یہ افسانے اپنا امتیاز رکھتے ہیں۔اشاریت اور ابہام سے بھی ان افسانوں کا دور کا واسطہ نہیں۔اس طرح ان کے افسانوں میں زیرِ سطح وہی فکری تلاش اور نگہداری کی رمزیت موجود ہے جو زمانے کی شکایت اور زندگی سے بیزاری کی علامتیں تو بتاتی ہیں مگر فن کار حالات کے سینے پر یقین محکم وعمل پیہم سے صدائے احتجاج بلند کرتا ہے۔یہاں ''خاموش صدائیں'' میں بے دردلمحات، خشک چہروں پر سمٹے آنسو اور جلتی دھوپ میں اپنے جوگی کا انتظار ہے جو ایک ماں کا بیٹا ہے تو کسی محبوبہ کا قرار ہے جو کہ خاموش رشتوں میں بندھے ہوئے ہیں۔

ایم۔اے رحمان

پچھلے دو دہاکوں میں جو نئی خواتین فنِ افسانہ کے افق پر جلوہ افروز ہوئی ہیں اُن میں محترمہ ذکیہ مشہدی، ثروت خان، غزال ضیغم، ترنم ریاض، سطوت زہرہ، زینت کیفی، تسنیم فاطمہ اور فرخندہ ضمیر پیش پیش ہیں۔پچھلے ایک دھاکے سے ڈاکٹر رینو بہل، ڈاکٹر نصرت چودھری، نگہت فاروق اور سعیدہ نسرین نقاش کے علاوہ درجنوں نئی افسانہ نگار خواتین اپنے فن کا مظاہرہ کرتی آ رہی ہیں۔اور ان تمام کا محور قریب قریب عورت کے تقدس استحصال اس کی بے حرمتی اور اس کے ساتھ ناروا سلوک ہی کی داستان ہے۔

سرِ دست راقم کے زیرِ مطالعہ ڈاکٹر رینو بہل جو کہ سرزمین پنجاب میں چھ اگست ۱۹۵۸ء کو پیدا ہوئی ہیں کا افسانوی مجموعہ بعنوان ''آنکھوں سے دل تک'' زیرِ تبصرہ ہے۔یہ مجموعہ اٹھارہ مختلف افسانوی عنوانات پہ محیط ہے۔اس افسانوی مجموعے کا دیباچہ ملک کے نامور محقق، دانشور اور محبِ اردو جناب اقبال انصاری نے قلمبند کیا ہے۔رینو بہل چونکہ خود بھی ایک صنفِ نازک ہیں اور عوت ہونے کے ناطے عورت ذات کی فطری علامتوں سے بخوبی باور بھی ہیں۔علاوہ اس کے جذبۂ ایثار، تقدس، شرافت اور قربانیوں کے ساتھ ساتھ عورت کے درجات جو کبھی بہ یک وقت ماں، بہن، محبوبہ، بیوی کی صورت میں اجاگر ہوتے ہیں کو بھی خوب تر محسوس کرتی ہیں۔

عشاق کشتواڑی

ڈاکٹر رینو بہل کی تحریر میں پختگی ہے اور زبان وبیان پر بھی انہیں عبور حاصل ہے۔ان کے افسانے نئے سماجی تقاضوں کے آئینہ دار ہیں۔ان کے کردار صرف محبت کی نکھری ہوئی چاندنی میں نہیں جیتے بلکہ اُن کے دلوں میں نفرت، خلوص وایثار بھی پایا جاتا ہے۔ان کے نسوانی کردار بہت متاثر کرتے ہیں جو محبت کی روشن شمعیں تھامے زندگی کے تقاضوں کو پورا کرتے نظر آتے ہیں۔سبھی کردار درمیانے طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں اور عصری حسیّت کے آئینہ دار ہیں۔یہ سچ ہے کہ کوئی بھی فن کسی شخص کی جاگیر نہیں ہوتا۔ڈاکٹر رینو بہل کے افسانوں میں زندگی ہنستی بھی ہے، روتی بھی ہے، بلکتی اور سسکتی بھی ہے۔وہ صرف رومانی افسانے لکھنے میں دلچسپی نہیں لیتیں۔زندگی کے تلخ وشیریں حقائق پر اُن کی گہری نظر ہے اور اسی گہری نظر کی بدولت ہی اُنہیں منفرد افسانہ نگار کا مقام ومرتبہ حاصل ہوا ہے۔

مضطر انصاری

ڈاکٹر رینو بہل پنجاب کی وہ واحد خاتون افسانہ نگار ہیں جو بہت ہی کم عرصہ میں صنفِ افسانہ کے آسمان پر بڑی آب وتاب کے ساتھ جلوہ گر ہوئی ہیں۔ٹمٹمانے سے چمکنے تک کا سفر گویا انہوں نے پلوں میں ہی طے کر لیا ہے، جبکہ اس کے لیے مدتیں گذر جاتیں ہیں۔یہ ان کی برق رفتاری، بلندیٔ پرواز، جہد البقا، عملِ پیہم اور یقینِ کامل ہی ہے جو انہیں اتنی جلدی ایک خاص مقام تک لے گیا ہے۔اردو کے بیشتر اخبارات ورسائل میں جہاں اقبال انصاری اور دیپک بدکی کے اسمائے گرامی افسانوی حصے میں اکثر دکھائی دیتے ہیں وہیں ڈاکٹر رینو بہل بھی ساتھ ساتھ کھڑی نظر آتی ہیں۔یہ اہلِ پنجاب کی خوش بختی نہیں تو اور کیا ہے کہ ایک خاتون نے افسانہ نگاری میں اپنے فنی جواہر دکھا کر پورے افسانوی ادب میں اپنی ناقابلِ فراموش حاضری لگوائی ہے۔

ڈاکٹر رینو بہل نے نہ صرف عورتوں کی قربانیوں اور ذمے داریوں کو اپنے کرداروں میں سمویا ہے بلکہ مردوں کی اچھائیاں بھی ان کی عقابی نظروں سے دور نہیں رہتیں۔افسانہ ''اعتراف'' میں شام کا کردار مصنفہ کی زبانی سنیے:

''گھر میں واحد مرد ہونے کی وجہ سے اور بھائی بہنوں میں اس وقت سب سے بڑا ہونے کی وجہ سے ساری ذمے داری مجھ پر آن پڑی۔مجھ پر عورتوں کی ذمہ داری

کا بوجھ اتنا تھا کہ جوانی کا رنگ مجھ پر چڑھ نہ سکا۔ دوسرے لڑکوں کی طرح نہ میں کہیں آنکھ لڑا سکا اور نہ باپ کے مال پر عیش کر سکا۔ میری جوانی تو جوان ہوتی ہوئی بہنوں کو سنبھالنے میں گزر گئی''

اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ رینو بہل متوازن اور معتدل سوچ کی مالک ہیں جو جانب داری سے کام نہیں لیتیں اور یہی ایک سچے فنکار کا وصف نمایاں ہے۔ علاوہ ازیں ان کے دیگر افسانے ''کوکھ جلی''، ''سراب''، ''چٹکی بھر سندور'' اور ''مرنے کی دعائیں کیوں مانگوں'' بھی خاص اہمیت کے حامل ہیں۔

ڈاکٹر انوار احمد انصاری

رینو بہل کی کہانیاں افسانے چیدہ چیدہ مختلف کتابوں میں پڑھ چکا ہوں ان کی کہانیوں کا پلاٹ، موضوع صرف تخیل نہیں ہوتا سچائیوں پر مبنی ہوتا ہے اردگرد کے ماحول سے لیتی ہیں۔ عام زندگی اور عام کردار ہوتے ہیں۔ ان کی یہ ہی خوبی سب سے منفرد اور اچھوتا پن پیش کرتی ہے۔ اسی لیے ان کے قلم کی جولانیاں ہر کس و ناکس کو پسند آتی ہیں۔ ہر بات دل کو چھوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

حفیظ انجم کریم نگری

اسے ڈاکٹر رینو بہل کے قلم کا اعجاز کہنا ہی درست ہوگا کہ برسوں کے بعد بھی یہ اتفاق ہوا ہے کہ ان کے افسانوی مجموعے ''خاموش صدائیں'' میں مشتمل بیس کہانیاں میں نے ایک ہی طویل نشست میں پڑھ لی ہیں۔ ڈاکٹر صاحبہ کی زبان سادہ شگفتہ برجستہ اور رواں دواں ہے۔ ان کے افسانوں میں باقاعدہ آغاز انجام پلاٹ کہانی اور کلائمکس کا اہتمام موجود ہے۔ ان کے یہاں مشاہدات و تجربات کی کوئی کمی نہیں ہے کہانیوں کے لیے خام مواد وہ اپنے اطراف و اکناف کے ماحول سے اٹھاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کردار ہمارے آس پاس کے جیتے جاگتے روتے گاتے حقیقی کردار معلوم ہوتے ہیں۔ جو قاری کو اپنے دکھ درد میں شریک کر لیتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحبہ کثیر الجہات موضوعات کی افسانہ نگار ہیں۔ انہوں نے جہاں بیٹا بیٹی کی تفریق کو افسانوں کا موضوع بنایا ہے وہیں انہوں نے کاروباری خواتین کو بھی اولیت دی ہے۔ میرے خیال میں مشرقی پنجاب کی یہ واحد خاتون افسانہ نگار بہت جلد دنیائے اردو کو جگمگ کرنے والی ہیں۔

رفیق شاہین

ڈاکٹر رینو بہل نے اپنے افسانوں میں محبت کے مختلف زاویے اور رشتوں کی اہمیت کو ابھارا ہے ان کی تخلیقات میں ذاتی طور پر عورت کی عظمت نمایاں ہے۔ عورتوں پر ہونے والی زیادتیاں اور رشتوں کی پامالی کی فکر کی ہے۔ محترمہ بہل آج کے دور کے تازہ اور جلتے ہوئے موضوعات مثلاً دہشت گردی لال نیتا شاہی، سیاسی غنڈہ گردی اور کرپشن سے ہٹ کر لکھ رہی ہیں۔ انسانی رشتوں اور سماج کی بے راہ روی کے موضوعات کو اپناتی ہیں۔ ایسا نہیں کہ عورت ہو کر انہوں نے صرف مردوں کو ہی غلط ٹھہرایا ہے بلکہ یہ بتانے کی جرأت بھی کی ہے کہ کچھ کم عقل اور پھوہڑ قسم کی عورتیں بھی مردوں کا جینا حرام کر دیتی ہیں۔ ان کے افسانوں میں ان کے مشاہدات بولتے ہیں۔ محترمہ بہل بہت ہی حساس فن کارہ ہیں جو بہت جلد دوسروں کے دل کا درد اپنے اندر محسوس کرنے لگتی ہیں اور تخلیقی عمل کے ذریعہ اپنے جذبات کو کاغذ پر پھیلانے کا ہنر جانتی ہیں۔ سرزمین پنجاب کی یہ اکلوتی خاتون افسانہ نگار ہیں ہماری محترمہ بہل سے بہت ہی امیدیں وابستہ ہیں۔ جہاں تک میں نے ان کے فن کو پرکھا ہے ان میں بہت آگے بڑھنے کی صلاحیتیں موجود ہیں۔

محمد بشیر مالیر کوٹلی

میں آپ کا زیادہ وقت نہ لیتے ہوئے صرف رینو کی چند کہانیوں کا ذکر کروں گا جنہیں پڑھنے والوں نے سراہا اور پسند کیا۔ ''خوشبو میرے آنگن کی'' ایک ایسی کہانی ہے جس میں ماں کے جذبات کی بہت خوبصورت عکاسی کی گئی ہے اور بیٹی کی اس کی زندگی میں کیا اہمیت ہے بتایا گیا ہے۔ یہ کہانی عورت پر کئے جانے والے جبر و تشدد کے خلاف آواز ہے۔ ''سانجھ ڈھلے'' آج کے دور کا منظر نامہ پیش کرتی ہے جہاں ماں باپ اپنی ساری زندگی بچوں کی خوشی کے لیے وقف کر دیتے ہیں اور بڑھاپے میں بچے انہیں تنہا چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ ''شکستِ آرزو'' میں ایک چھوٹی سی نادانی ہنستے کھیلتے خاندان کو ختم کر دیتی ہے۔ یہ افسانہ Aids کے خلاف آواز ہے جس کا اختصار یہ ہے کہ کنڈلی ملانے سے ضروری ہے میڈیکل رپورٹ دیکھنا۔ ''وقت کی انگڑائی'' ایک رومانی کہانی ہے۔ ترقی پسند لڑکا پیسے کی خاطر رشتے توڑ دیتا ہے مگر پیسہ کمانے کے بعد اُسے رشتوں کی گرماہٹ کی کمی محسوس ہوتی ہے اور اس وقت اسے احساس ہوتا ہے اس نے کیا کھویا کیا پایا۔ ''کسی کو کیا ملا'' ایک عام آدمی کی جدوجہد کی کہانی ہے۔ مہنگائی کے زمانے میں وہ بچوں کو دو وقت کی روٹی بھی مشکل سے کھلا پاتا ہے اور دوسری طرف ایک امیر گھر میں کتّا انسان سے بہتر زندگی گزار رہا ہے۔ یہ ہمارے سماج پر گہرا طنز ہے۔ رینو بہل کی کہانیوں پر علیحدہ علیحدہ رائے نہ دیتے ہوئے اگر مجموعی طور پر کچھ کہا جائے تو میں کہوں گا کہ رینو کو کہانیوں کی تکنیک اور کہانی کے شعور سے گہری واقفیت ہے۔ انہیں معلوم ہے کہ کہانی میں پلاٹ اور کردار سازی کے علاوہ زبان اور اسلوب کی بھی اہمیت ہے۔

یہی وجہ ہے کہ رینو کی کہانیوں کی زبان بہت سادہ ہوتی ہے اور ان کے کردار عام زندگی سے اخذ کئے گئے ہوتے ہیں۔ معاشرے میں پھیلے انتشار پر ان کی عمیق نظر ہے جسے وہ اپنی کہانیوں کا موضوع نہایت چابکدستی سے بناتی ہیں جب کسی فنکار کے یہاں یہ لوازمات در آتے ہیں تو پھر اس کی تخلیقانہ صلاحیت میں آفاقیت جاگزیں ہو جاتی ہے جو اسے اپنے ہم عصر فنکاروں سے ممیّز و ممتاز کرتی ہے۔ اب میں مزید کچھ نہ کہتے ہوئے آپ کو دعوت دیتا ہوں کہ آپ یہ کہانیاں از خود ملاحظہ فرمائیں اور پھر اپنی ایماندارانہ رائے کا تعین کریں۔ مجھے یقین ہے یہ آپ کے دل کو کہیں نہ کہیں ضرور چھوئیں گیں۔

کشمیری لال ذاکر

''مائل بہ کرم''

نعتِ رسولِ کریم ﷺ

رہتا ہوں مَیں یہ سوچ کے سرشار شب و روز
مائل بہ کرم مُجھ پہ ہیں سرکار ﷺ شب و روز

وُہ چشمِ کرم ہے مجھے درکار شب و روز
پڑھتا ہوں درود اُن ﷺ پہ لگاتار شب و روز

لے آیا ہوں طیبہ سے جو مَیں دِل میں بسا کر
روشن مجھے رکھتے ہیں وہ انوار شب و روز

جس دِن سے بنا ہے مِرا دِل شہرِ مدینہ
ہے اُن ﷺ کا میسّر مجھے دیدار شب و روز

جو آپ ﷺ نے قائم کیا، نافذ کیا خود پر
ملحوظِ نظر ہے وہی معیار شب و روز

دستارِ فضیلت ہے مجھے اُن ﷺ کی غلامی
رہتا ہے لبوں پر یہی اقرار شب و روز

اُس شہرِ مقدس میں اندھیرا نہیں ہوتا
ہوتا ہے اُجالا ہی نمودار شب و روز

آقا ﷺ کا کرم ہے کہ کسی حال میں مُجھ پر
آنے نہیں دیتے کبھی دُشوار شب و روز

ممکن ہے کہ سرکار بُلا وا ﷺ مجھے بھیجیں
رہتا ہوں سفر کے لئے تیّار شب و روز

راضی وہ ہوئے مجھ سے تو اللہ بھی ہو گا
آقا ﷺ کی رضا ہے مجھے درکار شب و روز

یہ اُن ﷺ کی عنایت ہے نسیم، اُن ﷺ کی عنایت!
ہوتے ہیں جو یوں نعتیہ اشعار شب و روز

نسیمِ سحر
(راولپنڈی)

نعت

کیا برکتیں ہیں ذکرِ رسولِ انام ﷺ کی
محفل سجا کے دیکھو درود و سلام کی

سرکارِ کائنات ﷺ کا ہر لفظ ہر عمل
تفسیرِ معتبر ہے خدا کے کلام کی

یہ کُوئے مصطفیٰ ﷺ ہے یہاں سر کے بل چلو
حامل یہ سر زمیں ہے بہت احترام کی

اے رحمتِ تمام میں تیرا غلام ہوں
خیرات دے مجھے بھی کوئی اپنے نام کی

کافی ہے مجھ کو سایۂ دامانِ مصطفیٰ ﷺ
اک چیز بس یہی تو ہے محشر میں کام کی

ماہرؔ کو بھی حجازِ مقدس بلایئے
آقا ﷺ یہ آرزو ہے تمہارے غلام کی

ماہر اجمیری
(میرپورخاص)

آنگن میں کالی دھوپ

منیرہ احمد شمیم
(اسلام آباد)

گرمیوں کی دم توڑتی خاموش دوپہر میں کسی نے دروازے پر گھنٹی بجائی۔

اس وقت کون ہوسکتا ہے بھری دوپہر میں۔۔۔

گھنٹی دوبارہ بجی۔

کون ہے اس وقت۔ میں نے بے زاری سے پوچھا۔ دروازہ کھولا تو دیکھا۔

ذیشان میرے سامنے کھڑا تھا۔ بے بسی کی تصویر بنا خاموش نگاہوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ برسوں بعد وہ یوں اچانک میرے سامنے آ گیا تھا۔ چند لمحوں کے لیے تو مجھے یوں محسوس ہوا کہ میں ابھی خاک بن کر ہوا میں تحلیل ہو جاؤں گی۔

وہی جان لیوا کالی آنکھیں۔ وہی روح کھینچتی ہوئی نظر۔

ذرا دیر کے لیے میرے اندر خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ میں سب کچھ بھول گئی۔ اُسے دیکھ کر میرے دل میں بہت سی یادآئیں مگر لفظوں میں آواز نہ پیدا ہوئی۔ میرے کانوں میں دل کی دھڑکن نقارہ بن کر گونجنے لگی۔ مجھے یوں لگا جیسے میرا دل ابھی بند ہو جائے گا۔

مجھے یوں دیکھ کر وہ بولا۔

''کیا یہیں کھڑے رہیں گے اندر نہیں بلاؤ گی''

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور اپنی کیفیت پر قابو پا کر حواس درست کرتے ہوئے بولی۔

''کیوں نہیں۔۔۔ آؤ اندر چلیں''

وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے میرے ساتھ ڈرائنگ روم میں چلا آیا اور سگریٹ کا نیا پیکٹ کھول کر ایک سگریٹ سُلگا کر لمبے لمبے کش لیتا ہوا سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا۔

منصور آفس گئے ہوئے تھے گھر میں ملازمہ اور میرے سوا کوئی نہ تھا۔ میں خوف زدہ بھی ہو رہی تھی یہ سوچ کر کہ اگر کوئی رشتہ دار یا ملنے والا آ گیا تو کیا سوچے گا۔

تھوڑا سا وقت اس کے ساتھ گذار لیا تو کونسی قیامت آ جائے گی۔

یہ سوچ کر خود کو تسلی دی اور اس کے قریب پڑی کرسی پر اس طرح بیٹھ گئی جیسے ہزاروں میل کا سفر طے کر کے آئی ہوں۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ بات کہاں سے شروع کروں۔ چائے اس کے سامنے رکھتے ہوئے میں بولی۔

''یوں سگریٹ پی پی کر خود کو کیوں جلا رہے ہو''

''اس لیے کہ۔۔۔ میری محبوبہ نے مجھے دھوکا دیا ہے۔ مجھے اس سے محبت تھی لیکن اب اس سے وابستہ ہر یاد سے نفرت ہے۔''

''کیوں؟''

''اس لیے کہ اس نے میری تمام تر محبتوں کو ٹھکرا کر اپنے باپ کی پسند سے شادی کر لی تھی''

''لیکن یہ شادی ایک مجبوری۔۔۔ ایک سمجھوتا بھی تو ہوسکتا ہے۔''

تمہارا یہ روپ میرے لیے حیران کن ہے۔۔۔ انتہائی حیران کن۔۔۔ تمہیں یاد نہیں ایک دفعہ میں نے کہا تھا اگر ہم بچھڑے گئے تو۔۔۔ میری اس بات پر تم مجھ سے کئی دن ناراض رہیں۔

کیا میں تمہیں یاد نہیں آیا۔۔۔ وہ باتیں جو کبھی تم نے مجھ سے کیں تھیں۔۔۔ وہ پیار۔۔۔ وہ مستقبل کے سپنے۔۔۔ سب بھول گئی ہو تم۔۔۔ کیا تمہیں میری محبت پر یقین نہ تھا۔ یا تم نے دولت کی خاطر منصور سے شادی کر لی۔ شاید اس لیے کہ میری جیب میں اس وقت کوئی سکہ تمہاری قیمت نہ بن سکا۔ لیکن تم نے مجھے ہمیشہ ایک ایسا تاثر دیا جس نے مجھے دھوکے میں رکھا۔ جھوٹ۔ ایک مسلسل جھوٹ۔۔۔ تمہارے اس جھوٹ میں زندہ رہنا کتنا خوبصورت لگتا تھا۔ تمہارا پیار مون سون بارش کا ایک ایسا ریلا تھا جس میں بھیگتا چلا گیا اور بھول گیا کہ پیسہ بھی بڑی چیز ہے۔

گرمیوں کی تپتی دوپہروں میں۔۔۔ سردیوں کی لمبی سرد راتوں میں وہ دن مجھے تنگ کرتے ہیں۔ وہ آرزوؤں میں لپٹی یادیں۔۔۔ وہ خنک صبحیں کیا تمہیں یاد نہیں جب ہم پہروں درختوں کی چھاؤں میں بیٹھے میٹھی میٹھی دھوپ کی ساری مستی اور خمار اپنی رگوں میں اتارے گھنٹوں باتیں کرتے رہتے تھے اور میں تمہاری آغوش میں سر رکھے بہت دُور نکل جایا کرتا تھا۔ سوچتا اس کائنات میں صرف تم ہو۔۔۔ بس اور کچھ نہیں۔۔۔ تم زندگی تھیں اور میں خواب۔۔۔ میری ایک ہی خواہش ہوتی۔۔۔ تمہاری ہر خوشی میری ذات سے وابستہ ہو، تمہارا ہر لمحہ میرے وجود سے آباد ہو۔۔۔ میں خوش تھا۔۔۔ بھول گیا تھا کہ میری یہ خوشی نامکمل بھی ہوسکتی ہے۔ کہاں گئے وہ دن جن کا ہر لمحہ آزاد تھا، جن پر کسی دکھ کا سایہ نہ تھا۔

تم چپ کیوں ہو، اپنے شوہر کی وجہ سے یا میری وجہ سے۔۔۔ یا اس لیے کہ تم اپنے اندر کی عورت کو چپ کروا رہی ہو۔ تمہیں خوف ہے کہ کہیں وہ ایک شوہر کے ہوتے ہوئے کوئی آرزو نہ کر بیٹھے۔

چپ ہو جاؤ۔ سنو گذرا ہوا وقت اپنے انمٹ نقوش چھوڑ جاتا ہے۔

بھول جاؤ اس وقت کو جو ہم نے ایک ساتھ گذارا۔ کیا سمجھتے ہو تمہیں اس طرح دیکھ کر میں پریشان ہو جاؤں گی یا میری راتوں کی نیند اڑ جائے گی۔

مجھے بھول جاؤ۔۔۔ مجھے برا بھلا کہو۔۔۔ اس طرح میرے سامنے آ کر مجھے پریشان مت کرو۔ میرا ایک شوہر ہے جو مجھے بے انتہا چاہتا ہے میں ایک خوشگوار زندگی گزار رہی ہوں۔ مسرتوں اور آسائشوں سے بھرپور۔

''کیوں نہیں تمہارے پاس وہ سب کچھ ہے جس کی ہر عورت کو تمنا ہوتی ہے میں یہاں نہیں آنا چاہتا تھا شاید میں دیکھنا چاہتا تھا کہ تم کتنی خوش ہو۔''

''میں خوش ہوں''

''لیکن تمہارے چہرے پر جو دکھ کی لائنیں نظر آ رہی ہیں کیا اس لیے تم نے منصور سے شادی کی تھی یہی وہ خوشی تھی جس کے لیے تم نے مجھے چھوڑا تھا۔ کیا یہی چاہتی تھیں تم زندگی سے۔۔۔ تم صرف وہ کرتی رہیں جو تمہارے گھر والوں نے کہا۔ لیکن میں جانتا ہوں تمہارا دل کیا مانگتا ہے۔''

''یہاں سے چلے جاؤ تمہاری وجہ سے میرا سکون برباد ہو گیا ہے''

''جسے تم سکون کہہ رہی ہو وہ محض خود فراموشی ہے دھوکا ہے''

تم میری طرف یوں مت دیکھو، مجھے تمہاری یہ آنکھیں کسی صلیب کی مانند لگتی ہیں مجھے لگتا ہے جیسے یہ میرے رگ و پہ میں اتر رہی ہیں ان میں نہ جانے کتنے سوال مچل رہے ہیں آخر تم مجھ سے اور کیا پوچھنا چاہتے ہو۔ پلیز چلے جاؤ میری زندگی سے۔ کیوں یاد دلانے چلے آئے ہو میری پرانی محبت۔ میں نے تو خود کو اچھا خاصا دھوکا دے لیا تھا اپنے جینے کا انداز بدل لیا تھا میں نے یقین کر لیا تھا کہ اب میری زندگی میں کوئی کمزور لمحہ نہیں آئے گا لیکن آج پھر تم۔۔۔

یہ کہتے ہوئے میری آنکھیں بھر آئیں۔ وہ دکھ جو اتنے عرصے سے میرے اندر تھا وہ آنسوؤں کی صورت باہر آ گیا۔ میں نے سقراط کا زہر پی لیا تھا۔ مگر سچ کا زہر نہیں۔ بلکہ جھوٹ اور دنیاداری کا زہر تھا جس کو پی کر آدمی کئی بار مرتا ہے اور جیتا ہے۔ اور پھر اس کرب سے نجات پانے کے لیے وہ خود کو دھوکا دیتا رہتا ہے۔ دکھ تو یہ ہے کہ محبت میں ازل سے رکاوٹیں ہیں۔ اور ان رکاوٹوں کا نام کبھی حادثات لکھ دیا جاتا ہے اور کبھی تقدیر۔۔۔ اور کبھی بے وفائی۔

اپنی سوچوں سے پشیمان ہو کر میں نے فوراً باتوں کا رخ پلٹنا چاہا۔

''اچھا یہ بتاؤ تم نے شادی کیوں نہیں کی ابھی تک''

ایک ہلکی سی آہ بھر کر وہ بولا۔ ''تمہارے خیال میں دوسری دفعہ محبت ہو سکتی ہے۔ دل ساتھ نہ ہو تو شادی کا فائدہ؟ کاش تم سمجھ سکو کہ مرد اپنی تمام تر بے وفائیوں کے باوجود کوئی ایسا قدم نہیں اٹھاتا جس سے اس کا پہلا بت ٹوٹ جائے کیونکہ جس بت کو اس نے اپنے دل کے کونے میں چھپا کر بٹھایا ہوتا ہے وہ اسے بھلا نہیں پاتا۔''

''تم یہ بات بھول کیوں نہیں جاتے۔ تمہیں معلوم ہے میری شادی ہو چکی ہے۔''

''لیکن میں نے تم سے کچھ نہیں مانگا''

''میں جانتی ہوں، لیکن تمہیں دیکھ کر حوصلہ ہار دیتی ہوں۔ میری محبت اب برف کی مانند سرد ہے جس میں مجبوریاں اور اندیشے ہیں۔ پرانی محبت کی زنجیریں ٹوٹنے اور نئی محبت کی قید میں کچھ صاف دیکھائی نہیں دیتا۔ یہ ایک ایسا بے اطمینانی کا درد ہوتا ہے جس میں کبھی پچھلی محبت سے بندھے رہنے کی خواہش ہوتی ہے اور کبھی اس محبت سے چھوٹ جانے کی ایک ہلکی سی امید۔۔۔ اور یہ جنگ اندر جاری رہتی ہے۔''

میرے پاس سوائے اس کیفیت کے جو میرے دل کے اندر تھی بتانے کو کچھ نہ تھا۔ اور اس کے پاس سوائے وسوسوں کے کوئی ثبوت میری بے وفائی کا موجود نہ تھا مجھے خاموش دیکھ کر وہ بولا:

''اگر تمہیں اب بھی کوئی اپنانا چاہے تو۔''

''لیکن میں ایسا نہیں چاہتی''

''کیوں''

''اس لیے کہ عورت شادی کے بعد اپنی پہلی محبت کا کفن اوڑھ کر ساری زندگی آنے والی محبت کو روک دیتی ہے اور اب میرا سب کچھ بدل گیا ہے۔ زندگی آگے کی طرف سفر کر رہی ہے۔''

میں جانتا ہوں تمہاری خوشی کسی اور سے وابستہ ہے اور اب میری زندگی میں کوئی اور لڑکی نہیں آئے گی۔ وہ لوگ جو چاہے جانے کی آرزو میں ساری زندگی جلتے رہتے ہیں ضروری نہیں کہ انہیں زندگی کے ریگستان میں آبِ حیات ملے۔ ایسے میں سوچتا ہوں کیوں نہ تمہاری زندگی سے نکل جاؤں۔

لیکن کیا میں تمہیں بھول پاؤں گا۔

میں کچھ کہہ نہیں سکتی۔

یہ میرا سچ ہے۔

کیونکہ میری روح میں تمہاری محبت کا کرب، میرے خوابوں میں تمہارا چہرہ اور جاگتے میں تمہارا غم، مجھے چین نہیں لینے دیتا۔ یہ دن بھی گہری اندھیری رات میں بدل جائے گا اور میں بے بس مجبور اپنے آپ کو کسی اور بہانے زندہ رکھنے کی کوشش کروں گا۔ لیکن زندہ رکھنے کی کوشش کا نام زندگی تو نہیں۔۔۔

اتنے برس گذر جانے کے بعد۔

اتنا کچھ پا لینے کے باوجود۔۔۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے زندگی ایک بہت بڑا قبرستان ہے جس میں، میں تنہا کھڑا اپنی محبت کا سوگ منا رہا ہوں۔

میں نے اس کی طرف دیکھا وہ شدید دکھ میں تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ مجھ سے کم اور خود سے زیادہ مخاطب ہو۔ پھر وہ بولتے بولتے یک دم چپ ہو گیا جیسے کچھ سوچ رہا ہو۔

لیکن ان لمحوں میں اس نے مجھ سے ہر سکھ چین چھین لیا تھا۔

پھر وہ اچانک بولا۔

''کیا آج کے بعد ہم مل پائیں گے؟''

نہیں۔۔۔ جب ہم بچھڑ گئے ہیں تو ایک نظر کی آس کیوں؟ تم کیوں چاہتے ہو میری محبت کی بدنامی۔ میں نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

''نہیں میں ایسا کبھی نہیں چاہتا۔ تم ہمیشہ میرے دل میں رہو گی۔ میں آئندہ تمہاری زندگی میں آنے کی کوشش نہیں کروں گا''

یہ کہتے ہوئے وہ اٹھا، گولڈ لیف کی مہک نے دم توڑ دیا۔ چائے کی ادھوری پیالی چھوڑ کر وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔

میرا دل چاہا میں اُسے روک لوں۔

مگر میں رکی رہی۔

وہ چلا گیا۔

میں لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے باہر آئی اور دریچے میں کھڑی اجڑے لان کو دیکھنے لگی۔ پھول ٹہنیوں پر یوں لٹک رہے تھے جیسے پلکوں میں آنسو۔۔۔ پتا نہیں کیوں آنسوؤں ستاروں کی صورت ٹوٹ ٹوٹ کر میری گالوں پر گرنے لگے۔

وہ پھر مجھ سے بچھڑ گیا تھا۔

بظاہر مجھے کوئی دکھ نہیں۔۔۔ کوئی غم نہیں۔۔۔ پھر کیوں میری آنکھوں میں یہ دھواں سا چھانے لگا ہے۔ وہ شخص جسے میں بھول جانا چاہتی تھی، جسے میں یاد نہیں رکھنا چاہتی تھی، کیونکہ معاشرہ مجھ سے یہ حق چھین چکا تھا۔ لیکن آج اس کی قربت کے چند لمحوں نے ماضی کے بند دریچوں کو پھر سے کھول دیا تھا۔

دوپہر ویران اور ایک دم بیوہ کی طرح لٹی لٹی سے محسوس ہو رہی تھی۔ دیوار سے ٹیک لگائے۔۔۔ دماغ میں گھومنے والی۔۔۔ ابھرتی، ڈوبتی یادوں کو پکڑنا چاہا تو ایسے میں۔۔۔ ماضی کے بے خواب دریچوں سے ایک کرن نے جھانکا۔

ذیشان کہہ رہا تھا۔

رابی! ''میں کبھی سوچتا ہوں اگر محبت کا وجود نہ ہوتا تو محبت کے بغیر یہ زندگی کتنی بے معنی اور پھیکی سی لگتی''

''ایسی بھی کوئی بات نہیں۔ ہر ایک کا اپنا اپنا نقطہ نظر ہے۔ میرے نزدیک ابدی مسرت اور محبت اس کیفیت کا نام ہے۔'' ہوا کے ایک تیز جھونکے نے ایک دم سارا منظر بدل دیا۔

تپتی دوپہر آہستہ آہستہ شام کے سائیوں میں ڈھلنے لگی تھی۔ میرا جی چاہا کہ تمام عمر اس دیوار کے سہارے کھڑی رہوں۔ وقت کا بہتا جھرنا یہیں تھم جائے اور کبھی شام نہ ہو۔ پھر جانے کب شام ہوئی اور دھوپ دھیرے دھیرے سرکنے لگی۔ درختوں کے سائے لمبے ہونے لگے تھے۔

مجھے یوں لگا جیسے میں یہاں صدیوں سے کھڑی ہوں اور زندگی ایک اداسی کے موڑ پر آ کر رک سی گئی ہے۔ میں گرل کے پاس پڑی کرسی پر نیم دراز ہو گئی۔ ان فرصتوں کے چند گھنٹوں نے ماضی کے بند دریچوں کو پھر سے کھول دیا۔ جہاں درد کے دھوئیں کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔

کبھی کبھی ایک چھوٹی سی بات نشتر بن کر ساری زندگی انسان کے وجود میں چبھتی رہتی ہے۔ محبت آخر اتنی بڑی غلطی کیوں بن جاتی ہے؟

ذیشان سے میری ملاقات یونیورسٹی میں ایڈمیشن کے دوران ہوئی۔ وہ بھی انگلش ڈیپارٹمنٹ میں داخلے کے لیے آیا تھا۔ کلاس کے ایک ہونے کی وجہ سے ہمارا زیادہ وقت اکٹھے گذرتا۔ پھر نہ جانے کب، کیسے خود بخود میرے دل میں اس کے لیے ایک نرم گوشہ نکل آیا۔ میں عمر کے اس حصے میں تھی جہاں ہر لڑکی کے دل میں محبت کی ایک ہلکی سی کسک کہیں چھپی ہوتی ہے۔ اپنے محبوب کو دیکھنے کے لیے۔ پتہ نہیں کونسی گھڑی ایک تصور جسم کا حصہ بن کے اندر ہی اندر پھولنے پھلنے لگتا ہے۔ کبھی چپ چاپ خوابوں میں چلا آتا ہے کبھی دن کی روشنی میں جگمگانے لگتا ہے اور اس عمر میں جانے کیوں انسان محبت میں بہت زیادہ پر اعتماد ہوتا ہے۔ زندہ رہنے کا احساس، کسی کو شدت سے چاہنے کا احساس، سارا ماحول، موسم، باتیں سب کچھ اچھا لگتا ہے۔

وہ دن بھی عجیب آزادی کے دن تھے۔ آزاد پرندوں کی طرح ایک دوسرے کے ساتھ زندگی کی ہر غم سے بے نیاز یونیورسٹی کی کھلی، رنگین فضاؤں میں اڑتے پھرتے تھے۔ محبت سردیوں کی میٹھی میٹھی دھوپ کی طرح دھیرے دھیرے ہمارے دلوں میں اترنے لگی تھی۔ اک عجیب طرح کی سرمستی اور بے نیازی ہمیں لئے لئے پھرتی۔ اور ہم سوچتے بس زندگی یہی ہے۔ اور پڑھائی کی زندگی ختم ہوتے ہی محبت ہمارے لیے بانہیں کھولے کھڑی ہو گی۔

بھول جاتا ہے انسان۔۔۔ خوشی کا یہ سیلاب ایک دھوکا ہے کیونکہ تھوڑی ہی دیر میں یہ جھوٹی خوشیاں اپنی چمک کھو دیتی ہیں اور غم کا ایک تاریک سمندر دل میں طوفان اٹھا دیتا ہے۔

انسان بھی کیسے کیسے خواب دیکھتا ہے محبتوں کے۔

سب فریب کی باتیں ہیں۔ ابھی قدم بھی نہیں جمنے پاتے کہ اس دشت میں ایسی آندھیاں چلنے لگتیں ہیں کہ سب کچھ برباد ہو کر رہ جاتا ہے۔

ذیشان مزید تعلیم کے لیے باہر جانا چاہتا تھا اس کا خیال تھا کہ وہ کچھ بن کر میرے والدین سے بات کرے گا تا کہ وہ انکار نہ کر سکیں۔

جانے سے پہلے وہ مجھ سے ملا۔ وہ خزاں کی ایک اداس شام تھی۔ آسمان پر سرخی میرے خون کی طرح بکھری ہوئی تھی۔ پتے درختوں سے گر پڑے تھے۔ ٹنڈ منڈ درخت اپنے پتوں کو بکھیرے اداس کھڑے تھے۔ اپنے اردگرد پھیلی بے رنگ اداسی دیکھ کر میں نے کہا۔

ذیشان رنگ، موسم اور انسان کتنے ملتے جلتے ہیں۔ انسان بھی درخت کی طرح ہرا بھرا ہو تو ہر شے زندگی میں خوشی بن کر داخل ہوتی ہے اور سوکھ جائے تو سوکھی شاخوں کی طرح ٹوٹنے لگتا ہے۔

''لیکن میرا یہ خیال ہے کہ غم اور خوشی انسان کی اپنی کیفیت کے نام ہیں۔ دراصل موسم انسان کے اندر ہوتے ہیں جو موسموں کی طرح غم اور خوشی بن کر زندگی میں داخل ہوتے ہیں۔''

''آج تم اتنی دکھی کیوں ہو؟''

میں اس سے کہنا چاہتی تھی۔۔۔

''تم نہ جاؤ'' میری سوالیہ نگاہیں اُسے دیکھ رہی تھیں۔

تم کچھ کہنا چاہتی ہو۔

''نہیں تو۔۔۔'' میں نے ایک سرد آہ بھری اور چپ رہی۔

''میرے اندر خوف کی آندھیاں چل رہی تھیں''

''انتظار کروگی نا؟''

''انتظار۔۔۔ کتنا جان لیوا لفظ ہے انتظار۔''

محبت کی تمام عمر انتظار کی حدت اور شدت میں ہی گذرتی ہے۔

''میں جانتا ہوں۔۔۔ جدائی کا یہ اضطراب میرے اندر بھی ہے تم اتنی مایوس کیوں ہوتی ہو۔ امید کا سہارا لو۔''

''محبت کرنے والوں کا سہارا اُمید ہی تو ہے لیکن کبھی کبھی یہ سہارا چھین بھی لیا جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے کسی اپاہج سے اس کی بیساکھیاں چھین لی جائیں تو۔۔۔''

''لیکن رابی۔۔۔ ہماری محبت یک طرفہ نہیں۔۔۔ اور نہ ہی اتنی کمزور کہ کوئی چھین لے۔ محبت کا رشتہ اعتماد اور بھروسے کا ہوتا ہے۔ ہم دونوں جس رشتے میں بندھے ہیں وہ اٹوٹ اور سچا رشتہ ہے۔ میں جلد واپس آؤں گا''

میرے اندر کی کیفیت کا اُسے اندازہ نہ تھا جس وقت ہم دونوں ایک دوسرے سے جدا ہوئے، مکمل کھوکھلے تھے۔

اس کے جانے کے بعد جانے کیوں میں ہر وقت اپنے اندر اور باہر ایک عجیب ڈراؤنا سا شور محسوس کرتی۔ پھر ایک دن وہ سارا شور، ساری آوازیں روشنی کے نقطوں کی طرح اندھیرے میں ڈوب گئیں۔

میں اپنے کمرے کے پردے ابھی بند کر کے لیٹی ہی تھی کہ امی میرے کمرے میں آئیں اور میرے پاس بیٹھ گئیں اور میرا ہاتھ تھام کر بولیں۔

رشتہ آیا ہے تیرے لیے۔۔۔ منصور کا۔ فیملی کا دیکھا بھالا اچھا لڑکا ہے۔

تم خوش رہوگی۔

لیکن میں کسی سے شادی نہیں کرسکتی۔ آپ جانتی ہیں۔

''تیرا دماغ خراب ہوگیا ہے۔۔۔ دنیا دل سے نہیں دماغ سے چلتی ہے۔۔۔ مجھے خاموش دیکھ کر وہ بولیں۔

''کیا سوچ رہی ہو۔۔۔ کیا فیصلہ کیا ہے؟ ماں نے پیار سے پوچھا۔

آپ جانتی تو ہیں۔۔۔؟

لیکن وہ تو پردیس جا کر بیٹھ گیا ہے اب اس سے کیا اُمید؟

''وہ پردیس سے کبھی تو واپس آئے گا نا!''

''لیکن تیرے ابّا کسی صورت نہیں مانیں گے'' وہ کہہ کر کمرے سے باہر چلی گئیں۔

میں نے انکار کرنا چاہا تو اصولوں کے پکے والدین کے پتھر جیسے دلوں پر میرے آنسوؤں کا کوئی اثر نہ ہوا۔ ماں باپ کی عزت و ناموس ایک دیوار کی صورت سامنے آ کھڑی ہوئی۔

میرے وجود کو محبت سے اس طرح جدا کیا جا رہا تھا جیسے گوشت سے ناخن۔۔۔ میرے گلے میں روایتوں کا پھندا ڈال کر مجھے رسم و رواج کی سولی پر لٹکا دیا گیا۔ اونچے خاندان اور اونچی ذات کے لیے۔

اس کے خط آتے رہے لیکن میں اس کے کسی خط کا جواب نہ دے سکی۔ اس لیے کہ اب میرے پاس کہنے کو کچھ نہ تھا۔

کوئی صدا میرے اندر گونجتی رہی۔

منصور مجھے پا کر بہت خوش تھے وہ ہر طرح سے ایک اچھے انسان تھے۔ میری ہر خوشی کا خیال رکھتے گھر میں ہر طرح کی آسودگی اور آرام تھا۔

جانے کیوں۔۔۔ ایک خلش تھی جو بے چین رکھتی۔

سب کے درمیان رہ کر بھی خود کو اکیلا محسوس کرتی۔ چھپتی پھرتی ان لمحوں سے۔۔۔ جو میرے تعاقب میں رہتے۔ کہیں کونوں، کھدروں سے نکل آتے اور صلیب بن کر میرے سامنے آن کھڑے ہوتے اور سوال کرتے جن کا میرے پاس کوئی جواب نہ ہوتا۔

اگر انسان کے اختیار میں ہوتا تو شاید ہم صرف وہی چیز مول لیتے جو ہماری اپنی خواہش کے مطابق ہوتیں۔ دکھوں اور ناکامیوں کے سارے دروازے بند کر لیتے اور دنیا میں دکھ نام کی کوئی چیز نہ ہوتی۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ کوئی زندگی ایسی نہیں ہے جو اپنی آرزو اور اپنے ماحصل میں مکمل ہو، برابر ہو۔

میں ایک مکمل سمجھوتے کے تحت سب کچھ بھول جانا چاہتی تھی کیونکہ اب میری زندگی میں منصور شامل تھا۔ منصور سے محبت کرنے کا خیال تو نہیں آیا لیکن اس کی تنہائی کا مداوا بن گئی کیونکہ مجھے خود بھی بیساکھیوں کی ضرورت تھی۔ دن بھر کاموں میں مصروف رہتی اور منصور کی ساری خوشیاں اور اداسیاں اپنے اندر سمیٹ لیتی۔ وہ بہت کم گو اور پرسکون انسان تھا۔ اس کا پیار پا کر آہستہ آہستہ میں ذیشان کو بھولنے لگی تھی۔ ابھی مٹھی بھر قرار نصیب ہی ہوا تھا۔ زندگی میں ایک ٹھہراؤ آنے لگا تھا کہ آج اچانک تم میرے سامنے آ گئے۔ اور میری ساری زندگی کو اتھل پتھل کر دیا۔

سچ ہے گزرا ہوا وقت ذہن کی سلیٹ پر لکھا ہوا ایک ایسا فارمولا ہے جس کو انسان آسانی سے نہیں مٹا سکتا۔

باقی صفحہ ۵۹ پر ملاحظہ کیجیے

چہار درویش

انجم جاوید
(کراچی)

وہ رات ایبٹ آباد شہر کی سرد ترین راتوں میں سے ایک رات تھی سردی نے ہنستے مسکراتے شہر پر سوگواریت کی کیفیت طاری کردی تھی سرِ شام بازار بند ہو جاتے اور شہر کسی طلسمی بلا کی زد میں آیا ہوا شہر محسوس ہونے لگتا انسان تو کجا کتے بھی سڑکوں پر نظر نہیں آ رہے تھے ایسے سرد موسم میں کچھ لمحہ قبل ہونے والی بارش نے آسیبی کیفیت کو دو آتشہ کر دیا تھا اچانک بادل چمکے تو حیران کن طور پر سول اسپتال کے مقابل روڈ پر ایک لمبے قد کا آدمی تیز تیز قدموں سے جاتا دکھائی دیا اس نے ایک شال سے اپنے سارے وجود کو ڈھانپ رکھا تھا چلتے چلتے اقصیٰ لیبارٹری کے نزدیک پہنچ کر اس نے چند لمحہ رک کر جائزہ لیا اور پھر سیدھے ہاتھ پر مڑ گیا اس کے ایک طرف سول اسپتال کی حدود ختم ہو رہی تھی تو دوسری طرف پرانے طرز کے مکانات۔ وہ تیز قدموں سے چلتا گیا آگے قبرستان شروع ہو گیا یہاں دونوں طرف قبرستان جبکہ درمیان میں قدرے کشادہ سڑک سی تھی وہ ابھی چل ہی رہا تھا کہ بارش نے پھر برسنا شروع کر دیا اس نے سیدھے ہاتھ پر دیکھا قبرستان کے اندر ایک مزار بنا ہوا تھا وہ قبرستان کے اندر سے ہوتا ہوا مزار کے احاطے میں داخل ہو گیا بارش کی رفتار تیز ہو چکی تھی مگر اب وہ محفوظ تھا اس نے بغور جائزہ لیا یہ کسی شاہ مرتضیٰ کا مزار تھا ایک لمبی قبر جو انہی کی تھی جبکہ اس کے ساتھ تین قبریں اور بھی تھیں مزار کے درمیان میں ایک مضبوط پلر۔ چہار اطراف پختہ دیواریں جالی سے مزین تھیں اس نے پلر کے گرد جگہ کو اپنی چادر سے صاف کیا اتنے میں بجلی چمکی تو اس کے خال و خد نظر آئے اس کا چہرہ، داڑھی، عمر کوئی ساٹھ سال کے لگ بھگ؟ اسے سردی کا احساس بھی ہونے لگا تھا وہ مزار سے باہر نکلا ساتھ ہی ایک تازہ قبر بنی ہوئی دکھائی دی اس نے جائزہ لیا وہاں اسے ایک ماچس مل گئی چند جلی ہوئی اگر بتیوں کے ساتھ، اس نے آس پاس کا جائزہ لیا اسے لکڑیاں مل ہی گئیں اس نے انہیں اکٹھا کیا اور اندر لا کر آگ جلانے کی کوشش کرتا رہا آخر وہ کامیاب ہو گیا اور تھوڑی ہی دیر میں ہلکی آنچ سے مزار جل اٹھا۔ وہ ابھی اس تپش سے محظوظ ہو ہی رہا تھا کہ اچانک ایک شخص مزار کے احاطے میں داخل ہوا اس نے چونک کر اسے دیکھا وہ بھی سر تا پا گرم موٹی چادر میں لپٹا ہوا تھا وہ بھی داخل ہو کر چند لمحہ ٹھٹھک کر رہ گیا پھر اس نے السلام علیکم کہا اور اسی پلر کے ایک کونے پر آگ کے گرد بیٹھ گیا اس کا جسم سردی کی شدت سے کپکپا رہا تھا۔ ابھی کچھ ہی دیر گزری تھی کہ آ گئے، پیچھے دو آدمی اور وہاں داخل ہوئے انہوں نے بھی السلام علیکم کہا مگر ان کی آواز میں ایک عجیب سے کھڑکھڑاہٹ تھی ایک بات جو دونوں میں نمایاں تھی وہ یہ تھی کہ انہوں نے گرم چادر سے پورا جسم اور چہرہ ڈھانپ رکھا تھا صرف ان کی آنکھیں نظر آ رہی تھیں کافی دیر ماحول پر عجیب سی خموشی طاری رہی پھر سب سے پہلے داخل ہونے والے شخص نے سکوت توڑتے ہوئے کہا۔ اس سرد ترین اندھیری رات میں کچھ سردی، کچھ بارش سے بچاؤ کے لیے ہم چار اجنبی افراد ایک چھت کے نیچے جمع ہو گئے ہیں تو مجھے ''قصہ چہار درویش'' یاد آ گیا ہے ہم ایک دوسرے کو نہیں جانتے، رات کو صبح میں ڈھلنے میں کافی وقت ہے کیوں ناں اس وقت کو یوں گذاریں کہ ہم اپنا اپنا تعارف کراتے ہوئے اپنی زندگی کے اہم واقعات سنا کر وقت گذاریں یوں وقت بھی گذر جائے گا اور سحر بھی ہو جائے گی۔

بے شک ۔۔۔ ایک ہی آواز بقیہ تینوں طرف سے آئی۔

تو میرے درویش ساتھیو! ''پہلے درویش'' کے طور پر میں اپنی کہانی سناتا ہوں میرا نام پروفیسر جے رام پوری ہے ۔۔۔

پروفیسر جے رام پوری کو قصبہ پریم نگر میں آئے زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا لیکن اس کی شہرت دور دور تک پھیل گئی تھی اس کی وجۂ شہرت یہ تھی کہ وہ ہر آنے والے سائیل کو تمام تر جزئیات سے حقیقت سے آشنا کر دیتا تھا اور پھر اسے رضامند پا کر عملیات کا عمل دھراتا تھا پروفیسر رام جے پوری ماہر علم نجوم و تعویذات و عملیات تھا اور اس پر اعتماد اور اعتقاد کرنے والوں کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اس کا معمول تھا ہر روز صبح اپنی خانقاہ میں جسے اس نے ''حجرۂ جے رام پوری'' کا خطاب دے رکھا تھا آتا۔ ناشتہ کرتا اور سب کے لیے قہوہ کا اہتمام کرتا اس دن بھی وہ حجرے میں بیٹھا تھا اور حسبِ معمول گفت و شنید کا سلسلہ بھی شروع تھا یہ وہ خاص وقت تھا جس میں پروفیسر تعویذات کا عمل یا تعویذ دینے کی بجائے صرف شرکاء حجرہ سے بت کرتے کچھ علمی، کچھ ادبی، کچھ ذاتی گفتگو کا سلسلہ ظہر کی نماز تک چلتا اور پھر ظہر کی نماز کے بعد سائل آتے اور یوں عملیات کا سلسلہ مغرب تک چلتا رہتا۔ اس دن وہ گاؤں کے رہنے والوں سے ذاتی و نجی حوالوں سے بات کر رہا تھا کہ اچانک ایک نوجوان اٹھا اور اس نے کہا پروفیسر صاحب! میں آپ سے ایک سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔

ہاں۔ کیوں نہیں۔ بے شک پوچھو! پروفیسر نے اس نوجوان کو دیکھتے ہوئے کہا۔

پروفیسر صاحب! آپ کے بارے میں مشہور ہے کہ آپ کے پاس جو بھی کسی مشکل میں، کسی مسئلے میں آتا ہے تو آپ اس کو عمل بتانے، تعویذ دینے سے قبل اس کے سارے اچھے بُرے اثرات سے آگاہ کر دیتے ہیں اس لئے کئی لوگ بغیر نقش لیے واپس چلے جاتے ہیں آپ آئی ہوئی آمدنی کو مسترد کر دیتے ہیں جبکہ عمومی طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ عاملوں کے پاس کوئی بھی جائے ولی اسے ہر کام کرنے کا کہہ کر رقم لیتے ہیں تعویذ دیتے ہیں کام خواہ ہو یا نہ ہو۔ آپ ان عاملوں سے مختلف ہیں میرا سوال یہی ہے کہ آپ ایسا کیوں کرتے ہیں کہ آنے

والے کو ہر صورت سے آگاہ کر دیتے ہیں۔

نوجوان تو یہ کہہ کر چپ ہو گیا لیکن اس سمیت محفل میں موجود ہر شخص نے دیکھا کہ پروفیسر جے رام پوری کے چہرے پر کرب کی کیفیت طاری ہو گئی اور ایسا لگا جیسے وہ سکتے میں آ گئے ہوں۔ اس کے چہرے کا رنگ بدل کر رہ گیا تھا۔ کافی دیر محفل میں بالکل خاموشی طاری رہی پھر پروفیسر جے رام پوری نے ایک لمبی سانس لی اور انتہائی تھکے تھکے، بوجھل بوجھل لہجے میں کہا۔

یہ ایک راز ہے گہرا راز۔ کہ میں ایسا کیوں کرتا ہوں کہ ہر آنے والے سائل کو تمام سچائیوں سے آگاہ کر دیتا ہوں لازمی امر ہے کہ اس سے میرے آمدنی کے وسائل متاثر بھی ہوتے ہیں تاہم مجھے اب اس کی کوئی پرواہ نہیں۔ میں آج اس راز سے پردہ اٹھانے جا رہا ہوں یہ ان دنوں کا واقعہ ہے جب میں اپنے استاد پنڈت نارائن سے علمِ جوتش، علمِ رمل اور عملیات سیکھ کر بھارت کے کئی شہروں سے ہوتا ہوا لاہور پہنچا اور قصور کے ایک گاؤں بیگ پور کے قریب اپنا ٹھکانہ بنا کر عملیات و تعویذات کا سلسلہ شروع کیا۔ یہاں کے لوگ زیادہ پڑھے لکھے نہیں ان کے وسائل اور مسائل بھی اور طرح کے ہیں وہاں میرا کاروبار خوب چلنے لگا میں نے بھی روایتی عاملوں کی طرح جو آیا، جس مسئلے کے لیے آیا اسے عمل بھی بتایا، تعویذ بھی دیئے، ایک ماہ ہی میں میری شہرت دُور دُور تک پھیل گئی ایک دن میں ابھی حجرے میں آ کر بیٹھا ہی تھا کہ گاؤں کا ایک نوجوان قاسم داخل ہوا حسبِ روایت اس نے میرے ہاتھ چومے، بیٹھا، میں نے اس سے آنے کا سبب پوچھا کافی جھجک کے بعد اس نے بتایا کہ اسے گاؤں کی ایک عورت زلیخا سے عشق ہو گیا ہے اور وہ اسے اپنانا چاہتا ہے مگر مسئلہ یہ ہے کہ وہ شادی شدہ اور بچوں والی ہے۔ یہ مسئلہ عجیب سا تھا اور پہلی بار میرے سامنے ایسا واقعہ آیا تھا عموماً غیر شادی شدہ لڑکے یا لڑکیاں اپنے من پسند رشتوں کے لیے محبوب کو ہموار کرنے کے لیے آتے تھے یا پھر شادی شدہ عورتیں، سوکنوں کے حوالے سے میں کچھ دیر سوچ میں رہا پھر اس نوجوان سے مزید تفصیل مانگی اس نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا:

میرا نام آپ جانتے ہیں قاسم ہے، زلیخا میرے گاؤں سے منسلک دوسرے گاؤں کے ایک رہائشی منور کی بیوی ہے میری اس کی ملاقات کماد کی کٹائی کے دوران اتفاقیہ ہوئی پہلی ہی ملاقات میں اس کے چہرے نے مجھے گرفت میں لے لیا میں بہانے بہانے اس سے ملنے کی کوشش کرتا رہا۔ وہ بھی میری دیوانگی کو سمجھ گئی اور رفتہ رفتہ ہماری دوستی محبت میں بدل گئی، جب بھی اس کا خاوند گاؤں سے باہر جاتا وہ مجھے بچے کے ذریعے بلا لیتی، لیکن بہت جلد اس کے شوہر کو شک ہو گیا اور اس نے بہت سی پابندیاں لگا دیں۔ ہم ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتے لہٰذا آپ مجھے ایسا تعویذ دیں کہ اس کا شوہر اسے طلاق دے دے یا اس کا انتقال ہو جائے تاکہ میرا راستہ صاف ہو جائے۔ میں نے اس کی بات سنی اور معقول رقم کا تقاضہ کیا وہ رقم لے کر آیا تھا اس نے میرے سامنے پیسے رکھ دیئے میں اٹھا پنجرے سے سانپ کی کینچلی نکالی اور اس پر ایک سخت جلالی وظیفہ لکھنا شروع کر دیا۔ میں نے اسے بتایا کہ سانپ کی کینچلی اس بستر کے نیچے رکھنی ہے جہاں اس کی محبوبہ کا خاوند سوتا ہے اس کے ساتھ ساتھ اسے کچھ تعویذ دیئے جو صبح اور رات کو عورت کے خاوند منور کو پانی یا دودھ میں گھول کر پلانے تھے وہ یہ ساری اشیاء لے کر ہنسی خوشی حجرے سے نکل گیا یہ اس کی اور میری پہلی اور آخری ملاقات ثابت ہوئی۔ اس نے تعویذ و سانپ کی کینچلی اپنی محبوبہ زلیخا کے حوالے کیں اسے ساری صورت حال اور اشیاء کو استعمال کرنے کا طریقہ بھی سمجھا دیا۔ ایسا نہیں تھا کہ میں نے جو نقش دیا اس سے منور کی فوری موت ہو جاتی ہاں اتنا ضرور تھا کہ سفلی عمل کے نتیجے میں وہ عجیب سی بیماریوں کا شکار ہو جائے اور ذہنی اور جسمانی طور پر مفلوج ہو کر رفتہ رفتہ موت کی جانب بڑھتا رہتا سانپ کی کینچلی ہو یا مچھلی کی آنتوں پر کیا گیا عمل یہ خوفناک عمل ہوتا ہے۔ میں اس واقعے کو بھولتا چلا گیا ہر روز کئی سائل، کئی مسائل لیے آتے ان میں خواتین کی تعداد زیادہ ہوتی تھی انہی میں ایک عورت صابرہ بھی تھی جسے یہ صدمہ تھا کہ اس کے میاں نے دوسری شادی کر لی ہے اور اسے اب پوچھتا ہی نہیں اس کی خواہش تھی کہ اس کا میاں اس کی سوکن کو چھوڑ دے میں نے اس سے منہ مانگی رقم طلب کی اس نے اپنے سونے کے کنگن میرے آگے رکھ دیئے میں نے ان میں سے ایک کنگن اٹھایا اور اسے ان دنوں آنے کا کہا جب اسے ماہواری آ رہی ہو وہ انہی دنوں میں آئی تو میں نے تازہ تازہ گندے خون سے اسی وقت تعویذ لکھ کر اسے دے دیئے اس کی مراد بر آئی گھر میں جھگڑے ہوئے آخر اس کے میاں نے اپنی دوسری بیوی کو طلاق دے کر گھر سے مار کر نکال دیا صابرہ نے بقیہ کہانی تو چھپائی مگر اس نے پورے گاؤں میں میری مہارت کے قصّے بیان کیے دوسرے گاؤں سے بھی لوگ آنے لگے اتنی رقم مجھے ملی کہ میں نے اپنے حجرے میں ایئر کنڈیشن بھی لگوا لیا ایک دن میں حجرے میں بیٹھا تعویذ دے رہا تھا کہ اچانک گاؤں کا ایک رہائشی نوجوان عمر داخل ہوا اس کے چہرے پر سخت گھبراہٹ تھی پریشانی تھی، خوف تھا، اس نے حجرے میں آتے ہیں شور مچانا شروع کر دیا۔ کیا بات ہے؟ میں نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

بابا جی! آپ جلدی سے اٹھیں۔۔۔ فوری اٹھیں۔۔۔ قاسم۔۔۔ مر رہا ہے اور آپ کو یاد کر رہا ہے۔ آپ سے ملنا چاہتا ہے؟ اس نے مضطرب لہجے میں بار بار کہا کون قاسم؟ میں واقعی بھول گیا تھا۔

اب اس نے جو قاسم کا بتایا تو میرے پاؤں تلے سے بھی زمین نکلنے لگی میں فوری حجرے سے نکلا۔ عمر نے مجھے اپنی موٹر سائیکل پر بٹھایا اور قاسم کے گھر لے گیا اس کا چہرہ نیلا پڑ گیا تھا اسے موت کی ہچکیاں آ رہی تھیں میں جیسے ہی اس کے سامنے پہنچا اس کی آنکھوں میں زندگی کی رمق و چمک لوٹ آئی۔ میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے اس نے اٹک اٹک کر آخری لفظ کہے۔

آپ کیسے نجومی ہیں؟ آپ کیسے ماہر علم ہیں آپ کو یہ بھی علم نہیں ہوا

کہ میں اپنے مقصد میں ناکام ہوکر خود زندگی ہار جاؤں گا۔منور زندہ ہے میں جارہا ہوں کیا فائدہ آپ کا ماہر علم نجوم وماہر علمِ غیب وتعویذات کا؟

قاسم کی زندگی کے یہ آخری الفاظ میرے سامنے ادا ہوئے اور پھر اس کی روح کا رشتہ جسم سے ٹوٹ گیا۔ میں اس کی نمازِ جنازہ میں پھر سوئم میں شریک رہا مگر غنودگی آمیز ذہن کے ساتھ، اس کی موت سے بڑھ کر اس کے آخری الفاظ میرے سامنے اس کا نیلگوں چہرہ، ٹوٹتی سانس، بکھرتے ارمان، سب لمحات ٹھہر گئے تھے۔ مجھے ملنے والی معلومات کے مطابق قاسم کی موت سانپ کے ڈسنے سے ہوئی تھی لیکن مجھے یہ چیز سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ آخر اسے سانپ نے کب، کہاں اور کیوں ڈسا، میں اپنے حجرے میں پہنچا اور میں نے قاسم کا بنایا ہوا زائچہ دوبارہ دیکھا۔غور سے دیکھا، تو پل بھر کے لیے مجھے ایسا لگا جیسے میرے استاد پنڈت نرائن مجھ پر لعنت بھیج رہے ہوں۔ میں نے زائچے کی جزئیات کا جائزہ لیا تھا نہ ہی اس کی دشائیں نکالی تھیں۔ مارکیش ستارے زحل کی مہادشا تھی اس کے نیچے بھی زحل کی بادشاہت تھی۔شدید دکھ اپنی جگہ لیکن پھر بھی میرے ذہن میں بہت سے سوال مچل رہے تھے میں شدید ذہنی کرب میں تھا اور وقتی طور پر میں نے حجرے میں سوالیوں سے ملنا بند کر دیا تھا۔

ایک دن میں اپنی ذہنی کیفیت کو لیے کپاس کے کھیتوں میں گھوم رہا تھا کہ عمر میرے سامنے آ گیا ایک خیال کے ذہن میں آتے ہی میں نے اسے بلایا اور پوچھا۔

عمر۔۔۔کیا تم ساتھ والے گاؤں کی زلیخا کو جانتے ہو؟

کون زلیخا؟ وہ منور چاچا کی گھر والی۔

ہاں۔۔۔میں نے بے ساختہ کہا۔

جی جانتا ہوں۔۔۔اس نے مجھے سوالیہ انداز سے دیکھتے ہوئے کہا۔

میرا ایک کام کردو تم ساتھ والے گاؤں میں جاؤ اس کو میرا پیغام دو کہ بابا جی تمہیں یاد کر رہے ہیں۔

اس بات کو صرف ایک دن ہی گذرا تھا کہ صبح گیارہ بجے کے قریب زلیخا میرے حجرے میں داخل ہوئی اسے دیکھ کر میرے اندر خوشی سے ہلچل مچ گئی میں نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور محفل میں موجود افراد کو تخلیہ کا اشارہ کیا زلیخا کے چہرے پر انتہائی گہری سنجیدگی، اداسی صاف نظر آ رہی تھی۔

جی بابا جی! آپ نے مجھے بلایا تھا۔۔۔کوئی خاص بات۔۔۔ خاموشی کو زلیخا نے توڑا۔

ہاں۔۔۔ میں نے ایک گہری سانس لی اور کہنا شروع کیا۔ میں تمہارے اور قاسم کے جذبات کو جانتا، سمجھتا ہوں۔میں نے ہی اسے کچھ عملیات بھی دیں۔لیکن اس کی موت میرے لیے معمہ ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ تمہارے سوا کوئی دوسرا نہیں ہے جو اس کی موت پر بات کر سکے یا حقیقت بتائے کہ آخر ہوا کیا ہے؟

میری یہ بات ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ زلیخا نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا مجھے صاف پتہ چل گیا کہ زلیخا کی قاسم سے محبت جھوٹی نہیں سچی تھی دل سے تھی اور اس کی موت نے اسے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا ہے میں نے بھی زلیخا کو چپ کرانے کی کوشش نہیں کی اسے کھل کر رونے دیا۔اس کے دل کا غبار رونے سے کچھ کم ہوا تو اس نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا۔

قاسم مجھ سے بہت محبت کرتا تھا مجھ سے بھی زیادہ۔اس نے آپ کے دیئے ہوئے نقش، سانپ کی کینچلی میرے حوالے کئے اور مجھے سارے طریقے بھی سکھائے کہ سانپ کی کینچلی کو کہاں رکھنا ہے اور تعویذ کس طرح سے اور کب منور کو پلانے ہیں وقتی طور پر میں بہت خوش تھی لیکن اس کے جانے کے بعد نہ جانے کیوں خوفِ خدا میرے دل میں جاگ اٹھا، ٹھیک ہے میں قاسم کو چاہتی ہوں مگر میں منور کی موت کا باعث بھی نہیں بننا چاہتی تھی اس لیے میں نے تعویذ اور سانپ کی کینچلی اٹھا کر کپاس کے کھیتوں میں دفن کر دیئے لیکن قاسم کو یہی بتایا کہ میں نے اس کے کہے پر عمل کر دیا ہے ہوتے ہوتے پندرہ دن گزر گئے اور کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہ دیکھ کر قاسم کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوتا چلا گیا اس کے مزاج میں غصّہ بڑھتا چلا گیا اس نے آپ کو بھی بہت برا بھلا کہا کہ کیسے نقش دیئے ہیں کہ کوئی فرق نہیں پڑا میں اسے جھوٹی تسلی دیتی کہ کچھ دن اور صبر کر لو۔ایک دن بے صبرے قاسم نے ایک منصوبہ سوچا شاید اسے یہ خیال سانپ کی کینچلی دیکھ کر آیا ہوگا اس نے ایک جوگی سے مل کر ایک زہریلا سانپ خریدا اور رات کو دیوار کود کر میرے گھر داخل ہوا۔سردیوں کے دن تھے ہم کمرہ بند کر کے سوئے ہوئے تھے ہم اندر سے کنڈی نہیں لگاتے تھے اس بات سمیت میرے گھر کی کئی باتوں کا قاسم کو علم تھا اس نے کمرہ کھولا اور منور کے بستر پر رضائی اٹھا کر سانپ اندر ڈال کر واپس چلا گیا اتفاق سے اس رات منور میرے بستر پر میرے ساتھ صبح تک لیٹا رہا وہیں سے اٹھا غسل کر کے نماز ادا کی ناشتہ کر کے شہر دوائیں لینے چلا گیا مجھے قاسم کے کئے گئے واقعے کا قطعی کوئی اندازہ نہ تھا نہ ہی اس نے مشورہ کیا تھا اس دن دوپہر بارہ بجے تک جب گاؤں میں کوئی خبر نہ پھیلی تو قاسم مضطرب، بے چین ہو کر میرے گھر آ گیا میرے گھر معمول کی سرگرمیاں جاری تھیں میں بچوں کو لیے صحن میں دھوپ میں ہانڈی بنا رہی تھی اس نے اِدھر اُدھر دیکھ کر منور کا پوچھا میں نے اسے بتایا کہ کئی دن سے مجھے کھانسی ہو رہی ہے وہ شہر دوا لینے گیا ہے قاسم مسلسل بے چینی سے اِدھر اُدھر دیکھے جا رہا تھا اسے بے چین دیکھ کر آخر میں نے پوچھا کہ اسے قرار کیوں نہیں آتا۔ اِدھر اُدھر کیا دیکھ رہے ہو میرے اصرار پر وہ مجھے صحن سے اندر کمرے میں لے گیا اور رات کا پورا واقعہ سنایا جسے سنتے ہیں میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی میں بے ساختہ غصّے میں آ گئی اور اسے ڈانٹا کہ اس نے کیا بے وقوفی کی ہے؟ سانپ اس طرح سے مجھے بھی، میرے بچوں کو بھی ڈس سکتا تھا۔اب بات یہ آئی کہ آخر سانپ گیا کہاں؟ ہم دونوں کمرے میں سانپ کو ڈھونڈنے میں مصروف ہو گئے چھت کی کڑیوں کا جائزہ لیا پھر بستر جھاڑے، اسی تلاش میں قاسم

نے کانس پر رکھے برتن اٹھائے یہ لسی ڈالنے کے لیے میں استعمال کرتی تھی اس نے اس ہاتھ میں لیا اور پھر میں نے اتنا ہی دیکھا کہ اس میں سے چھوٹے قد کا سانپ تیر کی طرح نکلا اور قاسم کے ماتھے پر ڈنگ مار کر زمین پر گرا اور بھاگنے لگا۔ میں نے چیخ ماری میری چیخ کے ساتھ ہی قاسم کی بھی کرب ناک چیخ نکلی اور وہ میرے گھر سے بھاگتا ہوا گلی میں نکل گیا اس کے بعد اس کی موت کی اطلاع مجھ تک پہنچی میں کہ منور کے سوگ کی تیاریوں کا سوچ رہی تھی مجھے قاسم کا سوگ منانا پڑھ گیا۔ زلیخا نے بات ختم کی اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگ گیا تھا وہ آہستہ سے اٹھی اور تھکے تھکے قدموں سے حجرے سے باہر نکل گئی''۔

پروفیسر جے رام پوری کی بات مکمل ہوئی تو ساری محفل سناٹے میں آ گئی۔ پروفیسر جے رام پوری نے اس نوجوان کو مخاطب کر کے روتی ہوئی آواز میں کہا۔

عدنان! یہ وہ واقعہ ہے جس واقعے کے بعد میں اپنے آنے والے ہر سائل کو تمام تر جزئیات۔ اچھائی۔ برائی سے آگاہ کر دیتا ہوں۔ اس وقت بھی میں دیکھ رہا ہوں، میں سمجھ رہا ہوں، میرا علم بتا رہا ہے کہ تم بھی کسی زلیخا کے عشق میں مبتلا ہو اور کچھ خواہشات کے اسیر بھی۔ آؤ میرے بچے۔۔۔ اگر تم قاسم بننا چاہتے ہو تو۔۔۔ پھر ساری محفل نے گھوم کر دیکھا عدنان نے سر کو آغوش میں سمیٹ لیا۔

باباشاہ مرتضٰی کے مزار میں بھی سکوت طاری ہو گیا پروفیسر جے رام پوری پہلے درویش نے اپنی بات مکمل کرتے ہوئے دوسرے درویش سے کہا۔ اب آپ کی باری ہے آپ بتائیں کہ آپ کی کیا کہانی ہے؟ کیا قصّہ ہے؟

میرا نام فتح علی خان ہے میں ماہرِ یوگا ہوں۔ میری پیدائش کراچی میں ہوئی، میں میٹرک میں تھا تو مجھے اس علم سے دلچسپی پیدا ہوئی میں نے تعلیم ترک کی اور بھارت چلا گیا کوئی شک نہیں کہ وہاں مجھے بہت سے اساتذہ ملے جن سے میں نے یوگا سیکھا اور جب انہوں نے مجھے ''ماہرِ یوگا'' کہا تب میں نے ان سے اجازت چاہی۔ میں نے پورے بھارت میں یوگا کے کمال دکھائے پھر پاکستان آ گیا یہاں سارے شہر میں میں نے مظاہرے کیے کئی کئی دن میں قبر میں پڑا رہتا تھا غرض کے پورے پاکستان میں، میری شہرت پھیلی۔ انٹرویوز ہوئے، عملی مظاہرے کی ریکارڈنگ بھی ٹی وی پر نشر ہوتی رہی میں نے اپنا مسکن کراچی کو ہی بنایا اسی دوران میں نے ایک خطرناک مظاہرہ کیا۔ ٹمبر مارکیٹ میں تیز دھار کٹر لگے ہوتے ہیں جو لکڑی کو کاٹنے کے لیے استعمال ہوتے ہیں ہوتا یہ ہے کہ مضبوط تنے پر مشتمل لکڑی کو مشین پر رکھ دیا جاتا ہے اس کے بعد آرا چلایا جاتا ہے آرا ایک دائرہ مکمل کرتا ہے اور اس کا کٹر تیزی سے گھومتا ہے اور پل میں لکڑی کو دو حصّوں میں تقسیم کر کے نکل جاتا ہے۔ میں نے اس عمل کو کرنے کا فیصلہ کر لیا اور لکڑی کی جگہ مشین پر خود لیٹ گیا اور آرا مشین چلانے کا کہا۔ چونکہ میں کئی ہفتے قبل اس عمل کو کرنے کا اعلان کر چکا تھا اخبارات میں اشتہارات شائع ہوئے متعلقہ علاقے کے ڈپٹی کمشنر نے مجھ سے لکھوالیا کہ میں اپنی موت کا خود ذمہ دار ہوں۔ دراصل میں نے ساری جزئیات کا جائزہ لیا تھا۔ یوگا میں ایک عمل ایسا ہے جسے کر لیا جائے تو پورا جسم پتھر سے بھی زیادہ سخت ہو کر اکڑ جاتا تھا سانس تھم جاتی تھی مجھے اتنی دیر یہ عمل کرنا تھا جتنی دیر کٹر میری گردن سے گزر نہیں جاتا۔ جس دکان پر یہ عمل کرنا تھا اس کے دکاندار کی ہوا نکلی ہوئی تھی لیکن جب اس نے دیکھا کہ اس مظاہرے کو دیکھنے کے لیے ملکی، غیر ملکی میڈیا موجود ہے علاقے کے اہم ترین افراد، متعلقہ علاقے کا ڈپٹی کمشنر، ڈی آئی جی، علاقہ S.H.O سب موجود ہیں تو اس کی پریشانی کم ہوئی اور اس کے چہرے پر قدرے سکون آیا۔ میری بیگم طیبہ، میرے اس مظاہرے کے خلاف تھی اور رات کو ہی اس نے میرا کفن بکس سے نکال کر میز پر رکھ لیا تھا اور مجھ سے دو چار چکس (Cheque) دستخط کرا لیے تھے۔

پھر مقررہ وقت آیا میں مشین پر لیٹا اور تالیوں کی گونج میں کٹر کا بٹن دبا دیا گیا کٹر نے اوپر سے نیچے کا سفر شروع کر دیا۔ میری نظریں بہت سختی سے کٹر کی گردش پر جمی ہوئی محوِ حرکت تھیں پھر جیسے ہی کٹر میری گردن سے چند منٹ کی مسافت پر آیا میں نے فوری سانس روک لی اور یوگا کے عمل کو پورے جسم پر طاری کر دیا کٹر قریب آتا چلا گیا میری رکی ہوئی سانس اور رکتی چلی گئی۔ ایک لمحہ کو موت میرے سامنے آ گئی مگر میں نے اسی لمحے اعصاب کو پتھر کر لیا اور پھر تیز گڑگڑاہٹ کے ساتھ کٹر میری گردن پر سے رگڑ کھاتا ہوا گزرتا چلا گیا میری متحرک نظروں نے کٹر کو گردن سے سفر کرتے ہوئے جیسے ہی اوپر جاتے دیکھا ایک لمبی سانس اور تالیوں کی زوردار گونج ایک ساتھ فضا میں بلند ہوئی۔ میں فوری کٹر مشین سے اتر آیا۔ اردگرد جمع افراد نے مجھے گھیرے میں لے لیا اور اپنے کندھوں پر اٹھا لیا پھولوں کے ہاروں سے میں لد گیا تھا علاقے کے ڈپٹی کمشنر، ڈی آئی جی، سمیت سبھی کے چہروں پر خوشی تھی یہ ناقابلِ یقین منظر نہ صرف پاکستان میں بلکہ بیرون ممالک میں ہر چینل پر، ہر اخبار میں دکھایا اور چھاپا گیا جس سے میری شہرت دُور دُور تک پھیل گئی۔ حکومتِ پاکستان نے خوش ہو کر مجھے زمین دی جس پر میں نے ایک یوگا کو چنگ سنٹر کھولا اور یوگا کی تعلیم دینا شروع کر دی چند ہی ہفتوں میں میرے شاگردوں کی تعداد ہزاروں تک جا پہنچی انہی شاگردوں میں سے ایک شاگرد طارق بھی تھا۔ اسے شوق بھی تھا اور خداداد صلاحیتوں کا مالک، اس پر زیادہ محنت کرنے کی ضرورت پیش نہ آتی وہ رفتہ رفتہ ہر چیز کو اپناتا چلا گیا اس کی محنت، شوق، صلاحیت کو دیکھ کر میں اپنی بیگم سے کہتا تھا کہ طیبہ! دیکھتی رہنا یہ شاگرد میرا نام روشن کرے گا۔ طارق نے میری رہنمائی میں کئی مظاہرے کیے سانس روکنے کا، قبر میں لیٹنے کا غرض کہ اس کا نام بھی نوجوان یوگا ماہر کی حیثیت سے ہونے لگا۔ ایک دن اس نے مجھ سے کہا کہ استاد جی! اگر آپ اجازت دیں تو میں آپ کے نقشِ قدم پر چلتا ہوا کٹر مشین پر لیٹنے کا مظاہرہ کرنا چاہتا ہوں میں ایک جھرجھری لے کر رہ گیا اور اسے صاف منع کر دیا کہ وہ ایسا کرنے کا سوچے بھی نہیں۔ اس وقت تو وہ خاموش ہو گیا۔ تاہم ایک ہفتے بعد اس نے پھر یہی بات کی اس کے ذہن میں یہ بات سما گئی اور اس نے طیبہ سے بھی سفارش کر دی میں کبھی بھی اس کی بات

نہ مانتا مگر ایک دن اس نے اداس آمیز لہجے میں کہا۔

آپ مجھے اجازت نہیں دے رہے یا تو آپ کو مجھ پر اعتماد نہیں یا پھر اپنی دی ہوئی تربیت پر۔ میں خاموش ہو گیا اور اسے خاموش رضا مندی دے دی۔ وہی مقام، وہی دکاندار، وہی علاقہ جہاں آج سے چار سال پہلے میں نے مظاہرہ کیا تھا لوگ، میڈیا، علاقے کے ڈپٹی کمشنر وغیرہ سب موجود تھے اس بار دکاندار کے چہرے پر کوئی گھبراہٹ نہ تھی۔ متعلقہ علاقے کے ڈپٹی کمشنر، ڈی آئی جی، علاقہ S.H.O سب بدل چکے تھے مگر سابقہ کارنامے کی بازگشت کی گونج تاحال موجود تھی پھر پُر زور تالیوں کی گونج میں طارق کٹر مشین پر لیٹ گیا میں نے اسے اپنے سارے تجربے سونپ دیئے اس نے کہا بے فکر رہو استاد! آپ کی دی ہوئی تربیت، علم وہنر کو آج ثابت کر کے دکھاؤں گا۔ پھر بٹن دبا کٹر نے زوردار گونج کے ساتھ اپنا سفر نیچے کی طرف شروع کر دیا پھر میں نے دیکھا کہ طارق نے اپنے پٹھے اکڑا لیے ہیں۔ اطمینان کی ایک سانس میں نے لی کٹر آتا گیا۔ آتا گیا پھر اس نے طارق کی گردن کو ٹچ کیا۔ رفتہ۔۔۔رفتہ۔۔۔اسی لمحے میں نے طارق کے چہرے پر ایک عجیب سی رنگت دیکھی خطرے کی لال گھنٹی نے میرے ذہن کو جھنجھوڑ ڈالا۔ میں فوری طور پر مشین بند کرنے کے لیے بجلی کے بٹن کی طرف بھاگا مگر مجھے تاخیر ہو گئی تھی کٹر اتنی دیر کہاں لحاظ کرتا مجھ سمیت پورا ہال چیخوں سے گونج اٹھا طارق کی گردن کٹر مشین سے علیحدہ ہو کر فرش پر بقیہ جسم مشین پر پھڑک رہا تھا میں لڑکھڑا گیا اور گر کر بے ہوش ہو گیا۔ ہوش تو مجھے آ گیا مگر کئی دن تک میری ذہنی حالت خراب رہی میں پاگلوں کی طرح چلاتا، شور مچاتا، کبھی طیبہ کو کبھی بچوں کو مارنے لپکتا شور مچاتا کہ ہاں میں ہی طارق کا قاتل ہوں ہاں میں نے ہی اپنی اولاد، اپنے طارق کو قتل کیا ہے۔ اس مشکل ترین وقت میں طیبہ نے میرا مثبت ساتھ دیا اور اس کی ذاتی توجہ اور میرے دوست ماہر ہومیو پیتھک جمیل عظیم آبادی کی ادویات سے میں ہوش میں آیا۔ پھر مرا دل اچاٹ ہو گیا میں نے اپنا یوگا سینٹر اپنے ایک شاگرد فاروق کے حوالے کیا اور گوشہ نشین ہو گیا وہ ہی سینٹر چلاتا رہا اور ہر ماہ ایک معقول رقم میرے گھر دے جاتا تھا۔ پھر مجھے کسی نے مشورہ دیا کہ میں خود کو بہلانے کے لیے کسی سرسبز علاقے کا رخ کروں اس غرض سے میں ایبٹ آباد آیا۔ آج نتھیا گلی گیا وہاں سے واپس آ رہا تھا کہ رات، سردی، بارش نے مجھے اس مزار تک پہنچا دیا۔

دوسرے درویش فتح علی خان کی کہانی ختم ہوئی ماحول پر چھایا سناٹا اور بھی گہرا ہوتا چلا گیا۔ خاموشی۔۔۔سناٹا۔۔۔سناٹا۔۔۔خاموشی۔

آخر کار پہلے درویش نے اس خاموشی کو توڑا اور تیسرے درویش سے کہا۔

حضور! اب آپ کی باری ہے اپنے بارے میں بتاتے ہوئے اپنے واقعے سے اپنی کہانی سے آگاہ کریں کہ بقیہ وقت گذر سکے۔

میں کیا سناؤں استاد! میرا قصہ تو آپ نے سنا دیا میرا نام قاسم ہے۔ تیسرے درویش کی لڑکھڑاتی ہوئی آواز بلند ہوئی اس نے چادر چہرے سے ہٹا دی قاسم کو دیکھتے ہی پروفیسر جے رام پوری لڑھک گیا۔ دھڑکتے دل کے ساتھ فتح علی خان نے چوتھے درویش سے کہا۔ قاسم کی روح تھی اب تک بھٹک رہی ہے پھر واپس خلا میں چلی گئی ہے تم سناؤ کہ تم پر کیا گذری!

میں کیا سناؤں استاد محترم! میرا قصہ بھی تو آپ نے سنا دیا ہے مجھے طارق کہتے ہیں، یہ کہہ کر طارق نے چہرے سے چادر ہٹا دی۔

اگلے دن محلے کے افراد اطلاع پر پہنچے تو مزار کے احاطے میں اکڑی ہوئی دو لاشیں پڑی ہوئی تھیں پولیس کے ذرائع کے مطابق وہاں چار افراد کے بیٹھنے کی نشاندہی ہو رہی تھی بقیہ دو کہاں گئے یہ ایک معمہ ہے جسے حل کرنے کی پولیس کوشش کر رہی ہے۔

- بقیہ -

آنگن میں کالی دھوپ

دماغ میں اُدھم مچاتے ہوئے خیالوں سے پیچھا چھڑانے کے لیے میں کمرے میں چلی آئی۔ کمرے میں گہرا سکوت تھا۔ میز پر چائے کی پیالیاں بے ترتیب پڑی ہوئی تھیں۔ ادھ جلے ہوئے سگریٹ اور جلی ہوئی تیلیاں ایش ٹرے میں پڑی تھیں۔ تمہارے جانے کے بعد میرا گھر ایسے اداس ہو گیا جیسے اداس قبرستان۔۔۔

موسم بدل جاتے ہیں۔ وقت گذر جاتا ہے اور وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ ہی پرانے چہرے نئے چہروں میں نظر آنے لگتے ہیں۔۔۔ پرانے غم نئے غم میں شامل ہو جاتے ہیں اور پرانی یادیں نئی زندگی کے ساتھ ساتھ چلنے لگتی ہیں۔

وقت جو ایک بڑا مرہم ہے۔ سوچتی ہوں۔
ہم جو دو مختلف سمتوں کے مسافر ہیں۔۔۔
کیوں نہ اپنا رستہ بدل لیں۔۔۔
کیونکہ اب منصور ہی میری زندگی ہے۔
لیکن کبھی کبھی یہ دل کھنڈر کی طرح ویران سا لگتا ہے۔
منصور کے باوجود۔۔۔۔!

بستی

شاہد جمیل (گوجرانوالہ)

وسط پنجاب کے ایک چھوٹے سے گاؤں کی کہانی ہے جو تقسیم کے وقت تو بہت ہی چھوٹا تھا اور تقسیم سے کچھ سال اُدھر تو شاید اور بھی چھوٹا ہوگا- گاؤں کے عین درمیان محرابی دروازوں، اونچی چھتوں، دیار کی شہتیریوں اور گول گنبد والا گوردوارہ کہ جس کی پکی اینٹوں اور چونے سے بنے در و دیوار اور گنبد پر مہ وسال کی دھول اُٹی تھی- گوردوارے کے چہار اطراف چار پکّے اور آٹھ یا نو کچّے گھر اور بنیے کی ایک ہٹی کہ لوگ جس کے سامان کے ساتھ آدھے سے زیادہ درو دیوار بھی اکھاڑ لے گئے تھے- گاؤں کا نام بھی عجیب ہی تھا، بھرائیاں! یعنی ایسی بستی یا آبادی جہاں کچھ بھرائی یا ڈھول بجانے والے لوگوں نے رہنا شروع کیا اور پھر اس ڈھوک یا کوٹ کا نام ہی ان کے نام یا قومیت پر پڑ گیا- آثار بتاتے تھے کہ تقسیم کے وقت اس موضع یا گوٹھ گراں میں زیادہ گھر سکھوں کے، ایک دو ہندوؤں کے اور ایک آدھ بھرائیوں کے ہونگے اور پھر گاؤں کی اصل آبادی سے تھوڑا دور عیسائیوں کی بستی جس کے کل تین گھر تھے اور جو ابھی تک جوں کی توں چلی آتی تھی-

زمینوں کے کلیم کی الاٹمنٹ کا کام مکمل ہوا تو جیسے ایک ہیڑ کی ہیڑ چک میں داخل ہوگئی- جس کے ہاتھ جو لگا اُس نے اُس پر اپنا قبضہ جما لیا- گوردوارے کی بیرونی دیواروں پر اُپلے پتھ دیئے گئے اور اندرون دیواروں کی اینٹیں اکھاڑ کر ان سے چولہے چوکے بنا لیے گئے اور کمروں اور دالانوں میں مویشی باندھ دیئے گئے- ارتقاء کیلئے تو شاید ٹھیک ہی ہو مگر انسانی نفسیات اور معاشرت کیلئے ہجرت زہر قاتل کی حیثیت رکھتی ہے کہ مختلف شرست، ماحول، رہتل، سماج، رواج اور زبان کے متفرقات لوگوں کو تادیر بے چین رکھتے ہیں- یہاں بھی یہی ہوا، دو قسم کی ذات کے لوگ یہاں آباد ہوئے، ایک وہ جو خود کو سادات کہلواتے تھے اور ہندوستان کے علاقہ لدھیانہ سے ہجرت کر کے آئے تھے اور دوسرے راجپوت جو پانی پت اور کرنال سے آئے تھے- دونوں ہی ذاتوں میں لاکھ اختلافات ہوں مگر اُن میں ایک قدر ضرور مشترک تھی اور جو بہت بڑی تھی، یعنی اُن کا مسلمان ہونا، جب اُنہوں نے دیکھا کہ گاؤں میں کوئی مسجد ہی نہیں تو سب کے سب ہمہ جہتی کے ساتھ گوردوارے کے مدمقابل مسجد کی تعمیر میں جُت گئے-

جیسے جیسے وقت آگے بڑھ رہا تھا ویسے ویسے گاؤں کی زندگی آگے چل رہی تھی- چھوٹے موٹے لڑائی جھگڑے اور چوری چکاری کو چھوڑ کر گاؤں کی بڑی اور قابل ذکر لڑائی آمین کے مسئلے پر ہوئی جب ہر دو ذات کے لوگوں نے بانس کی شاندار لاٹھیوں اور کلہاڑیوں سے ایک دوسرے کے چار چار پانچ پانچ لوگوں کو لہولہان کر دیا اور پھر کئی مہینوں تک تھانے کچہری میں خجل خوار ہونے کے بعد ظاہری صلح صفائی پر بات ختم ہوئی، بات ختم نہیں بلکہ شروع ہوئی تھی کہ بلند آواز میں آمین کہنے والے اور دھیمی آواز یا منہ میں آمین کہنے والے الگ الگ اور اپنے طور پر نمازیں ادا کرنے لگے- کچھ نے الگ سے اپنی عبادت گاہ کی تعمیر کے پروجیکٹ پر بھی سوچنا شروع کر دیا- گاؤں میں پے بہ پے دو تین بڑی چوریاں ہوئیں تو دونوں گروپوں نے ایک دوسرے پر شک کرنا شروع کر دیا- سادات کا خیال تھا کہ اُن کے مخالفوں کا تعلق چونکہ کرنال سے تھا تو وہ لوگ باپ دادا سے چوری چکاری کا ذوق رکھتے تھے مگر پھر یوں ہوا کہ ٹھیکری پہرہ والوں نے ایک رات ایک دکان کو نقب لگاتے دو لوگوں کو موقعہ پر پکڑ لیا اور جب ان کے منہ اور سر سے ڈھاٹے اتار کر دیکھے گئے تو ایک سید اور ایک راجپوت نکلا-

مسلمانوں کی آبادی سے ذرا دور گاؤں کے مشرق کی جانب، جوہڑ کنارے عیسائیوں کے تین گھر آباد تھے- گھر کیا تھے بس گھروں کے نشان ہی تھے کہ جن کی بیرونی دیواروں کا تعین رو میں اُگے ہوئے گل باسی کے سیدھے، ٹیڑھے اور گرے ہوئے ڈنڈوں سے ہوتا تھا- کچے گھروں کی چھتیں شیشم اور کیکر کے ٹیڑھے میڑھے تنوں سے بنی تھیں اور صحنوں میں گندے پانی کی نالیاں بھری پڑتی تھیں- ایک گھر میں بابا عاما اور اُس کے دو بیٹے، بہوئیں اور اُن کے بچے رہتے تھے جبکہ دوسرے گھر میں چاچا موہنا اور چاچا سوہنا اپنے خاندان کے ساتھ رہتے تھے- تیسرا گھر جیرو عیسائی کا تھا- ان لوگوں کا سارا دن مصروفیت میں گذرتا- عورتیں علی الصبح کھانے پینے کے کاموں سے فارغ ہو کر زمینداروں کی حویلیوں اور جانوروں کے باڑوں کی صفائی کیلئے چلی جاتیں اور اُن کی چھوٹی بچیاں اور بچے کہ جن کی روشن اور خوبصورت آنکھوں میں ہر وقت دہشت تیرتی رہتی، گوبر اکٹھا کرنے، اُپلے بنانے اور جھاڑو لگانے اور گوہار الی پھیرنے میں اُن کی بھرپور مدد کرتے- مردوں کی مشقت اُن سے مگر کہیں زیادہ تھی- ہاڑی سونی کی سیپ کے چند من دانوں اور روزانہ کی خوراک کے عوض وہ منہ اندھیرے بیلوں سے کھیتوں میں ہل چلانے، مویشیوں کے لئے چارہ کاٹنے، کترنے، بھینسوں کو نہلانے، چرانے اور زمینداروں کی مٹھی چاپی تک درجنوں ہی پر مشقت کام سرانجام دیتے تھے-

کچھ دنوں سے گاؤں کے بڑے بوڑھوں اور خاص کر نمازیوں میں کھسر پھسر جاری تھی- کچھ کا خیال تھا کہ وہ شروع سے ہی ایسے ہیں اور پتہ نہیں اب تک کیا کچھ کر چکے ہوں- کچھ کا کہنا تھا کہ روپے پیسے کے معاملات کو فقط ایک آدمی کے ہاتھ میں دے دینا ویسے ہی بہت بڑی بے وقوفی ہے- گڑبڑ کا حل صرف اور صرف یہ ہے کہ تین چار لوگوں کی ایک مشترکہ کمیٹی بنا دی جائے جو جمع شدہ اور خرچ کردہ تمام چندے کی تفصیلات مشترکہ طور پر اپنے پاس رکھے اور تمام اخراجات کی نگرانی بھی کرے- کئی دن تک یہ کھچڑی اسی طرح پکتی رہی اور پھر

ایک دن اصل بات بھی سامنے آ ہی گئی - اصل بات یہ تھی کہ اب تک مسجد کے جمع شدہ اور خرچ کردہ تمام تر چندے کا کُلی چارج صرف امام مسجد کے پاس تھا- شاہ صاحب یعنی امام مسجد بڑے ہی پاکیزہ کردار کے مالک تھے اور سارا گاؤں اُن کی پارسائی کی قسم اٹھانے کو تیار تھا مگر اُن کے نو بیٹوں میں سے سب سے بڑے سے ایک نمبر پہلے والے نے مسجد کے چندے سے کچھ رقم چرالی تھی جس کی بناء پر شاہ صاحب کو نہ صرف یہ کہ لوگوں کی باتیں سننی پڑیں بلکہ انہیں سارا نظام ہی اپنے ہاتھوں سے نکلتا محسوس ہو رہا تھا- وہ اپنے بیٹے کی جگہ پیسے بھرنے کو تیار تھے مگر کسی طور بھی اس سارے انتظام کو اپنے ہاتھ سے ہرگز نہ جانے دینا چاہتے تھے، اس کیلئے انہوں نے پوری جدوجہد بھی کی، گاؤں میں اُن کی ساری برادری نے بھی ان کا بھرپور ساتھ دیا اور مزید کچھ دن یہ بحث چلنے کے بعد آہستہ آہستہ دم توڑ گئی-

ہر دو بڑی برادریوں کی آبادی میں دن بدن اضافہ ہوتا چلا جاتا تھا اور گلیوں محلوں میں سردی کے دنوں میں ہاتھ سے بنی ہوئی اُون کی لال پیلی زرد ٹوپیوں اور سویٹروں میں ملبوس بہتی ناک والے چھوٹے بچے بچیوں کی تعداد میں روز افزوں اضافہ دیکھا جا رہا تھا- اللہ کی مرضی کے ساتھ ہر دو اکثریتی برادریوں کے لوگوں کے ذہن کے نہاں خانوں میں کہیں اپنی افرادی قوت میں اضافے کا خیال بھی راسخ تھا- آبادی جب اس طرح بے ہنگم طور پر بڑھتی ہے تو اپنے ساتھ بہت سی ناپسندیدہ چیزیں بھی لے کر آتی ہے- ہر دو برادریوں کے کچھ ان جھک قسم کے نوجوانوں نے پہلے آس پاس کے دوسرے دیہات سے منگوا کر پینی شروع کی اور پھر آہستہ آہستہ علاقائی پولیس کے تعاون سے گاؤں کے اندر دو تین بھٹیاں کھل گئیں- بات یہیں تک محدود نہ رہی بلکہ اکثر رات کے وقت اور کبھی کبھی دن میں بھی آؤٹ ہو کر ان نوجوانوں نے گلیوں محلوں اور چوکوں چوراہوں میں غل غپاڑہ شروع کر دیا- ماسٹر منیر بھی اندر ہی اندر ان نوجوانوں سے رابطے میں تھے مگر انتہائی خفیہ ہونے کی وجہ سے اُن کے بارے میں کسی کو کچھ پتہ نہ تھا- اُن کا نام تو اس وقت نکلا جب اُن کے رشتے کی مسکین کنواری بھتیجی کو تین ماہ اوپر ہو گئے اور چوری چوری دایوں کی منتیں شروع ہوئیں-

ہر دو غالب برادریوں کے مرد اور عورتیں آپس میں تو جو کرتے تھے وہ کرتے ہی تھے مگر اب اُن کی دسترس سے اقلیت بھی محفوظ نہ رہ سکی- پہلا حملہ نگینہ پر ہوا، جیرو کی نگینہ پر، نگینہ واقعی نگینہ تھی مگر مٹی، گوبر اور راکھ میں کھویا ہوا نگینہ، اُس کی انگریزوں جیسی گوری رنگت اور بھورے بالوں کی وجہ سے پہلے ہی بستی کے لوگوں کو اُس کے ماں باپ پر شک تھا- بیچاری نے اپنے دریدہ دوپٹے اور اونچی شلوار میں اپنے سینے اور ٹخنوں کو لاکھ ڈھانپنے کی کوشش کی مگر دیکھنے والے بھی قیامت کی نظر رکھتے تھے- ایک دن ایک زمیندار کے منہ زور بیٹے کی نظر اس پر ایسی پڑی کہ بات زور زبردستی تک چلی گئی- دھکم پیل میں اُس کی عزت تو بچ گئی مگر وہ گاؤں میں کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہ رہی- جیرو جس قدر انگلو والا تھا اُسی قدر غریب اور کمزور- تین دن تک وہ گھر سے باہر نہیں نکلا اور چوتھے دن اُس نے اور نگینہ نے اپنے دونوں چھوٹے بچوں کا ہاتھ پکڑا اور منہ اندھیرے گاؤں کو ہمیشہ کیلئے خیرباد کہہ گئے-

سید زادے اور چودھری زادے گاؤں کی خود کشید کردہ دیسی شراب پی پی کر تنگ آ چکے تھے- ویسے اب یہ بات بھی اُن کے علم میں آ چکی تھی کہ دیسی شراب اگر کچی رہ جائے تو زہریلی بھی ثابت ہو سکتی ہے اور مزید یہ کہ دیسی شراب جگر اور گردوں کو سخت نقصان پہنچاتی ہے- انہوں نے پروگرام بنایا کہ اس ضمن میں چاچا سوہنا اور چاچا موہنا کی خدمات حاصل کی جائیں- اُن کو قانونی اجازت تھی کہ وہ پرمٹ بنوا سکتے تھے اور پھر ان پرمٹوں پر بڑے ہوٹلوں وغیرہ سے اچھی سے اچھی خرید سکتے تھے- چودھریوں کے کچھ مشٹنڈے جوانوں نے انہیں بہتیرے لالچ دیئے مگر وہ غریب ایسے کام کے کبھی قریب بھی نہ پھٹکے تھے- اُنہوں نے لاکھ قسمیں دیں کہ یہ کام ہمارے مذہب میں بھی جائز نہیں مگر اُن کی التجا کسی نے نہ سنی اور جب وہ بالکل ہی تیار نہ ہوئے تو کچھ اوباش جوانوں نے شام لگے بانس کے ڈنڈوں سے اُن کی ہڈی پسلی ایک کر دی اور انہیں صبح سے قبل گاؤں چھوڑنے کا حکم دیا- اگلی صبح عیسائیوں کی بستی میں صرف ایک گھر سے اپلوں کی آگ سے دھواں اٹھ رہا تھا- جہاں چور، اُچکے اور بدقماش لوگوں کی بڑھوتری ہوئی وہیں نئی نسل میں مذہبی رجحانات بھی خوب پروان چڑھے- اب گاؤں میں اچھا خاص کر ایک گروہ اس بنیاد پر تشکیل پا چکا تھا جو مذہب مخالف اشیاء پر پوری طرح نہ صرف نظر رکھے ہوئے تھا بلکہ بزور ایسے معاملات کو روکنے کی پوری اہلیت بھی رکھتا تھا- بابے عامے کو ایک دن پتہ نہیں کیا خیال آیا کہ اُس نے اپنے ہارمونیم اور طبلے سے دھول صاف کی اور بچتسمہ لے کر اور صاف چادر پر بیٹھ کر عبادت میں مصروف ہو گیا- مخالف آبادی کے کانوں سے جب موسیقی کے سُر ٹکرائے تو ایک ہنگامہ اٹھ کھڑا ہوا - کہیں گیا ہارمونیم اور کہیں گیا طبلہ- بابے کو اپنی جان بچانا مشکل ہو گیا- رات گئے تک منت سماجت اور مذاکرات کے نتیجے میں بستی کے کرتا دھرتا لوگوں نے یہ فیصلہ کیا کہ بابا عاما پو پھٹنے سے پہلے بستی کو چھوڑ دے، اور کہیں اپنے جیسے لوگوں میں جا کر اپنے طریقہ عبادت کو اختیار کرے- اور پھر اگلی صبح تینوں گھروں کے چولہے ٹھنڈے تھے اور کہیں سے بھی دھواں نہ اُٹھ رہا تھا-

- قطعہ -

تلاشِ قائد

پھر ملے گا کب کوئی اقبالؔ و قائدؔ سا ہمیں
جو ہمیں لے جائے اپنی منزلِ مقصود پر
یعنی اسلامی، فلاحی اور مثالی مملکت
جس کی ہر لمحہ نظر ہو قوم کی بہبود پر

حافظ محمد احمدؔ
(راولپنڈی)

اُستاد!

گلزار جاوید

(راولپنڈی)

حافظہ کوٹٹولنے' کھنگالنے کے باوجود بھی اُستاد کا نام اُبھر کر نہیں آتا۔ خیالات کا دھارا' گدلے پانی کی مانند' کثافت پیدا کر کے ذہنی اُفق کو اور دھندلا دیتا ہے۔ اُستاد کا ذکر کہاں سے شروع کریں! جب سے یادداشت پیروں ٹھمکنا شروع ہوئی تب سے اُستاد کا نام' ہماری یادوں سے نتھی ہو گیا۔ بچہ' بڑا' بوڑھا' جوان' عورت' مرد' محرم' نامحرم حتیٰ کہ علاقہ کا اکلوتا ہیجڑا' حمیدا بھی اُستاد کو' اُستاد کہہ کر ہی پکارتا تھا۔ نہ اُستاد کو اضافی آداب و القاب کی ضرورت تھی نہ وہ مخاطب کے مراتب کا خیال کرتے تھے۔ کوئی کہیں سے آیا ہے' کیسا ہی حیثیت والا ہے' اُستاد کی تیوری کے بل' مجال ہے رتّی بھر اپنی جگہ سے جنبش کر جائیں! کالی' پیلی' کتھئی بتیسی میں دبی ادھ جلی بیڑی کا گُل' ہمیشہ آنے والے سے پہلے اُستاد کی توجہ حاصل کرتا۔ بعد میں اُستاد' آنے والے کے سلام کا رُکھائی سے جواب دے کر' اپنے کام میں' گُم ہو جاتے۔

پیشے کے اعتبار سے اُستاد' نَے چے بند تھے۔ نئے نَے چے بنانے کے ساتھ پرانے نَے چوں کی مرمت اور صفائی بھی کیا کرتے تھے۔ اسی سے اُستاد کا حلوہ مانڈا اور گھریلو اخراجات پورے ہوا کرتے تھے۔ دکان داری کے علاوہ کئی طرح کا کارِ خیر بھی اُستاد کی مصروفیات میں شامل تھا۔ مثلاً اُستاد اپنے وقت کے نامی گرامی پہلوان تھے۔ اپنی زندگی میں اُستاد نے کبھی کوئی دنگل ہارا نہ تھا۔ اُستاد نے کبھی کوئی کُشتی تین منٹ سے زیادہ نہ لڑی تھی۔ پلک جھپکنے سے پہلے' جھکائی دے کر مخالف کے پٹے سُوتنا اور چھاتی پر چڑھ بیٹھنا' اُستاد کا مشہور داؤ تھا۔ قینچی بھی اُستاد غضب کی لگایا کرتے تھے۔ دھوبی پٹرے کے بعد تو اپنے حریف کی ایسی سِٹّی گُم کرتے کہ اُس کی سمجھ میں نہ آتا کہ کب وہ اکھاڑے میں اُترا' کب اُستاد سے ہاتھ ملایا' کب اُستاد نے پٹے سُوت کر اُسے چاروں شانے چِت کر ڈالا!

گو اُستاد کو اکھاڑا چھوڑے ایک زمانہ گذر گیا تھا پھر بھی اُن کی اُستادی کی دھوم قائم و دائم تھی۔ نوعمر اور نوخیز پٹھّے' اُستاد کی مہارت اور تجربہ کے زور پر اب بھی میدان مار رہے تھے اور اُستاد کے نام کے جھنڈے گاڑ رہے تھے۔ اُستاد کے ٹھیئے پر گاہک سے زیادہ نوعمر و نوآموز پہلوانوں کا جمگھٹا دکھائی دیتا تھا۔ ہر وقت دنگل' کُشتی' زور' سانس ایک دوسرے کے ڈنڈ بیٹھک کی تعداد' چھاتی کی چوڑائی' ران کی موٹائی' بازو کی گولائی' بازو پھُلانے کے بعد اُبھرنے والے گومڑے کی پھڑ پھڑاہٹ کے علاوہ ''ہریا'' کی دکان سے ایک ہی سانس میں زیادہ سے زیادہ دودھ پینے اور مکّا مار کر گُلّڑ توڑنے کے مقابلے پر زوردار بحث و تمحیث ہوا کرتی۔ آخری فیصلہ اُستاد کی رائے پر ہوا کرتا۔ کبھی کبھی' اُستاد کی ڈانٹ پر ساری بحث ہی ختم ہو جاتی۔

تازہ دم پہلوانوں کی منڈلی کو اُستادانہ داؤ پیچ بتانے کے ساتھ' اُستاد! ہڈی' گڈی کے ماہر بھی مانے جاتے تھے۔ منٹوں میں جوڑ سے جوڑ ملا کر نس سے نس اُتار کر' اُترا ہوا ٹخنا چڑھا کر' چیختے دھاڑتے آدمی کو ٹانٹا کر دیا کرتے تھے۔ بہت سے لوگ اُستاد سے ناف ملوانے بھی آیا کرتے تھے۔ ناف ملنے کا کام اُستاد صبح سویرے کرتے تھے۔ بعد از فجر چادر بچھا کر بیٹھ جاتے اور ہر آنے والے سے' اُس کے نہار منہ ہونے کا دریافت کرتے۔ ناف چڑھانے کے بعد چڈّھے حلوائی سے' حلوہ پوری کھانے کی تاکید کیا کرتے تھے۔ کہتے ہیں! اُستاد کی حکمت کے باعث چڈّھے حلوائی کا کاروبار خاصا چمک گیا تھا۔ احساس تشکّر کے باعث چڈّھا' اُستاد اور اُن کے مہمانوں کی تواضع' حلوہ پوری اور مٹھائی وغیرہ سے مفت کیا کرتا تھا۔ اُستاد جب بھی کسی کام کے سلسلے میں چڈّھے کو ہانک لگاتے ''جی اُستاد'' کہہ کر چڈھا اس طرح دوڑا آتا جیسے چابی کا گڈّا!

سات سال سے چودہ سال کے بچوں کا رش بھی اُستاد کے ہاں دیکھنے والا ہوا کرتا تھا۔ یہ رونق جمعرات کے جمعرات لگا کرتی تھی۔ اُس روز' اُستاد بچوں کو ''منہ آنے'' کی دوائی کی پُوڑیاں مفت تقسیم کیا کرتے تھے اور پیلیئے والے بچوں کو مفت گنڈا بنا کر' اپنے ہاتھ سے اُن کے گلے میں پہناتے تھے۔ پہلے آؤ پہلے پاؤ کا اُستاد کے ہاں قطعی رواج نہ تھا۔ جس کو من بھاتا' آواز کے ساتھ اشارے اور چٹکی بجا کر بلاتے....... ''آبے آ' تُو آ گے آ....... ابے تُجھے نیں' وہ تیرے پیچھے' بجّو کڑا اے وِس کو بلا ریا اُوں...... دیک تو سی' سالے کا رنگ کیسا لال بوکا اور یا اے....... ابے کون سی چکّی کا کاوے اے....... سالے روج بہ روج پُول کے کُپّا اور یا اے.......!'' فجی نائی کے لونڈے کے کولہوں پر دھپ مارتے ہوئے اُستاد مخول کرتے اور اپنا کام بھی جاری رکھتے.......

اُستاد کا ٹھیا کھُلتا اپنے وقت پر تھا' بند ہونے کا کوئی وقت مقرر نہ تھا۔ چیلے چانٹوں کی منڈلی جب تک جمی رہتی اُستاد بھی دانتوں میں بیڑی دبائے چہکتے رہتے۔ کبھی کبھی اُستانی کا اصرار بڑھ جاتا تو اُستاد کو گھر بھی جانا پڑتا وگرنہ دو' دروں والی دکان کے پچھلے در کا دروازہ بند کر کے جب جی چاہتا سو رہتے جب جی چاہتا جاگ پڑتے۔ پچھلے در کا کِواڑ بند ہونے کی صورت میں کسی کی مجال نہ تھی جو اُستاد کو نیند سے جگائے یا اُستاد کے آرام و تخلیئے میں دخل دے۔

اُستانی کے ذکر پر آپ سمجھ گئے ہوں گے۔ مراد اُستاد کی بیگم سے ہے۔ شروع شروع میں اُستاد کی عدم توجہ' اُنہیں بہت کھلتی تھی۔ آہستہ آہستہ'

اُستانی تواس رویہ کی عادی ہوگئیں۔ بچے اکثر ماں سے سوال کرتے' اُن کا باپ' گھر کیوں نہیں آتا۔ راتوں کودکان پر کیوں سورہتا ہے۔ بچوں کے چُبھتے سوالوں اور پاس پڑوس کی چہ میگوئیوں سے اُستانی جب اُک جاتیں تو اُستاد کی پسند کا زعفرانی پلاؤاور نرگسی کوفتے پکا کر' اُستاد کو بلا بھیجتیں تب جا کر اپنے ہی گھر مہمان بن کر جاتے' ساتھ میں کوئی منہ چڑھا بھی لے جاتے اور بیگم کے بنائے نرگسی کوفتوں اور زعفرانی پلاؤ کو آستینے چڑھا کر خود بھی کھاتے اور اپنے لگے سگے کو بھی زوردے دے کرناک تک ٹھساتے بھلے ہی بیوی اور بچوں کے لئے کچھ بچے یا نہ بچے!

یوں تو اُستاد سارے چیلے چانٹوں سے ایک سی محبت کیا کرتے تھے۔کھلاتے سب کوسونے کا نوالہ اور دیکھتے قصائی کی نظر سے تھے۔البتہ! ایک نہ ایک پٹھّا ہر دور میں اُستاد کا منہ چڑھا ہوا کرتا تھا جسے اُستاد' داؤ پیچ سکھانے کے علاوہ خصوصی طور پر اکھاڑے لے کر جاتے اور صبح وشام اکھاڑے کی منڈیر پر بیٹھ کر داؤ پیچ سکھاتے اور زور کرانے والوں پر کڑی نگاہ رکھا کرتے تھے۔ اکھاڑے سے واپسی پر' ٹھنڈائی' دودھ جلیبی' حلوہ پوری' مٹھائی یا پستہ والی قلفی کا انتظام و انصرام بھی اُستاد کے ذمہ ہوتا تھا۔ایک طرح سے اُستاد کا یہ منظورِ نظر پٹھّا دیگر تمام پٹھّوں کا سردار ہوا کرتا تھا۔ تمام نوخیز پٹھّے اُستاد کے اِس چہیتے کی خوشنودی حاصل کرنے میں لگے رہتے تھے۔ یہ بانکا سجیلا' جسے اپنا یارِ غار بنالیتا سمجھو اُس کی چاندی ہوجاتی!

فجی نائی کے بیٹے پر اُستاد کی مہربانیاں' زیادہ پرانی بات نہیں۔ کئی دنوں بلکہ ہفتوں سے دونوں اکٹھے دیکھے جارہے تھے۔ کبھی کبھی دنگل اور اکھاڑے سے فرصت ملتی تو اُستاد' بندو کو' تھیٹر اور بائیسکوپ دکھانے بھی لے جاتے۔محرم کے تاشوں اور جنم اشٹمی پر ساری ساری رات' بندو استاد کے ساتھ گھوما کرتا۔ جب رات زیادہ گذر جاتی تو وہ ماں کے ڈر سے گھر نہیں جاتا اور اُستاد کی دکان پر ہی سورہتا۔ ایک بار جاڑے کی سرد رات میں بندو کی ماں نے اُسے گھر سے باہر کھڑا رکھا تھا جس کے بعد تین دن تک بندو بخار میں بھُنتا رہا تھا۔ بیوہ ماں خود کو کوستے نہ تھکتی تھی۔ فجی کی موت کے بعد بندو ہی اُس کا واحد سہارا تھا جسے وہ اس اُمید پر پال رہی تھی کہ بڑا ہوکر بندو باپ کی دکان سنبھالے گا اور گھر کی ذمہ داریوں کے ساتھ بہنوں کے ہاتھ بھی پیلے کرنے کا وسیلہ بنے گا۔

☆

خبر کئی دنوں سے گردش میں تھی۔ ہر بار اُستاد کے اَدھڑے چہرے پر اس خبر کے سنتے ہی حریصانہ چمک نمودار ہوتی تھی۔ آج تو گُلن نے دھما کہ ہی کر دیا۔ منشی سخاوت علی کا لحاظ نہ ہوتا تو اُستاد' نَے چے وچے چھوڑ' قیمتی سے قیمتی حقّہ پٹک کر بھی چمپت ہوجاتے۔ منشی سخاوت علی کا شروع سے یہ وتیرہ تھا جب بھی اُنھیں اپنے حقہ کا نَے چا بنوانا ہوتا پہلے اُستاد سے پوچھنے آتے۔ ''اُستاد فارغ کس وقت ہوگے۔'' ''میاں فارگ وارگ کی بی کوب کوئ او' منسی جی جس وکت تمارا جی چاوے آجئیو تماری اپنی دکان اے۔ میاں! ام تو کا دم ایں تمارے۔''

منشی سخاوت علی پڑھے لکھے خاندانی آدمی تھے۔ رکھ رکھاؤ میں خاندانی وقار کو بڑی اہمیت دیتے تھے۔ اُن کے خیال میں انسان کا رہن سہن اور استعمال کی اشیا سے ہی اُس کے خاندانی پن کا پتا چلتا ہے۔ بال بال قرضے میں بِندھنے اور خاندانی جائداد گروی ہونے کے باوجود منشی سخاوت علی ہمیشہ کی مانند اب بھی دوگھوڑے مارکہ بوسکی کا شیروانی کالر کُرتا' چابی مارکہ لٹھے کا علی گڑھ کٹ پاجاما اور سر پر رامپوری مخمل کی کالی ٹوپی کے علاوہ پیروں میں عراق کی بنی ہوئی کالی پمپی پہن کر' بازار سے جب بھی چیڑ میڑ کرتے گذرتے تو مسلمانوں کے علاوہ ہندوؤں پر بھی اُن کی خاندانی وجاہت کا بڑا رعب پڑتا۔ منشی سخاوت علی کے پاس اپنے اجداد کی نشانی چاندی کا نقشین حُقّہ اب بھی موجود تھا جس کا نَے چا بنوانے گاہ بہ گاہ وہ اُستاد کے پاس آیا کرتے تھے۔ نیلے' پیلے یا سرخ رنگ کے دھاگے کے بجائے کالے رنگ کا ریشمی دھاگہ اور چاندی کے تار سے حُقّے کا نَے چا بندھواتے۔ کام کے دوران نہ جانے کتنی بار اُستاد کو نفاست کی تاکید کرنا نہ بھولتے اور اُستاد کو خوش رکھنے کے لئے اُن کی جوانی کے قصّے یاد کر کے اُستاد کو داد دیتے رہتے اور کام کی نگرانی کرتے رہتے تھے۔ اس طرح اُستاد کے ہاتھ تیز اور زبان آہستہ چلتی تھی۔

☆

گلی تنگ اور بدبودار تھی۔ جگہ جگہ سے کھڑنجے کی اینٹیں اُکھڑی ہوئی تھیں۔ بہت سے گھروں سے بہنے والے پرنالوں کا ٹین گل سڑ گیا تھا۔ دیواروں پر میل اور کائی کی آڑی ترچھی تہیں جمنے کے ساتھ گندے پانی کے چھینٹے' راہ گیروں پر پڑا کرتے تھے۔ بہت سے گھروں کا رنگ وروغن اُڑ چکا تھا۔ بہت سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھے۔ کچھ گھروں کی دیواریں چیخ چیخ کر چونا طلب کر رہی تھیں۔ کچھ کی دیواروں میں لگی اینٹیں طبعی عمر سے گذر کر پاؤ' آدھ یا پونی گِھس' بھُر چکی تھیں اس کے باوجود خستہ حال مکان اپنے مکینوں کی سفید پوشی کا بھرم لئے اس طرح کھڑے تھے جس طرح اندر سے شکستہ لوگ' مجبوری یا مروّت میں' زندگی کا بار اُٹھانے پر مجبور ہوا کرتے ہیں۔

گُلن کے بتائے ہوئے پتے کے مطابق گلی کے نکّڑ والا مکان اور کلیجی رنگ کا دروازہ اور دروازے کے درمیان آڑی ترچھی جھری یہ ہی تھی۔ دروازہ کے سامنے میونسپلٹی کا نل اور نل کی ٹوٹی ہوئی ہودی بھی تھی۔ ہودی کے بیچ و بیچ طرح طرح کے برتن رکھنے سے پڑنے والا گڑھا بھی موجود تھا۔ اُستاد نے جی کڑا کر کے' دروازے پر' دھپ دھپ کے تین وار کر ڈالے.......

''کس سے ملنا اے آپ کو.......'' چہرے کے بجائے اُستاد کی نگاہ فیرنی کی دو سکوریوں میں جکڑی گئی۔ پہلے دودھ . . . . پھر ربڑی....... پھر ملائی....... اُستاد کے جنگاسوں میں خارش ہونے لگی۔ آج کی بات تھوڑی ہے' گذشتہ بیس سالوں سے اُستاد، میرن کی لونڈیا مینا کی نشانی

جنگاسوں سے لگائے پھرے ہیں۔

مینا اصلی نام نہیں تھا۔ نام تو نسیم تھا جسے جہالت یا پیار نے بگاڑ کر مینا کر دیا تھا۔ چھوٹے' قد' بھرواں سڈول جسم اور تیز دھار زبان والی مینا' حرّافہ شادی سے پہلے بھی تھی۔ اُستاد سے اُس کا براہ راست ٹاکرا کبھی نہ ہوا تھا کیونکہ کچّی لین پر چلنے والی گاڑی پکّی لین پر چلنے سے کتراتی ہے۔ اس روز اُستاد مینا کے گھر اُس کے بھائی گبُو سے ملنے گئے تھے۔ دروازہ پر مینا مل گئی جس نے چھوٹتے ہی اُستاد کو نظر خراب ہونے کا طعنہ دے ڈالا۔ اُستاد کو بہت غصّہ آیا۔ جواب میں اُستاد نے بھی اَول فَول بک ڈالی۔

''فلانے کی جنی میرے مُومت ایوّ نی تو رِکر رِکری کر کے رک دوں گا....... '' مینا نے جلتی پر پانی ڈالنے کے بجائے تیل چھڑک ڈالا.......

''بوت دیکیں میں نے تیرے جیسے سُورما....... میں نی ڈرنے والی....... '' اُستاد کے پاس دو راستے بچے تھے اوّل اپنی مردانگی کا ثبوت دیتے دوئم نامردی کا لیبل لگوا کر لوٹ آتے....... دھت سے ہاتھ بڑھا کر' کھیر کے دونوں کٹورے یہ کہتے ہوئے بے آسرا کر دیئے....... ''سالی...! کسی مرد سے پالا نی پڑا تیرا....... '' نائن نے اس افتاد کے سامنے دوپٹہ کو ڈھال بنایا اور گھر کے اندر چھلانگ لگا دی....... اُستاد کہاں رُکنے والے تھے....... اُستاد کے ساتھ نائن کی لگائی ہوئی آگ کے شعلے بھی گھر کے اندر تک پہنچ گئے....... نائن نے بڑی قسما دھرمی کی....... بڑا یقین دلایا....... اُس کا مقصد اُستاد کو بے عزت کرنا نہیں وہ تو مذاق کر رہی تھی..... عام نسل کا سانپ' آپ کی مرضی سے آ کر آپ ہی کے کہنے پر واپس بھی جا سکتا ہے..... مگر..... اِچھّا دھاری ناگ......! آتا بھی اپنی مرضی سے ہے اور جاتا بھی اپنی خوشی سے ہے....... دھینگا مشتی پر نائن نے اُستاد کو نظام الاوقات سے ڈرایا . . . . . طرح طرح سے بہلایا....... پھُسلایا....... مگر....... اُستاد.....! اِچھّا دھاری ناگ کا سَر کچلنے میں کامیاب نہ ہو سکے.......!

☆

اب کی بار اُستاد نے دروازہ کھٹکھٹانے کے بجائے....... بندو.... ابے او بندو....... کہہ کر زور زور سے آوازیں دینا شروع کر دیں۔ چھجّے کی اوٹ سے' سترہ اٹھارہ برس کے خوبصورت و خوبرو نوجوان نے سَر باہر نکال کر ''کون اے بے'' کہا اور نیچے کی طرف دیکھ کر لجاجت سے بولا....... ''ارے اُستاد تم....... '' اُستاد نے خون میں اُٹھنے والے بلبلوں کی گدگدی کو دباتے ہوئے کہا....... ''اُستاد کے جنے.......! جری نیچے تو آ....... '' اُستاد نے بندو کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو فراموش کرتے ہوئے گرمجوشی سے گلے میں بانہیں ڈال کر' بندو کے کلّے پر زور سے پیار کیا اور ران پہ ہاتھ مار کے بولے.......

''بیٹا جی کون سی چکّی کا کا کے آئے او....... بوت جان پکڑ لی اے...... کسم الّا پاک کی تیرے بگیر جراجی نہ لگا امارا....... ''جملہ مکمل ہوتے ہی اُستاد کا ہاتھ ایک مرتبہ پھر بے تکلفی پر مائل تھا اُس سے پہلے بندو کی جوان و مضبوط کلائی نے اُستاد کے ہاتھ کو اڑنگی لگا کر بات کا رُخ موڑ دیا....... اُس کے ذہن کی چرخی پیچھے کی جانب رَڑ کنے لگی.......!

''ابے بس کر' لونڈیوں کی طریوں ٹسوے کیوں باریا اے.... سالے....! جس وکت' اُستاد پیارے کان مجھے لے گئے تے' مارے گُوسی کے نیند نہ آوے تی مجے....... کاں اُستاد پیارے کان اور کاں کلی گروں کا لونڈا....... تُو پکر نہ کر' بڑی جلدی تجے نامی گرامی پیلوان بنا دوں گا.......پر تو جی کول کے موج میلہ کیجو....... پر ایک بات یاد رکیو....... عورت جات کے پاس بُول کے بی مت جیئو . . . . مرد کی ساری تاکت کینچ لے ویں سالی.......ابے چل مرا کیوں جا ریا اے....... یہ پیسے لے....... جا موج میلہ کر' کا پی....... اور دیکیو ارام کے جنے اگر کسی سے پُچ کِیا نا..... کسم الّا پاک کی...... گسیڑ کے رک دوں گا....... ''چمکتے لشکتے رامپوری چاقو کو ہوا میں لہراتے ہوئے اُستاد نے جملہ مکمل کیا تھا.......

''بس اُستاد کیا بتاؤں....... بمبئ سیر کیا....جنّت اے جنّت.... میاں....! کام تو واں پہ چٹکی بجاتے مل جاوے.... چا' روٹی اتی سستی....... چار چے آنے میں پیٹ بر جاوے آدمی کا.... اور میاں.... ! لُگائی..... اُستاد....! کدم کدم پہ مکّی کی طریو بنبناتی پرے ایں سالی.......اور اُستاد....! بِنڈی باجار میں تو کسم الّا پا کی دیکنے والا نجارا اوے اے....... بارا بارا' چودا چودا سال کی ایسی ایسی ٹکی اوئی لونڈیا پانچ چے روپے میں مل جاوے اے کہ اتو ڑالے کے بی جاؤ تو سالی کے پیڑے نہ ٹوٹیں....... اور اُستاد....! تم سام کے وکت جو اُو اور چوپاٹی پہ نکل جاؤ تو کسم اے پیدا کرنے والے کی.... نجارے ای نجارے اووِیں....... ایسی ایسی جوان اور کسی اوئی ادنگی لونڈیئں سیر کرتی نجر آویں کہ آدمی' اریان رے جاوے... اور اُستاد....! کیا بتاؤں.......باندرا' اندیری' دادر میں تو یہ سالے بڑے بڑے اداکار کیڑے مکوڑے کی طریو پریں.......ایک دن سُبا ای سُبا' نائی کی دکان پہ' بال کٹوانے چلا گیا میں....... کیا دیکوں سات والی کرسی پہ راج کپور' مونچیں بنوا ریا اے....... میں نے کِیا اجی ام نے تو سنا اے سارے اداکار گر پہ داڑی بناویں....... تم کیوں یاں چلے آئے....... پتا اے اُستاد.......! راج کپور نے کیا کِیا.......بولا....! داڑی تو ام بی گر پہ بناویں..... مونچیں سیٹ کرانے' دُلارے میاں کے پاس جرور آویں.... اُستاد...! میرا جی چاوے تا کہ میں وِس سالے راج کپور کا گر تو دیکوں اُس کے پیچے جا کے مگر وہ نائی کا لونڈا اِتّا ڈیلا تا....... جتنی دیر میں راج کپور کی مونچیں سیٹ اوئیں اُتتی دیر میں' سالا میری کلمیں بی سیٹ نہ کر سکا....... گرم پانی سے بال نرم کر کے چپڑ چپڑ چمڑے پہ اُسترا تیج کرتا رے گیا....... پتا اے اُستاد....! راج کپور نے جیب سے اَٹھنی نکالی اور نائی کو دے کے سور لیٹ میں بیٹ چمپت اولیا....... اُستاد.... ! بڑی دولت اووے اِن سالے اداکاروں

کے پاس.....''

بندو کی غفلت سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے' اُستاد بندو کی گردن میں بانہیں ڈال کر بولے..... ''ابے جاستی بیڑ نہ مار..... سب جانوں اوں میں ..... سب پتا اے مجے..... کتنی بار' سالوں نے بلایا..... کتنی بار' نوتہ بھیجا..... کتنی بار منت سماجت کی..... کیویں تے..... اُستاد.....! ایک بار تم بمبئی میں دنگل کے لئے آگئے تو سارے ریکارڈ ٹوٹ جاویں گے..... بمبئی میں بڑی دُوم اے تمارے نام کی..... میاں.....! تمارے نام پہ تو ساری ایڈنیں دوڑی چلی آویں گی..... میں نے کیا میاں.....! لانت بیجوان پر کٹی کبوتریوں پہ..... میں تو موتابی نی اِن پہ.....''

''بڑی گلتی کی اُستاد تم نے..... کسم الاّ پاک کی نوٹوں کے ڈیر لگ جاتے..... یاں پہ تو کچ بی پیسہ نی اے..... بمبئی میں تو بوریوں میں نوٹ رکّیں لوگ.....'' اُستاد کی بات میں وقفہ آتے ہی بندو نے گرہ لگائی۔

''ابے رینے دے..... بڑے دیکے ایں میں نے نوٹ ووٹ..... چوڑان فجول باتوں کو..... کام کی بات کر کام کی..... تُو یہ بتا ملنے کا کب ارادا اے.....؟'' اُستاد کے اچانک اور دوٹوک سوال پر بندو چونک پڑا' جب وہ بولا تو اُس کی آواز میں پہلے والی اُٹھان نہ تھی..... ''میاں چوڑو بی..... کوئی اور بات کرو..... سناؤ اُستانی کا کیا آل اے..... بچے کیا کریں.....''

''دیک بے بندو.....! جادا سُر تا نہ بن ..... آنا کانی کسی اور کو دیجو..... بیٹا.....! اُستادوں سے اُستادی نی چلتی..... سیدی طریو بتا' ملنے کا ارادا اے کے نی.....'' اُستاد کے لہجہ میں غصہ کا ترشح نمایاں تھا جسے بندو نے محسوس تو کیا لیکن اُستاد کو براہ راست جواب دینے کے بجائے تیکھی نظروں سے اُستاد کے سراپا کا جائزہ لیتے ہوئے بولا.....! ''اُستاد.....! ابی تو آیا اُوں..... پر کبی دیکیں گے.....'' ''نہ میری جان.....! ٹال مٹول سے کام نی چلے گا..... تجے کیا پتا.....! تیری جدائی کے دن' یاراوروں نے کس طریو کاٹے ایں..... کل مجے کا دن اے..... یار جی دکان بند کر کے جُتا پڑنے جاویں گے اور میجد سے سیدے تجے لینے آویں گے..... بڑے دن باد' ایدر کی اَلیم بریانی اور نعیم پیلوان کی نان کتائی کاویں گے..... سام کو پُر واپیاج علی میں بُورے پیلوان کی کس کاس والی چاپی کے بینسالی پہ گُو میں گے..... سمج گیا اچی طریو پر سمجاؤ.....'' بندو سپاٹ چہرہ لئے کھڑا تھا..... اُستاد کی تاکید پر ''جی اُستاد'' کہہ کر ''سلاوالیکم'' کہا اور تیزی سے سیڑھیاں چڑھ گیا.....

☆

تیسری آواز پر بندو نمودار ہوا تو اُستاد کی نظر بندو پہ ٹک کے رہ گئی۔ بندو نے ٹیرالین کی کالی چست پینٹ پر نارنجی شرٹ پہن رکھی تھی جس کی آدھی آستینوں سے بندو کے بازو کی مچھلیاں پھڑک کر باہر آنے کو بے چین تھیں۔ سڈول رانیں اور اُبھرے ہوئے کولہے ہر قدم پر اس طرح لیفٹ رائٹ کر رہے تھے جیسے طبلے کی تھاپ پر رقص کر رہے ہوں۔ چہرہ کی لالی اور اُس پر جوانی کی چمک کھلتے ہوئے تازہ گلاب کی کیفیت پیدا کر رہے تھے۔ تازہ بھیگتی مسیں' مردانہ وجاہت کو نمایاں کر رہی تھیں..... ''وا بیٹا وا.....! کوب جوانی چڑی اے تجے..... کیا کاوے تا واں پہ.....مُو سے ای کاوے تا نا.....!'' آخری جملہ مکمل کرتے ہوئے اُستاد نے بائیں آنکھ دبا کر بندو کے کولہے پر چٹکی کاٹی تو بندو نے ناگواری سے اُستاد کو پیچھے کی جانب دھکیل دیا۔ بندو کے ہلکے سے دھکے پر اُستاد گرتے گرتے بچے..... ''ماف کرنا اُستاد'' کہہ کر بندو نے اُستاد کو تھاما تو بندو کو لگا کہ وہ اُستاد کو نہیں کسی بوڑھے شخص کو گھسیٹ رہا ہے.....

بندو نے غیر محسوس طریقہ پر اُستاد کے سراپا کا جائزہ لیا تو اُسے اُستاد کے ڈھانچے میں کافی تبدیلی محسوس ہوئی۔ چہرہ پہلے کی نسبت کافی ڈھلک چکا تھا۔ ناک کے دونوں جانب' موٹی سلوٹ پڑنے کے باعث گال نیچے کو لٹک گئے تھے۔ چھاتی کی چوڑائی بھی پہلے سے کم اور بازوؤں کی مچھلی کا اُبھار اور بھی کم ہو چکا تھا۔ ہاتھ کی نسیں بھی اُبھر آئی تھیں۔ ہاتھوں پر گوشت کی بجائے کھال ہی باقی بچی تھی وہ بھی خزاں رسیدہ ہو چکی تھی۔ دانت بھی اُستاد کے پورے نہ بچے تھے جتنے باقی بچے تھے اُن کے درمیان خلا زیادہ ہونے کے باعث اُستاد کی آواز میں پہلے سی کڑک نہ رہی تھی..... رکشہ کے انتظار میں کھڑا رہنے کے بجائے' دونوں نے پیدل چلنا شروع کیا تو بندو نے محسوس کیا کہ اُستاد پہلے کی طرح تیز اور بڑے قدم اُٹھانے کے بجائے آہستہ روی سے چل رہے ہیں پھر بھی اُن کا سانس ہموار نہیں ہے.....

☆

''ابے کیا سونچ ریا اے..... کا تا کیوں نی.....'' اپنی پلیٹ سے' ران کی گول بوٹی' بندو کی پلیٹ میں ڈالتے ہوئے اُستاد نے بندو کو ٹوکا تو بندو کو احساس ہوا کہ کھانے سے زیادہ اُس کا دھیان' سامنے والے چھجے کی جانب ہے۔ آج سے پہلے جب جب بندو اُستاد کے ساتھ' حیدر کی حلیم بریانی کھانے آیا کرتا تو پردے کے پیچھے سے دو نسوانی آنکھیں اُس کی توجہ کا مرکز ہوا کرتی تھیں۔ باوجود کوشش کے بندو کبھی اُس حسینہ کا چہرہ نہ دیکھ سکا۔ بس اتنا ضرور جان سکا کہ اِن بے چین و بے قرار آنکھوں کا مرکز سامنے والی پتنگ کی دکان ہے جہاں بیس بائیس سال کا بھولا بھالا وجیہہ نوجوان' ایک نظر سامنے والے چھجے پر اور ایک سامنے بیٹھے بوڑھے باپ پر ڈال کر' پتنگ بنانے میں مصروف رہتا تھا۔ وقفہ وقفہ سے' نوجوان کی مشتاق آنکھیں اسی طرح نیچے اوپر کی ورزش میں مصروف رہتیں تھیں۔ بندو کے دل میں' بڑی شدّت سے یہ خواہش اُبھری کہ وہ حیدر حلیم والے سے' پردہ کے پیچھے والی لڑکی اور پتنگ کی بند دکان کی بابت دریافت کرے۔ اُس نے حیدر سے بات کرنے کے لئے منہ بھی کھولا مگر دائیں بائیں کھڑے سات آٹھ گاہکوں کی موجودگی نے اُس کو اپنے ارادے سے باز رکھا.....

''ابے بندو کیا بات اے.....؟ تُو جب سے آیا اے.....بڑا چُپ چُپ اے.....بیٹا.....! بمبئی میں کوئی گُل تو نی کِلا آیا.....'' ''چوڑو اُستاد.....فجول باتیں مت کرو..... میرا کیال اے اب چلنا چاہیئے..... رات بوت اوگئی اے.....امّاں انتجار کررہی اوگی.....'' ''وابیٹا وا.....! یار جی کی رات برآنک نہ جھپکی اور تجے' اماں یاد آری اے.....چُپکا او کے چلا چل نی تو سالے کی کنپٹی سیک کے رک دوں گا.....''

جملہ مکمل کرتے ہی اُستاد آگے آگے اور بندو پیچھے پیچھے چل پڑے۔ سڑک پر آتے ہی کئی نئے پرانے سائیکل رکشہ' ایک ساتھ آکر رُکے۔ اُستاد سوچ ہی رہے تھے کہ کون سے رکشہ میں بیٹھیں اور کون سے میں نہ بیٹھیں' تیسرے نمبر کے رکشہ والے نے اُستاد کو پہچان کر اونچی آواز میں ''سلاوالیکم اُستاذ'' کہا تو اُستاد خوشی سے اُچھل پڑے..... ''لے بے بندو! یہ تو اپنا سبراتی نکل آیا..... اب تو یار جی اسی کے رسکے میں جاویں گے.....''

☆

حسب سابق' اُستاد کی دکان کے باہر' آوارہ کُتّوں کا جھمگٹا لگا ہوا تھا۔ ہمیشہ کی مانند' اُستاد کو دیکھ کر سبھی کُتّے آہستہ آہستہ تتّر بتّر ہونے لگے۔ ایک کُتّا جم کر اپنی جگہ کھڑا رہا۔ جُوں جُوں اُستاد اُس کے نزدیک ہوئے اُسی رفتار سے اُس کی دُم ہلنے لگی۔ مدت سے یہ کتّا اُستاد کا رفیق اور اُن کی دکان کا رکھوالا تھا۔ نہ جانے کب سے اُستاد کی دکان کے باہر ڈیرہ جمائے بیٹھا تھا۔ جس وقت یہ نیا نیا آیا تھا تو علاقہ کے کتوں پر اس کا بڑا رعب تھا۔ جسیم ہونے کے ساتھ' دانتوں اور پنجوں کا تیز ہتھیار بھی اُس کی دہشت کا سبب تھے۔ اُستاد کی دکان سے ملنے والے راتب کے ساتھ دکان سے ذرا ہٹ کر کوڑے کے ڈھیر سے ملنے والا مال متاع اُس کی شکم سیری کا ذریعہ تھے۔ عمر بڑھنے اور وقت گذرنے کے ساتھ محلے کے کُتّوں پر اُس کا رعب کم ہوتا جا رہا تھا۔ مقابلے میں بہت سے تندرست و توانا کُتّے آ گئے تھے۔ اُستاد کی ہلہ شیری نے اُس کی سرداری کا بھرم قائم رکھا ہوا تھا.....اپنے لاڈلے کو پچکارنے اور محلے کے دیگر کتوں کو گالیوں کی چاند ماری سے للکارنے کے بعد' دو تین مرتبہ کھنکار کر اُستاد نے گلہ صاف کرنے کی کوشش کی۔ ناکامی کے بعد' چھاتی کا پورا زور صرف کر کے' فیصلہ کُن انداز میں گلے کے پمپ پر کھنکار کا ایک اور ہتھوڑا مارا حلق سے بلغم کی زردی اُگلی اور کُرتے کی دائیں جیب سے دکان کی چابیوں کا گچھا نکال کر' بندو کی طرف اُچھالا اور خود تہہ بند اوپر کر کے پیشاب کرنے کی غرض سے دکان کے سامنے بہنے والی نالی کے کنارے بیٹھ گئے.....

☆

دکان کے پچھلے در کا دروازہ بند ہوتے ہی' کتوں کی منڈلی کُوں کُوں کر کے پھر سے جمع ہونا شروع ہوگئی۔ کوڑے کے ڈھیر پر' تلاشِ رزق میں سبقت لے جانے میں سارے کتے ایک دوسرے پر جھپٹنے لگے..... چھینا جھپٹی کی اس دوڑ میں' اُستاد کا چہیتا' تنومند اور توانا کتوں سے مقابلہ نہیں کر پا رہا تھا..... بہت محنت اور جدوجہد کے بعد اس کے ہاتھ کوئی ہڈی بوٹی لگنے لگتی تو تندرست و توانا کتے دھکیل کر اُسے پرے کر دیتے.....

بظاہر پسپائی اُس کا مقدر لگ رہی ہے..... بوڑھا کتا ابھی ہمت نہیں ہارا..... نوجوان و نوعمر کتوں کی منہ زوری کے باوجود..... حلق سے خوفناک آوازیں نکال کر اپنا حصہ حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہے..... نوجوان کتے' اُس کی چالاکی و عیاری کو طاقت کے زور پر ناکام بنا رہے ہیں..... بوڑھا کتا ارادے کا مضبوط ..... مگر..... جسمانی توانائی اُس کا ساتھ نہیں دے رہی ..... کم از کم وہ..... پسپائی کے نام سے ناآشنا ہے..... غصہ اور جھنجھلاہٹ میں حلق سے عجیب و غریب آوازیں برآمد ہو رہی ہیں..... کوئی ہے جو وقت کی انہونی کو ٹالے.... گلے سے نکلنے والی آوازوں میں غصہ کے ساتھ کرب نمایاں ہو رہا ہے.....

رات تیزی سے ڈھل رہی ہے..... نوعمر و نوجوان کتّوں کا جنون بڑھتا جا رہا ہے..... رات کی سیاہی نے پسپائی کا اعلان کر دیا ہے..... ڈھلتی عمر کا کتّا تیزی سے ڈھلوان پر پھسلنے لگا ہے..... رات اور بھیگ گئی ہے..... مقابلہ اور سخت ہو گیا ہے..... حکمت پر طاقت غالب آ رہی ہے..... ادھر سے فیصلہ کُن وار ..... اُدھر سے بھرپور جواب .....ایک کی اڑنگی..... دوسرے کی جھکائی.....اس کا بازو.....اُس کی گردن.....نوجوان کتّا بزرگ کتّا ..... نوجوان ..... بزرگ ..... کتا..... آدمی ..... آدمی..... کتّا.....

☆

کُت..... تا..... آ..... می..... آ..... می..... کُت..... تا..... کتّا..... کتّا..... کتّا..... آدمی..... کتّا!!!

تین درجن ادبی کتابوں کے تخلیق کار

معروف ادیب، شاعر، نقاد، محقق

ڈاکٹر جمال نقوی

کی ۲۰۱۴ء کی کتاب

روشن راہیں

(کالموں کا مجموعہ)

پبلشر: ادارہ تزئین دانش، کراچی

فون: 021-36631095

''کوئے قاتل''

منظر ایوبی

(کراچی)

کر دیا یاروں نے مشکوک وفاداری کو
آپ بھی طاق پہ رکھ دیں مری غم خواری کو

جس کو دیکھو وہ بغاوت پہ تُلا بیٹھا ہے
کوئی تیار نہیں پاسِ وضع داری کو

تم نے تاریخ سے سیکھا ہی نہیں کوئی سبق
تم ذہانت ہی سمجھتے رہے عیّاری کو

کیا تجھے ردِ عمل کا کوئی اندازہ نہ تھا
کیوں بنایا تھا نشانہ مری خود داری کو

عشق ہے عشق یہ بچوں کا نہیں کھیل کوئی
تم کھلونا ہی سمجھتے رہے دل داری کو

خوں بہا چاہیے اپنوں کا مجھے حیلہ گرو!
تم حوالہ نہ بناؤ مری ناداری کو

نذرِ فن ہوتا ہے خوں بابِ سخن کھلنے تک
لوگ آساں سمجھتے ہیں قلم کاری کو

ہم فقیروں کے لیے شاہ سے اچھے ہیں یہ لوگ
بھول کر بھی نہ بُرا کہہ کسی درباری کو

کوئے قاتل کی تڑپ سب کے دلوں میں ہے مگر
کوئی آگے تو بڑھے قافلہ سالاری کو

لوگ جب بیٹھے رہیں چھپ کے کمیں گاہوں میں
کون آمادہ ہو پھر کارِ جہاں داری کو

○

سید مشکور حسین یاد

(لاہور)

معنی تو تحریر میں آگے پیچھے ہوتے رہتے ہیں
ہم اپنی تصویر میں آگے پیچھے ہوتے رہتے ہیں

اصل میں ہم تقدیر کو آگے پیچھے کرتے ہیں
کہنے کو تقدیر میں آگے پیچھے ہوتے رہتے ہیں

اپنا ہاتھ بڑا ہے اُجالوں کی ترتیب میں کیا کہیے
صُبح کی ہر تنویر میں آگے پیچھے ہوتے رہتے ہیں

اُتنی ہی تقدیر بھی آگے پیچھے ہوتی رہتی ہے
جتنے ہم تدبیر میں آگے پیچھے ہوتے رہتے ہیں

دشتِ بلا میں گونجتی ہیں اُن کی آوازیں مثلِ دعا
دیوانے زنجیر میں آگے پیچھے ہوتے رہتے ہیں

دشت کا دشت اِدھر کا اُدھر چلتا رہتا ہے ہمارے ساتھ
اکثر ہم اکسیر میں آگے پیچھے ہوتے رہتے ہیں

رسوائی یا شہرت ایسی کوئی علیحدہ چیز نہیں یادؔ
ہم اپنی تشہیر میں آگے پیچھے ہوتے رہتے ہیں

○

نقشبند قمر نقوی بخاری
(امریکہ)

اے محفلِ وفا تجھے ایسا کمال دوں
اک ماہتاب دل کے شبستاں میں ڈال دوں

گر نخل آرزو سے ملے شوق کا عصا
دریائے ہجر میں کوئی رستہ نکال دوں

ہر زخم میرے جسم کا اک یادگار ہے
کیا فائدہ انہیں میں غمِ اندمال دوں

ملتا ہے انتہائے نگارش کا مرتبہ
جس شرحِ آرزو کو میں حسنِ خیال دوں

اس فلسفے کا میں کبھی قائل نہ ہو سکا
نیکی کروں اور اس کو بھی دریا میں ڈال دوں

عمر رواں قسم ہے ذرا دیر ٹھہر جا
چلتا ہوں بس یہ پاؤں سے کانٹے نکال دوں

○

آصف ثاقب
(بوئی، ہزارہ)

کتنی صد چاک رہی ہیں آنکھیں
غم سے نم ناک رہی ہیں آنکھیں

ان کا رشتہ ہے زمینوں سے مگر
ہفت افلاک رہی ہیں آنکھیں

حُسن کے سچ میں ملوّث ہو کر
جھوٹ سے پاک رہی ہیں آنکھیں

میرے چہرے سے اُجاگر کیا ہوں
اب یہاں خاک رہی ہیں آنکھیں

جانے کیوں آج جُھکی جاتی ہیں
کبھی بے باک رہی ہیں آنکھیں

صید اشکوں کے بھرے تھے ان میں
کبھی فتراک رہی ہیں آنکھیں

ان سے گلزار اُگے ہیں ثاقبؔ
آج تک راکھ رہی ہیں آنکھیں

○

پروفیسر خیال آفاقی
(کراچی)

''غزل نما''

مجھ کو بازارِ خرد میں جان و دل کی ہے تلاش
اور کوئی کہہ رہا ہے ''مُشتری ہشیار باش''

عقل کی عیّاریوں پر سے نہ یوں پردہ اُٹھا
اے جنوں اچھا نہیں کرنا کسی کا راز فاش

جذبۂ صادق کی ہے مرہون منّت جوئے شیر
صرف شیشے سے کہیں کوہ گراں ہوتا ہے پاش!

چوٹ جب پڑتی ہے دل پر تب کہیں بنتا ہے دل
کیا نظر آتی ہیں پتھر کو ہیرے کی تراش

قیس کو راس آ گئی ہے شہر کی آب و ہوا
چھوڑ دی ہے دشت نے بھی اپنے مجنوں کی تلاش

شمع روشن اس تمنا میں ہے شاید اشکبار
اس کے سینے میں بھی پروانے کا دل ہوتا ہے کاش!

اپنے اپنے ظرف اور احساس پر ہے منحصر!
پھول کی پتّی سے بھی پڑ جاتی ہے دل پر خراش

کہہ رہے ہیں مجھ سے یہ ننھے فلسطینی شہید
ہم سے پہلے دفن کرو ملّتِ بیضا کی لاش

حق پرستی اُٹھ گئی دنیا سے لیکن آج بھی
کیوں نظر آتا ہے باطل کی صفوں میں ارتعاش

تیری اور میری غزل میں فرق ہے اتنا خیالؔ
تیرا نغمہ لیلیٰ لیلیٰ، میرا نغمہ نان و آش

مہندر پرتاپ چاندؔ
(انبالہ، بھارت)

دھو گئی چہروں سے گردِ یاس کا غازہ ہَوا
کر گئی افسردہ رُوحوں کو ترو تازہ ہَوا

لاکھ بیٹھو چھپ کر اپنے بند کمروں میں، مگر
توڑ کر آ جائے گی ایک ایک دروازہ ہَوا

صبح، آنچل کی ہَوا دے کر کِھلاتی ہے جسے
شب کو بکھراتی ہے خود اُس گل کا شیرازہ ہَوا

تھا کبھی اِس کی بدولت میرا آوازہ بلند
کَس رہی ہے آج آوازے پر آوازہ ہَوا

ناپنے نکلی ہے شہرِ دل کی وسعت کو مگر
کیا لگا پائے گی میرے غم کا اندازہ ہَوا

بھر چلے تھے زخم جو، پھر سے لگے منہ کھولنے
کچھ پرانے درد لے کر آئی ہے تازہ ہَوا

جی ترستا ہے پھر اُن لمحوں کو جب تھے سب بہم
رقصِ مَے، بُوئے سمَن، رنگِ شفق، تازہ ہَوا

ہم تو اپنی خانہ ویرانی کا ماتم کر چکے
دیکھ جا کر اب تُو کوئی اور دروازہ ہَوا

وہ لطافت، وہ مہک کیوں چاندؔ! یکسر کھو گئی؟
بھر رہی ہے کن خطاؤں کا یہ خمیازہ ہَوا؟

○

غالب عرفان
(کراچی)

دیکھے گا کوئی طرّہ ِ دستار کہاں تک
مہکے گی تری خوشبوئے کردار کہاں تک
اُس حُسن سراپا کی تمنا کے مقابل
ٹھہرے گا مرے عشق کا پندار کہاں تک
جس روشنیِ فکر میں مل جائے وہ چہرہ
ڈھونڈے گا مرے ذہن کا پُرکار کہاں تک

تنہائی سے گھبرا کے نکل آؤ تو دیکھو!
لے جائے گا یہ حُسن کا بازار کہاں تک
تہذیب کا اک دور تو مٹتا ہوا دیکھا
بہلائیں گے تاریخ کے آثار کہاں تک
ناقدریِ تہذیب و ثقافت سے اُلجھ کر
زندہ بھی رہے کیسے قلم کار کہاں تک

مل جائے تری ہم سفری تو میں یہ دیکھوں
لے جائے ترا عشق طرح دار کہاں تک
دہشت بھرے ماحول میں لاشوں کے مناظر
دیکھے گا کوئی صبح کا اخبار کہاں تک؟
عرفانؔ سفر میرے لیے گر نہیں ممکن!
دیکھوں کہ ہے یہ رستہ دشوار کہاں تک

○

پروفیسر حسن عسکری کاظمی
(لاہور)

صحرا میں قدم تھا کہ مری جاں پہ بنی تھی
خوشبو کے تعاقب میں عجب تشنہ لبی تھی

اک موجِ حوادث تھی جو گزری مرے سر سے
اک خوابِ پریشاں تھا کہ آشفتہ سری تھی

بھولا نہیں میں اس کی جدائی کا وہ لمحہ
طوفان تھا آنکھوں میں کہ اشکوں کی جھڑی تھی

قربت کے زمانے بھی رہے یاد نہ مجھ کو
یہ سوچ کے ملنے کی بھی خواہش نہ رہی تھی

سب کچھ تو لٹا حرفِ غزل رہ گیا باقی
دامن میں مرے اک یہی پونجی تو بچی تھی

زردار کے ہاتھوں میں دیا ہاتھ نہ میں نے
یہ رسمِ کہن میرے گھرانے سے چلی تھی

سرقامتِ نیزہ پہ رہا راہِ سفر میں
سورج کی انی رات کے سینے میں گڑی تھی

○

پروفیسر صدیق شاہد
(شیخوپورہ)

آگہی نے عذاب میں رکھا
خیرو شر کے حساب میں رکھا

حرفِ ارماں نہ جب زباں سے ہوا
اس کو چشمِ پر آب میں رکھا

حسن تسکینِ جاں سہی لیکن
کچھ نہیں نقشِ آب میں رکھا

ہو بھی سکتا ہے بند بابِ مراد
یہ نہ امکان خواب میں رکھا

حکم برداری اپنا شیوہ رہا
حکم اس کی جناب میں رکھا

حوصلہ اُس کا شکست نہ ہو
نکتہ یہ بھی سراب میں رکھا

پیاس چھلنی کی تھی کہاں بجھتی
خواہشوں نے عذاب میں رکھا

جبر کے کشتگاں کا شاہدؔ
آسرا! انقلاب میں رکھا

○

پروازانبالوی
(انبالہ، بھارت)

سچ بولتا ہوں ڈال دے مجھے عذاب میں
کرتا ہوں التجا میں خدا کی جناب میں

جو بات ایک چہرے پہ لکھّی ہوئی ملی
وہ بات مِل سکی نہ کسی بھی کتاب میں

مجھ کو غمِ حیات نے مسرور کر دیا
کہتے ہیں لوگ نشّہ فقط ہے شراب میں

شاید وہ کائنات نہیں ہے خلا میں بھی
جو کائنات بیٹھی ہے چھُپ کر حباب میں

ہم سرپھروں کی باتوں پہ ہنستے ہیں آج لوگ
لکھّی ملیں گی کل یہ خرد کے نصاب میں

اُتنا ہی اُنکے حُسن کا شہرہ ہے آج کل
جتنا چھُپا رہے تھے وہ چہرہ نقاب میں

پرواؔز کو ملا نہ جنوں میں بھی کچھ مزا
پھر کیا ملے گا تجھکو حساب و کتاب میں

○

ڈاکٹر جواز جعفری

(لاہور)

جیتے جی عشق کا آزار کہاں جاتا ہے
زخم بھر کر بھی مرے یار کہاں جاتا ہے

مجھ سے لڑتا ہے وہ ہر بار گلی کوچوں میں
جنگ لڑنے مرا سالار کہاں جاتا ہے

میں دریچے سے سرِ شام اُسے دیکھتا ہوں
پھول لے کر مرا رہوار کہاں جاتا ہے

گر کے مقتل میں بکھر جاتا ہے پارہ پارہ
مرا سر بھی سرِ دربار کہاں جاتا ہے

ساتھ چلتے ہیں سبھی گریہ کی دیوار تلک
قبر میں کوئی عزادار کہاں جاتا ہے

دن نکلتے ہی ہر آنکھ مجھے پوچھتی ہے
رات تُو دریا کے اُس پار کہاں جاتا ہے

جب کڑی دھوپ مرے جسم کو جھلساتی ہے
تب ترا سایۂ دیوار کہاں جاتا ہے

○

اشرف جاوید

(لاہور)

دیکھ !آنکھوں کا دیا جلتا ہوا پانی سے
سورج آگے نکل آیا درِ حیرانی سے

بات بے بات بگڑ جاتا ہے بچوں کی طرح
ربط کمزور نہ کر دے کہیں نادانی سے

مجھ کھنڈر ذات میں کرتا ہے بسیرا ہر شب
ڈر نہیں لگتا اُسے غولِ بیابانی سے

کھل کے رویا ہے تو چہرے پہ دھنک پھیل گئی
حسن کچھ اور نکھر آیا پریشانی سے

اک زمانہ تھا، چہکتے تھے در و بام و شجر
ہول آتا ہے اب اِس شہر کی ویرانی سے

آنچ آئی نہ کبھی سنگِ ملامت سے مجھے
ٹوٹتا جاؤں مگر ضربِ گل افشانی سے

جانے کس پیار سے چومادمِ رخصت ماں نے!
پھول جھڑنے لگے اُجڑی ہوئی پیشانی سے

وجد میں آئے ہوئے ہیں در و دیوارِ قفس
ہر قدم رقص میں آتے ہوئے زندانی سے

پھر اَنا زاد میں تسلیم کی خو کیسے ہو!
غلطی وہ تو نہیں مانے گا آسانی سے

○

ہوا کے دوش پر

(ایک عام آدمی کی داستان حیات)

فیروز عالم

(کیلی فورنیا' امریکہ)

قسط۔۔۲۵

مضحکہ خیز غلطیاں۔۔نیم حکیم

میں ہسپتال میں کام کر رہا تھا مگر اپنی نا تجربہ کاری کی وجہ سے اپنے سینئر ڈاکٹروں کو مستقل پریشان کرتا رہتا تھا۔ اس سلئے بھی کہ مجھ میں خود اعتمادی کی کمی تھی۔ اس ہسپتال میں انتہائی پیچیدہ مریض آتے تھے اور مجھے ڈر تھا کہ میں انہیں کوئی نقصان نہ پہنچادوں۔ اگر میں انہیں رات کو ایک بجے بھی کسی معمولی چیز کے لئے پریشان کرتا تھا تو وہ نہ صرف پیار سے میرے سوال کا جواب دیتے تھے بلکہ میرے اصرار پر چند ہی منٹ میں ہسپتال پہنچ جاتے تھے۔ یہ چیز میرے لئے اس لئے بھی حیران کن تھی کہ پاکستان کے سرکاری ہسپتالوں میں سینئر ڈاکٹر کو رات کے وقت بلانا ناممکن تھا۔

لکھنا یہ چاہ رہا ہوں کہ اپنی نا تجربہ کاری کی وجہ سے اپنے سینئر ڈاکٹروں کو کیسی ناحق تکلیف دی اور انہوں نے کیسی فیاضی سے مجھے برداشت کیا۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ یاد آتا ہے تو مجھے ہنسی بھی آتی ہے اور شرمندگی بھی ہوتی ہے۔ ڈاکٹر رپی (RIPPY) جو ہماری سرجری کا ہیڈ تھا اپنی عمر کے تقریباً آخری حصہ میں تھا۔ میرے خیال سے وہ چوراسی سال کا تھا اور اپنی عمر کی وجہ سے کچھ بھلکڑ بھی ہو گیا تھا۔ اس کی غیر موجودگی میں ہم پاکستانی جس میں آپریٹنگ روم کا اسٹاف بھی شامل تھا عام طور پر اس کے متعلق مذاق کرتے رہتے تھے کہ وہ کسی دن آپریشن کرتے ہوئے اللہ کو پیارا ہو جائیگا۔ وہ شاید مشنری جذبے کے تحت کراچی آکر کام کر رہا تھا ورنہ اسے اب کام کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ پھر بھی وہ بہت سمارٹ تھا اور ہر وقت کام کرنے کو تیار تھا۔ لیکن عمر کا تقاضہ تھا اور نیند کی بیچینی اسے تنگ کرتی تھی اور رات کو اسے جگا کر بلاؤ تو اسے سوچنے اور سمجھنے میں ذرا وقت لگتا تھا پھر خاص طور پر رات کے وقت فون پر میری انگلش کا لہجہ اس کے لئے اور اسکی انگلش کا لہجہ میرے لئے

ع زبان یار من ترکی و من ترکی نمی دانم

کی مثال ہو جاتا تھا۔

خطرناک ٹیومر

ایک رات جب کہ میں حسب دستور سوائے زنانے وارڈ کے تمام ہسپتال کے لئے کال پر تھا کوئی رات ایک بجے مجھے سرجکل وارڈ کی نرس نے کال کیا۔ ایک مریض جسکا اسی دن ڈاکٹر رپّی نے پیٹ کا آپریشن کیا تھا پیٹ میں درد کی شدید شکایت کر رہا تھا۔ آپریشن کے بعد آپریشن کی جگہ پر تکلیف ایک قدرتی بات ہے اور اس کے لئے عام طور پر پہلے چوبیس گھنٹوں کے لئے درد کی دوائیں وافر مقدار میں لکھ دی جاتی ہیں جو نرسیں وقت پر ڈاکٹروں سے پوچھے بغیر دیتی رہتی ہیں مگر اس مریض کا درد مختلف تھا اور وہ بار بار پیٹ کا نچلا حصہ پکڑ کر درد کی شکایت کر رہا تھا اور درد کی دوائیں اس پر کچھ اثر نہیں کر رہی تھیں۔ نرس جو نسبتاً جونیئر تھی خود بھی کچھ تشویش میں تھی اور اس نے مجھ سے کہا کہ میں آکر اس مریض کو دیکھوں۔ میں تیسری منزل پر مردانہ وارڈ میں اسے دیکھنے پہنچا۔ اس وقت تک اس کو درد کے کئی انجکشن لگ چکے تھے اور وہ اتنی غنودگی میں تھا کہ وہ صحیح طور پر مجھے درد کی تفصیل یا کیفیت بھی نہیں بتا پا رہا تھا بس مستقل پیٹ پر ہاتھ پھیرے جا رہا تھا۔ میں یہ جانتا تھا کہ سرجری کے بعد سب سے خطرناک بات یہ ہو سکتی ہے کہ جریان خون ہو جائے۔ یعنی اندر جہاں سرجری کی گئی ہے وہاں خون بہنا شروع ہو جائے۔ چونکہ یہ اندرونی BLEEDING ہوتی ہے اس لئے باہر سے تو کچھ نظر نہیں آتا مگر پیٹ میں درد اور اسکے ساتھ پیٹ کا پھولنا یا پیٹ میں کسی گولے کا بن جانا اس کی علامت ہیں۔ یہ ایک انتہائی سنگین معاملہ ہوتا ہے اور اسکی فوری نگہ داشت ضروری ہے ورنہ مریض کی موت واقع ہو سکتی ہے۔ میں نے جیسے ہی مریض کے پیٹ پر ہاتھ رکھا میں نے نوٹ کیا کہ اسکی ناف کے نیچے ایک گولہ سا بنا ہوا تھا اور وہاں اس قدر تکلیف تھی کہ میرے ہلکے سے دبانے سے مریض نعرے مارنے لگتا تھا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ اس مریض کے پیٹ کے اندر خون جاری ہو گیا ہے۔ میں نے فوراً ڈاکٹر رپّی کو فون کیا۔ اسے نیند سے جاگنے میں ذرا دیر لگی، اور چونکہ وہ نیند میں تھا اس لئے اسے مجھے سمجھنے میں اور بھی دشواری ہوئی ادھر وہ اپنے امریکی لہجے میں جو نیند کی وجہ سے کچھ اور بگڑ گیا تھا مجھ سے جو پوچھ رہا تھا اسے صحیح طور پر میں نہیں سمجھ پا رہا تھا۔ میں اس سے زور دیکر بار بار یہی کہتا رہا کہ وہ فوراً آکر مریض کو دیکھے۔ میرے خیال میں مریض کو دوبارہ آپریشن تھیٹر میں لے جانا پڑیگا۔ خوش قسمتی سے وہ سیونتھ ڈے کے کیمپس ہی میں رہتا تھا اس لئے کوئی دس منٹ میں وہ ہانپتا کانپتا وارڈ میں پہنچا۔ اس طرح اچانک نیند سے اٹھائے جانے پر ابھی تک کچھ گڑبڑایا ہوا تھا اور میں نے دیکھا کہ اسکے سر میں ہلکی سی لرزش تھی اس نے اب مجھ سے پھر پوچھا کہ کیا مسئلہ ہے میں نے اسے بتایا اس نے مجھ سے پہلا سوال یہ پوچھا کہ مریض نے پیشاب کیا ہے۔۔۔ میں نے تو یہ مریض یا نرس سے پوچھا ہی نہیں تھا، کیا کہتا۔ اس نے مریض کے پیٹ پر ہاتھ رکھا اور نرس سے کہا کے پیشاب پاس کرانے کی نلکی (CATHETER) لاؤ۔ نرس نے نلکی دی اس نے نلکی پاس کی اور چند سیکنڈس میں کوئی ایک لیٹر پیشاب تیزی سے تھیلی میں جمع ہو گیا پیٹ کا گولہ تحلیل ہو گیا اور مریض کو ایک دم چین آ گیا۔ میں اپنے آپ سے بیحد شرمندہ ہوا کہ یہ تو بالکل معمولی بات تھی میں نے اس کا اس قدر بتنگڑ بنا دیا اور اس بیچارے چوراسی سال کے بوڑھے کو نیند سے جگا کر رات کے دو بجے تیسری منزل پر بلا لیا۔ یقیناً اگر یہ بات میں کسی پاکستانی پرائیویٹ ہسپتال میں یا لیاقت میڈیکل کالج ہسپتال

میں کرتا تو نوکری سے فوراً برخواست کر دیا جاتا۔ تھوڑا سا اپ سٹ تو وہ بھی تھا مگر پھر بھی اس نے برداشت سے کام لیا، نہ تو مجھے ڈانٹا نہ ہی کوئی طنز کیا بس اتنا کہا کہ زیادہ درد کی دواؤں کی وجہ سے پیشاب رک جاتا ہے اور اس صورتحال میں پہلا کام پیشاب کی نلکی پاس کرنا ہوتا ہے۔

اب میں اس واقعہ کو یاد کر کے ہنستا بھی ہوں اور شرمندہ بھی ہوتا ہوں مگر بالکل ایسا ہی واقعہ میرے اپنے ساتھ بھی ہوا جو اس بات کا ثبوت ہے کہ ڈاکٹری کی ٹریننگ کے دوران یہ مضحکہ خیز غلطیاں ہوتی ہیں اور ہوتی رہینگی۔

تاریخ خود کو دہراتی ہے

سالوں بعد میں شکاگو کے سب سے خوشحال اور باوقار ہسپتال میں زیر تربیت ڈاکٹروں کا انچارج تھا۔ میرے زیر نگرانی بائیس امریکن نوجوان ڈاکٹر تھے جو یونیورسٹی آف الینائے کے گریجویٹ تھے۔ میں انکے ساتھ راؤنڈ کرتا تھا اور مختلف پریکٹکل چیزیں ان کو سکھاتا تھا۔ ان میں ایک طویل القامت گورا یہودی لڑکا جیری کوہن jerry cohen بھی تھا جیری بہت ذہین با ادب اور سنجیدہ فطرت ڈاکٹر تھا۔ حقیقتاً میں اسے کافی پسند کرتا تھا۔ ایک دن راؤنڈ ختم کر کے میں اپنے چیمبر میں واپس آیا ہی تھا کہ میری سیکریٹری نے کہا کہ مجھے ڈاکٹر جیری فوراً وارڈ میں بلا رہا ہے۔ میں نیچے ساتویں منزل پر وارڈ میں پہنچا تو اسکے منہ پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اس نے نیا مریض داخل کیا تھا اور اسی جانچ کے دوران اس نے اس کے پیٹ میں ایک رسولی دریافت کی تھی۔ مریض کسی معمولی وجہ سے ہسپتال میں داخل ہوا تھا اور جیری اس وجہ سے زیادہ پریشان تھا کہ وہ مریض کو کیسے بتائیگا کہ اس کے پیٹ میں ٹیومر ہے۔ میں نے مریض کا معائینہ کیا اور نرس سے کہا کہ پیشاب کی نلکی لاؤ۔ نلکی لائی گئی اور میں نے جیسے ہی نلکی پاس کی بہت سا پیشاب نکل کر تھیلی میں جمع ہو گیا اور وہ رسولی غائب ہو گئی۔ وہ بیچارہ نہ صرف بیحد شرمندہ ہوا بلکہ خوف زدہ ہو گیا اس لئے کہ میری ذمہ داری ان ڈاکٹروں کی اہلیت کو جانچ کر انہیں سرٹیفکیٹ بھی جاری کرنا تھی۔ جب تک میں نے اپنا قصہ سنا کر اسے پرسکون نہیں کیا وہ خوف سے کانپتا رہا۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ہر ڈاکٹر بعد میں چاہے وہ کتنا ہی نامور ہو ایک ہی جیسے راستوں سے گزرتا ہے۔ جیری کوہن آج کل شکاگو کے ایک متمول مضافاتی بستی میں مشہور اور قابل احترام فزیشن ہے اور خود میڈیکل اسکول کے طلبہ کو تعلیم دیتا ہے۔

(ہوسکتا ہے کہ ''آج'' کے ڈاکٹر یہ پڑھ کر ہنسیں کیونکہ اب کم از کم امریکہ میں ہر وارڈ میں نرسوں کے پاس ایک چھوٹا سا سکین ہوتا ہے جو وہ پیٹ پر رکھ کر معلوم کر لیتی ہیں کہ ٹیومر کہیں پیشاب کا ذخیرہ تو نہیں۔۔۔ مگر میں ۱۹۷۴ء کا ذکر کر رہا ہوں۔ معاشرے کے دوسرے شعبوں کی طرح ڈاکٹری بھی اب بیحد آگے بڑھ چکی ہے)

مزید حماقتیں

اس زمانے میں بلڈ پریشر کی انتہائی زیادتی جس کی وجہ سے تشنج کے دورے پڑنے لگتے تھے کا واحد علاج میگنیشم سلفیٹ تھا اور اسکی مقررہ ڈوز دو اعشاریہ پانچ گرام تھی۔ ایک رات مجھے گہری نیند سے جگا کر زنانہ وارڈ کی نرس نے بتایا کہ ایک مریضہ کا بلڈ پریشر دوسو دس ہے اور وہ ٹھیک نہیں لگ رہی۔ نیند نے میرے ذہن پر ایک دھندسی طاری کر دی تھی۔ میں نے اس سے کہا کہ اسے رگ کے ذریعہ فوراً پچیس گرام میگنیشم سلفیٹ لگا دو۔ یہ مقررہ مقدار سے دس گنا زیادہ تھی۔ وہ نرس خود بھی ناتجربہ کار تھی پھر بھی اس نے کہا ڈاکٹر یہ مقدار تو بہت زیادہ ہے۔ نئے نئے ڈاکٹری کے دنوں میں ہر نوجوان ڈاکٹر انا کے گھوڑے پر سوار ہوتا ہے۔ مجھے بھی یہ بہت برا لگا اور میں نے اس سے کہا کہ میں ڈاکٹر ہوں یا تم، تم سے جو کہا گیا ہے وہ کرو۔ وہ بیچاری میرے حکم کی تعمیل میں اس دوا کے ایمپیول کھول نے لگی۔ اتفاق سے ہمارے ہسپتال میں یہ قانون تھا کہ ایسے سنگین مریضوں کو نرسنگ سوپروائزر بھی آکر دیکھتی تھی۔ مسز عزیز رات کی سوپروائزر تھیں۔ وہ بھاری بھرکم، تجربہ کار اور سخت قوت ارادی کی مالک تھیں اور امریکی سسٹم میں جسکا اصول یہ ہے کہ نرسوں کو بتایا گیا ہے کہ ڈاکٹروں سے نہ ڈرو اور اپنے موقف پر ڈٹی رہو کے مصداق مجھ جیسے نیم حکیم سے بالکل خائف نہ تھیں۔ انہوں نے مجھے فون کر کے مہذب اور باادب مگر سخت لہجے میں کہا کہ میں مریض کو دس گنا ڈوز دے رہا ہوں جس سے اسکی یقینی موت واقعہ ہو جائیگی۔ اس نے مجھے ایک جھٹکا لگایا، میری نیند اور تھکن رفو چکر ہو گئی اور میں کمبل پھینک کر بھاگم بھاگ زنانہ وارڈ میں پہنچا اور مسز عزیز کا شکریہ ادا کیا اور اپنے سامنے مریضہ کو صحیح مقدار کا انجکشن لگوایا۔

چند قابل ذکر مریض

ایک رات میں ایمرجنسی روم کا کام ختم کر کے ابھی ابھی بستر پر لیٹا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ میں تھکن سے نڈھال تھا۔ دن بھر کھڑے رہنے سے میری پنڈلیوں میں ہلکا ہلکا درد اور اینٹھن ہو رہی تھی۔ دل چاہتا تھا کہ ایسا سوؤں کہ صبح کی خبر لاؤں۔ ایسے میں گھنٹی کی آواز میرے سر پر ہتوڑے کی طرح لگی۔ نرس نے بتایا کہ بہت سنگین کیس ہے اور میں بھاگتا ہوا وہاں پہنچوں۔ وہاں پہنچ کر میں نے دیکھا کہ ایک خاصی وزن دار خاتون معائنے کی میز پر مچھلی کی طرح تڑپ رہی ہیں انکے سر اور سیدھے کندھے کو بار بار جھٹکے لگ رہے ہیں، آنکھیں اوپر کی طرف پھری ہوئی ہیں اور ساکت ہیں اور دیر تک کھلے رہنے کی وجہ سے سرخ ہو گئی ہیں۔ زبان آدھی نکل کر دانتوں میں پھنس گئی ہے اور سانس کی کھڑکھڑاہٹ سے کمرہ گونج رہا ہے۔ وہ کراچی کی ایک مشہور اور دولت مند تاجر فیملی کی فرد تھیں۔ ان کے ساتھ بہت سے لوگ آئے تھے۔ چند گھنٹے پہلے سر میں درد اٹھا تھا اور پھر منٹوں میں یہ حشر ہو گیا ان کے رشتہ دار یہ سوچ کر انہیں ''امریکن ہسپتال'' لائے تھے کہ یہاں کوئی سینئر امریکی ڈاکٹر انہیں دیکھے گا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی مشتعل ہو گئے۔ ادھر انہیں دیکھ کر میرے بھی ہاتھ پیر پھول گئے مگر میں نے انہیں سمجھایا کہ انکی جان بچانے کے لئے کچھ فوری طبی امداد کی ضرورت ہے جو میرا فرض ہے۔ میں نے اسکے بعد چیپ مین کو فون کیا۔ وہ حسب دستور فوراً ہی ہسپتال پہنچا۔ اس نے آلے سے انکی پتلیوں مین جھانک کر دیکھا۔ کہنے لگا BRAIN HEMORRHAGE کا کیس ہے۔ اس دور میں

سوائے کھوپڑی کے ایکسرے کے کوئی اور ٹیسٹ موجود نہ تھا اور ایکسرے سے کوئی مدد نہیں مل سکتی تھی۔ ہم نے مل کر انکی ریڑھ کی ہڈی سے پانی نکالا جس میں خون کی آمیزش تھی۔ اس سے تشخیص مکمل ہوگئی۔ ڈاکٹر چیپ مین نے انکے لواحقین کو بتایا کہ ہم انکے بلڈ پریشر کو کنٹرول کرینگے، انکے دماغ کی سوجن کا علاج کرینگے اور انکی سانس کو بحال رکھیں گے اسکے علاوہ ہمارے پاس اسکا کوئی علاج نہیں اور حقیقت کا یہی تقاضہ ہے کہ وہ اس بات سے آگاہ رہیں کہ ایسے مریض عام طور سے جانبر نہیں ہوتے۔ وہ تو چلا گیا۔ میں نے پوری رات انکے ساتھ گذاری مگر وہ صبح ہونے سے پہلے پہلے انتقال کر گئیں۔ ایسے کیس لیاقت میڈیکل کالج میں تو بہت آتے تھے مگر چونکہ میں نے ہاؤس جاب نہیں کی تھی میں نے ایسا کیس پہلے نہیں دیکھا تھا اس لئے میں نے اس کیس کا بہت اثر لیا۔

ایک روسی مریض

اس دن کچھ فراغت تھی اور میں مردانہ وارڈ میں بیٹھا نرسوں سے گپیں لگا رہا تھا کہ ایمرجنسی روم سے کال آئی کہ ایک روسی مریض لایا گیا ہے اور اسکو گردے کا درد اٹھا ہے۔ میں جب وہاں پہنچا تو ایک روسی مریض جسکی بہت ہی گہری نیلی آنکھیں اور سرخ بال تھے درد سے بے حال تھا۔ اسکے ساتھ اسکا پاکستانی عملہ بھی تھا۔ ہمیں کالج میں پڑھایا گیا تھا کہ گردے کا درد شدید ترین دردوں میں شامل ہے اور اس درد میں کسی پہلو چین نہیں آتا وہ بھی اپنی کوکھ پر ہاتھ رکھے تڑپ رہا تھا۔ اسکے علاوہ اس کے ساتھ آنے والا پاکستانی عملہ چاہتا تھا کہ اسکے لئے آسمان کے تارے توڑ کر لادئے جائیں دوسرے ہمارے ایمرجنسی روم کا عملہ بھی کچھ سفید فام افراد سے بہت مرعوب تھا۔ ادھر وہی مسئلہ کہ وہ اس ہسپتال میں کسی سینئر ڈاکٹر سے علاج کروانے آئے تھے اور انکے سامنے ایک بائیس سال کا گبھرو سانولا لڑکا جسکا وزن صرف پچانوے پاؤنڈ تھا کھڑا تھا۔ پھر میں اپنے سونے کے لباس میں تھا اور چپل پہنے تھا اور اپنی عمر سے کہیں کم بھی لگتا تھا۔ وہ تو ہتے سے اکھڑ گئے۔ مجھے ڈاکٹر ہی ماننے پر تیار نہ تھے۔ ادھر وہ درد کی شدت سے ادھ موا ہوا جا رہا تھا اور یہ لوگ مستقل کسی بڑے ڈاکٹر کو بلانے کی فرمائش کر رہے تھے۔ لیکن مجھے تو فوری اسکے درد کو آرام پہنچانا تھا اس زمانے میں پاکستان میں درد کی ایک دوا BARALGIN آتی تھی۔ میں نے اسکی پانچ سی سی سرنج میں کھینچ کر اسکی رگ میں ڈالی۔ یہ دوا حقیقت میں درد کے لئے تیر بہدف تھی۔ ابھی چند قطرے ہی اسکے جسم میں گئے ہونگے کہ اسکا درد ایسا غائب ہوا کہ وہ حیران ہوگیا۔ روسی بھی ہماری طرح کچھ جذباتی واقع ہوئے ہیں وہ تو جوش میں ٹیبل سے کھڑا ہوگیا اور مجھے بھینچ کر میری چمیاں لینے لگا۔ میں نے مشکل سے اپنے آپ کو اس سے جدا کیا۔ وہ یہ کہتے نہیں تھکتا تھا کہ اتنا کم عمر ڈاکٹر اور ایسا اچھا علاج۔ وہ جاتے ہوئے کہنے لگا میں ہسپتال کے انچارج کو تمہارے بارے میں خط لکھونگا۔ اسنے خط لکھا یا نہیں مگر وہ تین دن بعد ایمرجنسی میں آیا اسکے ہاتھ میں مخمل کی ایک ڈبیا تھی۔ وہ اس نے مجھے دی اس میں روس کی بنی POLJOT گھڑی تھی۔ میں ان دنوں بہت ہی خوددار تھا میں تو بہت ناراض ہوا مجھے لگا اس سفید فام شخص نے مجھے TIP دیا ہے میں کسی قیمت پر وہ گھڑی قبول کرنے کو تیار نہ تھا۔ بہرحال نرسوں کے سمجھانے پر میں نے اس شرط پر یہ گھڑی قبول کی کہ میں اسے اس کے پیسے دونگا۔ آخر کار میں نے اس سے یہ گھڑی ساٹھ روپے میں خرید لی اور پندرہ روپے ہر مہینے اس کو ادا کئے۔ بدقسمتی سے جب میں امریکا پہنچا تو ڈیٹرائٹ میں سیاہ فام غنڈوں نے جب مجھے لوٹا تو وہ یہ گھڑی بھی لے گئے۔

سیونتھ ڈے کا اسٹاف اور ماحول

سیونتھ ڈے ہسپتال کا ماحول بہت اچھا تھا اور پورے ہسپتال میں لوگ ایک دوسرے سے بلا امتیاز مرتبہ دوستی اور عزت سے پیش آتے تھے۔ یہاں میں نے پہلی دفعہ امریکی سماجی طور طریقے دیکھے۔ مسٹر رائیٹ ایک سفید فام امریکی تھے جنکا تعلق پینسلوانیہ سے تھا۔ وہ ہمارے یعنی پاکستانی لحاظ سے مزدور تھے اس لئے کہ انکا کام زیادہ تر ٹوٹ پھوٹ کی مرمت اور سفیدی اور رنگ و روغن کرنے کا تھا اسی لئے وہ دن بھر ایک نیلی ڈانگری پہنے کمر کے دونوں جانب مرمت کے آلات لٹکائے گھومتے رہتے تھے مگر لنچ کے وقت وہ ڈاکٹر ز پی اور ڈاکٹر جونز جو خود بھی امریکی تھے کے ساتھ بیٹھ کر خوش گپیاں کرتے تھے۔ مسٹر ہیلمین کیلیفورنیا سے تھے اور لیبارٹری ٹیکنیشن تھے وہ بھی انلوگوں کے ساتھ ہنسی مزاق کرتے تھے مگر اچھی بات تو یہ تھی کہ ہمارے نچلے درجے کے دیسی کرسچین بھی بڑے ادب سے پکارے جاتے تھے۔ حتی کہ ایمرجنسی روم کا اردلی بھی مسٹر ہنری اور ڈائننگ ہال کا بیرا بھی مسٹر جارج کہہ کر مخاطب کئے جاتے تھے۔ کھانے کے وقت وہ بھی انہی میز کرسیوں پر بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے جن پر ہم۔ اس قسم کی مساوات کا مظاہرہ امریکہ میں میں نے پہلے پہل اپنے ڈیٹرائیٹ آنے پر دیکھا۔ ڈاکٹر ڈین مائیرس (DAN MEYERS) جو ہماری یونیورسٹی کا ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ آف میڈیسن تھا صبح صبح اپنی کالی کافی لیکر کیفیٹیریا کی ایک میز پر بیٹھ جاتا تھا۔ وہیں ایک زمین صاف کرنے والا فرد سام بھی کام کرتا تھا۔ سام زمین پر پونچھا مارنے کے بعد پونچھا مارنے کا ڈنڈا ایک طرف کھڑا کر کے خود بھی کالی کافی لیکر ڈاکٹر مائیرس کے ساتھ آکر بیٹھ جاتا تھا اور گذرے دن کے بیس بال کے کھیل پر دونوں میں خوب تبصرہ ہوتا تھا۔ میں شروع میں اس پر تھوڑا سا حیران ہوا پھر اسکا عادی ہوگیا۔ مگر مجھے خیال آتا تھا کہ یہ تو عین اسلامی طریقہ ہے کہ

ایک ہی صف میں کھڑے ہوگئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

ڈاکٹر جونز امریکہ کی شمال مغربی ریاست آریگن کا تھا۔ یہ انتہائی خوش مزاج اور جلد گھل مل جانے والا شخص تھا اور اسکی بیوی بھی جو تمام سفید فام خواتین میں شاید سب سے کم عمر تھی ہم سب کا خیال کرتی تھی۔ ڈاکٹر جونز ہمیشہ مجھے امریکہ جانے اور وہاں تعلیم پانے کی رائے دیتا تھا۔ کسی وجہ سے وہ مشہور عالم یونیورسٹی JOHNS HOPKINS سے جو بالٹی مور میں تھی بہت متاثر تھا اور مجھے بھی کہتا تھا کہ تم اعلی تعلیم کے لئے اس میں قسمت آزمائی کرو۔

ایک دفعہ ایمرجنسی میں ایک یونانی ملاح لایا گیا۔ اسکا سر بری طرح پھٹا ہوا تھا اور زخم اس قدر گہرا تھا کہ کھوپڑی کی ہڈی نظر آرہی تھی خون بھی بہت بہہ رہا تھا اس نے شراب پی کر غل غپاڑہ مچایا تھا اور جہاز پر ہنگامے کے دوران اسکے اپنے ساتھیوں سے مار پیٹ میں اس کے یہ چوٹ آئی تھی۔ میں تو اسکو دیکھ کر گھبرا گیا اور اس سے پہلے میں نے اس طرح ٹانکے وغیرہ بھی نہیں لگائے تھے۔ ڈاکٹر جونز نے مجھے اس دن پہلی دفعہ اس قسم کے ٹانکے لگانے سکھائے۔ ایک آسانی یہ ہوئی کہ وہ ملاح اس قدر نشے میں تھا کہ ہمیں اسے بہت زیادہ سُن کرنیکی دوائیں بھی نہ دینی پڑیں کیونکہ وہ اس سارے عمل کے درمیان گہرے گہرے خراٹے لیتا رہا اور کبھی کبھی حلق سے ایک عجیب آواز نکال کر دوبارہ غفلت میں چلا جاتا تھا۔

مسٹر رائیٹ WRIGHT اس قدر سادہ انسان تھے کہ جب میرے کمرے میں کبھی کبھی فلش کام نہیں کرتا اور میں انہیں بلاتا تو وہ بغیر کسی نخرے کے فوراً ربڑ کے لمبے لمبے دستانے پہن کر فلش ٹھیک کرنے میں مصروف ہو جاتے۔ اور پھر فلش ٹھیک کر کے میرے ہی کمرے میں کرسی پر بیٹھ کر دیر تک مجھ سے پنسلوانیہ کے پہاڑوں اور وادیوں کی باتیں کرتے۔ وہ بھی مجھے بتاتے کہ فلیڈلفیا اور پٹسبرگ میں کیسی کیسی عظیم یونیورسٹیاں ہیں اور یہ کہ مجھے وہیں جانا چاہئے۔ امریکہ میں ہر شخص اپنی ریاست پر فاخر ہے اور اس سے بہت محبت کرتا ہے۔

امریکیوں کی کیمپ فائر

مسٹر ہیلمین نسبتاً کم گو انسان تھے مگر اپنی لیبارٹری کے کام میں انتہائی ماہر۔ وہ مجھ سے زیادہ باتیں تو نہیں کرتے تھے مگر دسمبر کے آخری ہفتوں میں ،جب ان تمام امریکیوں پر ''ہالی ڈے سیزن'' کا موڈ طاری تھا ہسپتال کے عملے نے اسکے پشت پر بنے باغ میں ایک کیمپ فائر کا انتظام کیا۔ رنگا رنگ پروگرام تھا۔ اس میں مسٹر ہیلمین نے کیلیفورنیا کے بارے میں ایک بہت خوبصورت فلم دکھائی جسمیں کیلی فورنیا کے قیامت خیز قدرتی مناظر دکھائے گئے تھے۔ خاص طور سے ریڈ وڈ فاریسٹ، یوسی مٹی پارک اور بحرالکاہل کا کٹا پھٹا ساحل اور صنوبر کے بلند و بالا درخت۔ اس کے فوراً بعد مسٹر ہیلمین نے جلتے الاؤ کے سامنے بیٹھ کر گٹار پر ایک امریکی لوک گیت سنایا تھا۔ میں تو اس پورے ماحول سے مسحور ہو گیا تھا دل میں ایک عجیب سی ہوک اٹھی تھی اور معاً مجھے خیال آیا تھا کہ کیسے ہوتے ہونگے وہ لوگ جو ان جگہوں سے لطف اندوز ہوتے ہونگے۔ آج خدا کے فضل سے میری فیملی قانونی طور پر کیلی فورنین ہے اور ہم نے ان تمام جگہوں کا ایک دفعہ نہیں بلکہ درجنوں بار تفریحی دورہ کیا ہے۔ ہمارا گھر جو لاس اینجلز کے نواح میں کیلی فورنیا کے انتہائی خوبصورت پہاڑوں کے دامن میں واقع ہے اسکی کھڑکیوں سے سردیوں میں برف پوش چوٹیاں نظر آتی ہیں اور نیچے ڈھلانوں میں سفید سفید بادلوں کے ٹکڑے تیرتے رہتے ہیں۔ رات کے وقت جب ڈیڑھ ہزار فٹ نیچے وادی میں شہر کی روشنیاں جگمگاتی ہیں تو ماحول جادوئی ہو جاتا ہے۔ میں آتش دان میں آگ روشن کر کے اس منظر کا نظارہ کرتا ہوں تو وہ رات یاد آجاتی ہے جب یہ مناظر مجھے اپنی پہنچ سے بہت دور لگتے تھے۔ جو لوگ ایسے موسم میں ہم سے ملنے آتے ہیں وہ بے ساختہ کہہ اٹھتے ہیں

YOU HAVE A MILLION DOLLAR VIEW

یہ سب اللہ کی خاص عنایتیں ہیں جس کے لئے میں اس باری تعالی کا بار بار شکر ادا کرتا ہوں۔

ہسپتال کے دیگر ڈاکٹر

ڈاکٹر رپی کی بیوی غذائیات کی ماہر تھی اس سے پہلے میں نے کسی پاکستانی ہسپتال یا لیاقت میڈیکل کالج میں یہ شعبہ نہیں دیکھا تھا۔ دراصل اس شعبہ میں پاکستان اتنا کم مایہ تھا کہ سالوں بعد بھی جب میں آغا خان ہسپتال میں تھا تو صحیح طور پر تربیت یافتہ صرف ایک DIETICIAN سلمی بدرالدین پورے ہسپتال کے لئے تھیں اور شہر میں اس شعبہ سے تعلق رکھنے والے افراد انگلیوں پر گنے جا سکتے تھے۔ مسز رپی اپنی ضعیفی کے باوجود اپنے پیشے سے بہت مخلص تھیں اور اپنی نگہبانی میں مریضوں کا کھانا اور ٹرے تیار کرتی تھیں۔

امراض خواتین کی انچارج ڈاکٹر اسٹاک ہاؤزن کو ہم تمام پاکستانی سفید فام اور امریکی سمجھتے تھے مگر وہ درحقیقت جزائیر غرب الہند کے جزیرے جمیکا کی تھی اور دوغلی نسل کی تھی یعنی اسکا باپ جرمن اور ماں نیگرو تھی۔ وہ انتہائی چڑچڑی بد دماغ اور سخت مزاج عورت تھی اور ڈسپلن کی بہت زیادہ پابند تھی۔ وہ بہت کم آمیز تھی اور باقی غیر ملکی اسٹاف سے بھی بہت کم ملتی تھی۔ اسکی دست راست ایک امریکی گوری نرس مس ڈیوس تھی جو اپنے مزاج اور طور طریقوں میں بالکل ڈاکٹر اسٹاک ہاؤزن جیسی ہی تھی۔ مگر ان دونوں نے ملکر سیونتھ ڈے ہسپتال کے شعبہ زچگی کو کراچی میں سرفہرست بنا دیا تھا اور شہر کے تمام ممتاز اور متمول گھرانوں کی خواتین یہاں اپنی زچگی کروانے کو باعث فخر سمجھتی تھیں۔ میری اپنی بڑی بہن سلطانہ آپا کے سارے بچے یہیں پیدا ہوئے تھے۔

پاکستانی اسٹاف میں ڈاکٹر چیپ مین کی خاص نرس وائلٹ مل کا ذکر ہو چکا ہے۔ انکے شوہر مسٹر مل نائیب نرسنگ ڈائیرکٹر تھے۔ رات کی سینئر میٹرن مسز عزیز تھیں۔ مسز ڈیوڈ ایمرجنسی کی انچارج تھیں۔ مسز پیٹرس رات کی سپروائیزر اور اگنس اور سرفراز مردانہ وارڈ کی انچارج تھیں۔

میرے علاوہ دو سینئر ڈاکٹر پاکستانی تھے جو جز وقتی کام کرتے تھے۔ ڈاکٹر کھمبا ٹا ایک پارسی سرجن تھا جو کبھی کبھی آپریشن کرنے آتا تھا دوسری مسز عالم تھیں جو کچھ سال پہلے شکاگو سے ایکسرے میں اعلی ڈگری لیکر آئیں تھیں اور زیادہ تر اس بات پر پچھتاتی رہتی تھیں کہ میں کیوں واپس آئی۔

ان تمام لوگوں کے درمیان میں اکیلا جونئر ڈاکٹر تھا اور ہر شخص مجھے اپنی مدد کی خاطر استعمال کرنے کے لئے بیتاب رہتا تھا۔ میں ہر ایک کو تو مطمئن نہیں کر سکتا تھا پھر بھی اپنے طور پر پوری کوشش کرتا تھا کہ کسی کو شکایت کا موقعہ نہ دوں۔ ایک اچھی بات یہ تھی کہ میں خود اپنی ناتجربہ کاری کی وجہ سے جلد سے جلد

بہت کچھ سیکھنے کے لئے بیقرار تھا اس لئے مجھے انکے ساتھ کام کرنے اور کبھی کبھی بہت زیادہ دباؤ میں آنے پر بھی کوئی شکایت یا ناگواری کا احساس نہیں ہوتا تھا۔

نیند کی کمی

میں خالہ جان کے یہاں نیند کی کمی کی وجہ سے پریشان تھا مگر نیند کی کمی اب بھی موجود تھی۔ اسکی بڑی وجہ تو یہ تھی کہ میں ہسپتال میں جونئر سطح پر اکیلا ڈاکٹر تھا اور اس لئے ہر دوسری رات یعنی مہینے میں پندرہ راتیں رات کی ڈیوٹی پر ہوتا تھا۔ باقی راتیں ڈاکٹر چیپ مین اور ڈاکٹر جونز لیتے تھے۔ پھر نیند کا مسئلہ ذولفقار بھائی جان کے یہاں اور بڑھ گیا تھا کیونکہ ایک تو یہاں بھی بہت ہنگامہ رہتا تھا اور دوسرے یہ کہ مہمانوں کی شدید آمد و رفت رہتی تھی۔ ایسے میں مجھے اس بات کا خیال آتا تھا کہ اگر میرے ساتھ ہسپتال میں ایک دوسرا جونئر ڈاکٹر بھی ہو تو میری زندگی بہت بہتر ہو جائے۔ اس سلسلے میں یہ بھی ضروری تھا کہ وہ ڈاکٹر ایسا ہو جس سے میری بہت اچھی دوستی اور مفاہمت ہو کہ ہم ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کام کر سکیں اور ضرورت پڑنے پر ایک دوسرے کا ہاتھ بٹا سکیں میری نظریں رشید پر تھیں رشید صرف حادثے کی وجہ سے سپلیمنٹری کے امتحان کا انتظار کر رہا تھا ورنہ اسکا تمام کیریئر بھی فرسٹ کلاس تھا اور مجھے یقین تھا کہ وہ ڈاکٹر چیپ مین اور ہسپتال کے معیار پر پورا اترے گا۔ اس طرح ہم ایک بار پھر ساتھ ہو جائینگے جب سے رشید سانگھڑ سے میرپور خاص آیا تھا ہم علیحدہ نہیں ہوئے تھے

رشید غوری کی آمد

اب تک قارئین رشید غوری سے مکمل طور پر واقف ہو گئے ہو نگے۔ پھر بھی مختصراً۔۔۔ رشید غوری میرے بچپن کا دوست تھا۔ وہ کالج میں بھی میرے ساتھ رہا اور اسکے بعد میڈیکل کالج میں بھی نہ صرف میرے ساتھ تھا بلکہ ہمارے کمرے بالکل ساتھ ساتھ تھے۔ الطبری ہال میں میرا کمرہ ۱۰۴ اور اسکا ۱۰۵ تھا۔ گذشتہ قسط میں میں نے فائنل ایئر کے امتحان میں اسکی حادثاتی طور پر زہر خورانی کے متعلق تفصیل سے لکھا ہے جب کہ وہ مرتے مرتے بچا۔ اس کی وجہ سے وہ اب سپلیمنٹری کا امتحان دے رہا تھا۔ میں نے اس سلسلے میں ڈاکٹر چیپ مین سے بات کی اور یقین کے ساتھ قائل کیا کہ رشید بہت قابل محنتی اور دیانت دار شخص ہے۔ جیسے ہی رشید امتحان میں پاس ہوا اور اسکے پاس لائیسنس آیا میں نے ڈاکٹر چیپ مین سے نہ صرف ایک بار بات کی بلکہ میں مستقل اسے پیچھے پڑا رہا کہ تم رشید کا انٹرویو کرو۔ آخر کار ڈاکٹر چیپ مین نے اسکا سرسری سا انٹرویو کیا اور اسکو بھی جونئر پوزیشن پر میرے ساتھ ہی سینتھ ڈے ہسپتال میں تعینات کر دیا۔

اب تو ہماری زندگی میں جیسے بہار آ گئی۔ کبھی کبھی اگر کام کی زیادتی ہوتی تھی تو ہم ڈیوٹی ختم ہونے کے بعد بھی ایک دوسرے کا ہاتھ بٹانے کے لئے رک جاتے تھے۔ اسی طرح شام کو جب ایمرجنسی روم زیادہ مصروف ہو جاتا تھا اور ہم میں سے صرف ایک ڈاکٹر اکیلا اسکا ذمہ دار ہوتا تھا تو عام طور سے دوسرا رضا کارانہ طور پر اسکی مدد کرتا تھا یہ اس وقت اور بھی ہوتا جب ہم کہیں کھانا کھانے کا پروگرام بناتے اور ایمرجنسی میں مریضوں کا ہجوم ہمارے اس پروگرام میں مانع ہو تا۔ اس کے باوجود میری رات کی مشقت تو کم نہیں ہوئی تھی کیونکہ رشید کے آنے کے بعد ڈاکٹر چیپ مین اور ڈاکٹر جونز نے رات کی ڈیوٹی ختم کر دی تھی جس کی وجہ سے اب صرف رشید اور میں رات کو ڈیوٹی پر ہوتے تھے یعنی ایک رات، میں اور ایک رات وہ۔ اسطرح اب بھی میں ہسپتال میں ایک ماہ میں پندرہ راتیں گذارتا تھا اور سینتھ ڈے کی راتیں اف خدا۔۔۔ یہ راتیں بڑی جان لیوا ہوتی تھیں۔

یہاں مناسب ہے کہ میں امریکا میں اپنی ٹریننگ کے دوران وہاں کی راتوں کی ڈیوٹیوں کا کچھ تذکرہ کر کے انکا مقابلہ سینتھ ڈے کی راتوں سے کروں۔ یہ طے شدہ بات ہے کہ جتنی مشکل راتیں سینتھ ڈے میں تھیں پھر ویسی مشکل راتوں کی ڈیوٹی میں نے کبھی نہیں کی حالانکہ مجھے ڈاکٹر نذیر اور امریکی ڈاکٹروں نے بہت ڈرایا تھا۔ امریکا میں عام طور سے ٹریننگ کے دوران آئیندہ کم از کم چار سال تک ہر تیسری یا چوتھی رات کال کی ڈیوٹی ہوتی ہے اور اگر چہ اس میں بھی سونا کم نصیب ہوتا ہے مگر پھر بھی ذمہ داری بٹی ہوئی ہوتی ہے کیونکہ ایک رات میں کئی جونئر ڈاکٹر کال پر ہوتے ہیں۔ بہت سا کام صرف ٹیلیفون ہی پر چل جاتا ہے۔ ہر سروس یا ہر وارڈ کی ذمہ داری الگ الگ ریذیڈنٹ کی ہوتی ہے۔ جبکہ سینتھ ڈے ہسپتال میں میں تن تنہا ایمرجنسی روم، مردانہ وارڈ، بچوں کے وارڈ اور عورتوں کے جنرل وارڈ کا ذمہ دار ہوتا تھا اس پر رات کو اگر کوئی آپریشن ہوتا تھا تو اس میں بھی مجھے ہاتھ بٹانا پڑتا تھا۔ پھر صبح کے بعد عام دن کی ذمہ داریاں شروع ہو جاتی تھیں اور دو بجے چھٹی ہوتی تھی۔ اس وقت تک میں بالکل نڈھال ہو جاتا تھا۔ امریکا میں یونیورسٹی کے ٹیچنگ ہسپتالوں میں تو کال اور بھی آسان ہے اسلئے کہ زیادہ تر کال ریذیڈنٹ یا سینئر فیلو کرتے ہیں۔ میں نے زیادہ وقت ٹیچنگ ہسپتال میں اسسٹنٹ پروفیسر کے طور پر گذارا اس لئے کال مشکل نہیں تھی۔ مگر جب میں نے پرائیویٹ پریکٹس شروع کی تو رات کی ڈیوٹی مشکل ہو گئی۔ یہ کال میں آج بھی کر رہا ہوں اور صبح تک میرا برا حال ہو جاتا ہے۔۔۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں۔۔۔ کب تک؟؟ بہر حال یہ کہنا صحیح ہے کہ جیسا مشکل وقت میں نے سینتھ ڈے میں گذارا ویسا امریکا میں نہیں گذارا۔

سینتھ ڈے ہسپتال میں مجھے اور رشید کو کام کرتے اب کافی وقت ہو گیا تھا اور اس لئے اب ہمیں کافی تجربہ ہو گیا تھا اور ہماری خود اعتمادی بھی بڑھ گئی تھی اسلئے مجھے اور رشید کو آزادانہ کام کرنے کے لئے ہسپتال کی زیر زمین کلنک میں ایک ایک دن الاٹ ہو گیا۔ اب ہمارے اپنے مریض تھے جو صرف ہمیں دکھانے اور ہم ہی سے علاج کروانے آتے تھے۔ ہم ایک طویل عرصے تک انکا مشاہدہ کر کے اپنے علاج کے نتائج دیکھ سکتے تھے مجھے اب بھی ایسے مریض یاد ہیں جو پورے ہسپتال میں صرف مجھے اپنا ڈاکٹر سمجھتے تھے اور انکے ریکارڈ پر بھی یہی درج ہوتا تھا کہ انکے علاج کے ذمہ دار ڈاکٹر فیروز عالم ہیں یہ ایک پر مسرت احساس تھا کہ وقت کے ساتھ ساتھ ہماری ذمہ داریاں بتدریج بڑھ رہی ہیں اور ہمارے سینئر ڈاکٹروں کا ہم پر اعتماد بڑھتا جا رہا ہے۔

''عراق جل رہا ہے''

سلمیٰ اعوان (لاہور)

باب---۳

عراق نیشنل میوزیم کے پانچ ہزار سالہ قدیم ترین ورثے کو سرسری سادیکھنے میں ہی تین گھنٹے لگ گئے۔ایک پڑھی لکھی قوم کا گھٹیاپن، چاند پر کمندیں ڈالنے والے لوگوں کی پست ذہنیت۔بمباری سے نہ صرف عمارت کو نقصان پہنچا تھا بلکہ انتہائی قیمتی مجسموں کی زیادہ چوریاں بھی اِنہی سامیوں ٹامیوں کے ہاتھوں ہوئیں۔میرے کلیجے سے نکلتی پل پل بعد آہوں کا ہی کوئی حساب نہ تھا۔

اب گاڑی سڑکوں پر بھاگی جاتی تھی۔چیزوں اور منظروں کا کھلارا بےحدوحساب سا تھا۔

وہی کرخ میٹرنٹی ہوسپٹل، وہی گرین زون کے پاس بغداد کنٹری کلب۔وہی رنگا رنگ لوگوں سے بھرا پُر احلب سکوائر۔ہاں اتنا ضرور تھا پہلے حلب سکوائر سے سیدھے جس سڑک پر چڑھے تھے وہ جمہوریہ پُل سے التحریر سکوائر میں داخل ہوئی تھی۔

سچی بات ہے میں نے تو افلاق سے وہیں کہیں کھانے کا کہا تھا۔بھوک سے تو گویا جیسے جان نکلی جارہی تھی۔صبح کا ناشتہ بھی بس ایویں سا ہی تھا۔کتنی ہی دوکانیں نظر سے گزری تھیں جہاں کچھ بھی کھے سواہ کھا کر پیٹ کے اس دوزخ کو ٹھنڈا کیا جا سکتا تھا۔پر وہ التحریر جانا چاہتا تھا۔اُس نے گاڑی کی رفتار بڑھائی اور ونڈ سکرین سے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔

''بس پانچ منٹ میں سڑک کسی نازنین کی مانگ کی طرح سیدھی التحریر کے دامن میں جا اُترے گی۔وہاں کے ریسٹورنٹ سے حمس کھائیے۔اس کے ٹھنڈے اور خوشگوار ماحول میں دو تین گھنٹے گزارنے ہیں آپ کو۔''

''کمال ہے۔میوزیم سکوائر سے التحریر دو قدم پر ہے اور تم گھنٹہ بھر سے سڑکوں پر بھاگے پھر رہے ہو۔پیارا سا لڑکا کھلکھلا کر ہنس پڑا تھا۔کسی سے ملنا تھا مجھے۔'' دراصل اِن دنوں وہ باہر جانے کے چکروں میں تھا۔

افلاق بہت سمجھدار لڑکا تھا۔سچ تو یہ تھا کہ وہ میری اُن دعاؤں کا ثمر تھا جو میں نے دمشق سے چلتے اور بغداد میں داخل ہوتے وقت مانگی تھیں۔کسی بھی بڑے ریسٹورنٹ میں گھُس کر رون سوّنے کھانے منگوانے کی اُس نے کبھی کوشش نہیں کی تھی۔میرے جیسی آپ پُھدری عورت جو کسی بھی ملک کے کسی بھی شہر میں کبھی گائیڈ کی محتاج نہیں رہی۔خود ہی بسوں، ٹراموں پر چڑھ کر مقامی لوگوں کو بازوؤں سے پکڑ پکڑ راستے پوچھنے کی عادی تھی۔بغداد کی ابتر صورت میں اُس کے رحم وکرم پر تھی۔وہ میرے آرام کا بھی کسقدر خیال رکھتا تھا یہ بھی میں جان گئی تھی کہ ٹیکسی والے اے سی نہیں چلاتے تھے۔کھلے شیشوں سے فراٹے بھرتی دوزخ جیسی ہوائیں سیدھی چہروں سے ٹکراتی تھیں جب کہ میرے اندر بیٹھتے ہی اے سی آن ہو جاتا تھا۔اس کی گاڑی میں لگے ایل سی ڈی پلئیر اور خود اُس نے مجھے عراقی شعرا اور گائیکوں سے بھی روشناس کروایا تھا۔

ریسٹورنٹ کے سامنے اُتارتے ہوئے اُس نے کہا تھا۔''میں تین بجے آپ کو یہیں سے پک کروں گا۔''

اندر تیز موسیقی کا شور تھا۔ٹھنڈک تھی۔لوگوں کے پُرے تھے۔ماحول کی رنگینی اور زندگی ہر رنگ میں جیتی اور چلتی ہے جیسے احساس کا عکس تھی۔اور جب میں ماحول سے لطف اٹھاتے ہوئے دائیں بائیں اور سامنے دیکھتی تھی۔میں نے انھیں دیکھا تھا۔وہ تین تھیں۔دو اُدھیڑ عمر اور ایک نوجوان لڑکی جو مجھ سے اگلی میز پر آ کر بیٹھیں۔

دونوں عورتیں سرخ وسفید، صحت مند جنکے غیر معمولی بھاری سینے اور کولہے ان کی عباؤں سے بھی چھلکے پڑتے تھے۔نوجوان لڑکی نے سکارف اور کھلے بازوؤں والی لمبی سی قمیض نما میکسی پہن رکھی تھی۔سینوں پر لہراتی بل کھاتی صلیبی زنجیروں نے بھی مجھے کچھ بتایا تھا۔میں خوشدلی سے ان کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔جواباً انہوں نے بھی محبت بھری مسکراہٹ بکھیری۔حوصلہ پا کر میں ان کی ٹیبل پر گئی اور تعارف کے مراحل طے ہوئے۔

دونوں ادھیڑ عمر عورتیں ڈیلی کریم اور جوزفین سیاب تھیں۔جن کے آباواجداد کوئی 1604 کے لگ بھگ ایران سے یہاں آئے تھے۔ڈیلی کریم شمالی عراق کے شہر موصل سے تھی۔یوں دونوں کی پیدائش اور بچپن جوانی سب بغداد سے منسلک تھے۔ڈیلی کی شادی موصل میں ہوئی اور وہ ابھی بھی وہیں تھی جبکہ جوزفین 1998 کے بعد سویڈن چلی گئی۔کوئی نو دس سال بعد وہ بغداد آئی تھی۔دونوں سہیلیاں ماضی کی دونوں ہمسائیاں بغداد کے نوسٹلجیا میں مبتلا تھیں۔انہیں اپنے بچپن کا وہ بغداد نہیں بھولتا تھا۔اُنکی یادوں میں بسا وہ شہر جو کوسموپولیٹین تھا۔جو بڑا ماڈرن اور ملٹی کلچرل تھا، جس میں رواداری اور برداشت کا عنصر بدرجہ اتم موجود تھا۔مختلف مذاہب کی رنگا رنگی جس کا حسن تھا۔اُن کی باتوں میں دُکھ تھا۔کرب کا واضح اظہار تھا۔جوزفین سیاب کے لہجے میں آنکھوں میں اُتری نمی بھی بہت کچھ کہتی تھی۔

ہمارے آبائی گھر یہیں اِس پرانے بغداد کی اِسی شاہراہ رشید کی اطرافی گلیوں میں تھے۔ہماری عیدیں، رمضان، کرسمس، گڈ فرائی ڈے سبھی مشترکہ تھے۔یہیں ہماری یہودی خالہ رہتی تھی جو بعد میں بغداد کے جنوبی حصّے میں بنے جیوش کوارٹر میں چلی گئی تھی۔

میری ماں کی جگری سہیلی جسے ملنے کیلئے جانے کا ہمیں کتنا ارمان اور تمنا رہتی تھی۔جب کبھی ان کے ہاں جانے کا پروگرام بنتا ہم بہنیں اُچھل اُچھل کر ایک دوسرے سے کہتیں۔

'' سوق حنونی (حنونی بازار) میں پھریں گے۔ہائے فوابینز

(Fawa Beans) بھی کھا ہیں گے۔''

میری چھوٹی بہن زبان تالو سے لگاتے ٹخ ٹخ کی آواز نکالتے ہوئے مستی میں آنکھیں نچاتی۔''کتنا مزہ آئے گا۔''

بلند و بالا خوبصورت بالکونیوں والے گھروں کی گلیوں میں غریب عراقی عورتیں Fawa Beans بیچا کرتی تھیں۔اُسے چولہوں پر دھرے بڑے بڑے پتیلوں میں پکی فوا بین کھانا کتنا پسند تھا؟ جوزفین تو ہمیشہ اُوپر سادہ دہی ڈلواتی پر نینی کو دبیس Dibis(کھجوروں کی چٹنی) ڈلوانا مزہ دیتا تھا۔

''میرے اُس بغداد کو نظر لگ گئی ہے۔'' نمی موتیوں کی صورت نچلی پلکوں میں ٹھہر گئی تھی۔

میرے اندر سے ہوک سی اٹھی تھی۔ہائے میرا لاہور اور کراچی بھی پچاس، ساٹھ ستر 70 کی دہائی میں ایسے ہی تھے۔میرا کراچی تو عروس البلاد تھا جس کی راتیں جوان رہتی تھیں۔میرے لاہور کا کیا کہنا تھا۔ مارڈالا ہمیں فوجیوں، سیاستدانوں کے مفادات اور ملاؤں کی انتہا پسندی نے۔کچھ ایسا ہی رونا یہ ڈیلی رو رہی تھی۔

خلیجی جنگ میں بھی بہت نشانہ بنے۔عراق پر امریکی حملے سے ہماری کیمونٹی بہت متاثر ہوئی۔صدام کے بارے میں بات ہوئی تو کہنے لگی'' ہماری کیمونٹی کو اُس کے زمانے میں بہت سہولتیں حاصل تھیں۔بہت آزادی تھی ہمیں۔صدام جانتا تھا ہم امن پسند لوگ ہیں۔''

کیتھولک عیسائیوں اور آرتھوڈوکس آرمینیاؤں کی عراقی کلچر و لٹریچر اور موسیقی میں بڑی خدمات ہیں جنہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

ہماری جوانی میں ہی جیوش کوارٹر ویران ہو گیا تھا کہ ہمارے سب ملنے والے یہودی اپنی جائیدادیں بیچ باچ کر اسرائیل چلے گئے مگر ہم عیسائی کہاں جاتے؟

ڈیلی کریم کی آنکھیں گیلی سی ہو گئی تھیں۔

''موصل میں ہمارا ٹورزم کا بڑا بزنس تھا۔نینوا میں میرے سسرال کے عالیشان ہوٹل تھے جو تباہ و برباد ہو گئے۔اب انہیں بیچنا مسئلہ بنا ہوا ہے۔موصل میں عیسائی کیمونٹی خاصی تعداد میں تھی جواب بہت تھوڑی رہ گئی ہے جن میں ہمارے جیسے عراق کی محبت میں لتھڑے لوگ ہیں۔

یہ کیسا اندھا تعصب پھیل گیا ہے کہ جسنے اُن ساری حسین روایات کو نگل لیا ہے؟ چرچوں کے خلاف نفرت بھڑکائی جا رہی ہے۔موصل میں دو بڑے چرچ نشانہ بنائے گئے۔گذشتہ ماہ رمضان میں ایک ہینڈ بل چرچوں میں پھینکا گیا کہ جسمیں عیسائی کیمونٹی کو اپنے گھنگار سروں کو ڈھانپنے کیلئے کہا گیا وگرنہ دوسری صورت میں موت کا سامنا کرنے کی دھمکی تھی۔یہ دھمکی القاعدہ یا زرقاوی کی طرف سے نہیں تھی بلکہ مسلم عراقی سٹوڈنس موصل کی جانب سے دی گئی تھی۔

خوبصورت لڑکی ملّی پہلی بار گفتگو میں شامل ہوئی۔

''فرانس میں جن دنوں حجاب کا مسئلہ حکومتی سطح پر زیر بحث تھا۔اُن دنوں زیادہ شدت تھی۔سوچنے کی بات ہے کہ وہاں موت کی دھمکیاں تو نہیں دی جا رہی تھیں۔

میں نے لمبی سانس بھرتے ہوئے اُن تینوں کو دیکھا اور کہا تھا۔

''میرے ملک کو بھی کسی کی نظر کھا گئی۔ہم تو خود اسی ظلم کا شکار ہو رہے ہیں۔''

وقت کا تو پتہ ہی نہیں چلا۔دروازے میں افلاق کو کھڑے دیکھ کر میں نے اُن سے اجازت لی اور باہر آئی۔

''میں آپکو ایران عراق جنگ کی monuments اور نامعلوم سپاہی کی یادگار پر لے جا رہا ہوں۔'' بڑا دھیما سا لہجہ تھا۔

''نامعلوم سپاہی کی یادگار۔میں نے زیرِ لب کہا۔وطن کے نامعلوم سپاہی ہمیشہ فرنٹ پر لڑتے ہیں۔بے چارے ہمیشہ گمنام رہتے ہیں اور صرف نامعلوم سپاہی کی یاد میں کا تمغہ پاتے ہیں۔''

لمبی سانس کھینچ کر میں نے افلاق کو دیکھا اور کسی قدر طنزیہ لہجے میں پوچھا تھا۔

''عراق سمجھتا ہے وہ فاتح تھا۔''

''دونوں احمق یہی سمجھتے ہیں۔'' اُس کا جواب سنجیدگی سے بھرا ہوا تھا۔

''پریڈ گراؤنڈ۔''

اشارہ دائیں طرف ایک وسیع و عریض قطعہ زمین کی طرف ہوا تھا۔کچھ مزید معلومات بھی اِس نوعیت کی تھیں۔ہمارے دیگر مختلف تہوار بھی یہیں منائے جاتے ہیں۔

''صدام کا کروّفر اور طمطراق دیکھنے کے قابل ہوتا تھا جب وہ یہاں آتا تھا۔''

''سارا رولا اور سیاپا اِسی کروّفر کا ہی تو ہے۔یہی چین نہیں لینے دیتا۔'' نیم جیسی کڑواہٹ تھی میرے لہجے میں۔

''اکثر قومی دِنوں پر وہ یہاں قوم سے خطاب کرتا تھا۔اُس کا شاندار محل بھی یہاں سے تھوڑی دور ہے۔''

گاڑی اسفالٹ کی وسیع و عریض سڑک پر جس کے اطراف میں اُگی جھاڑیاں اور سبزہ اِس گرم ترین شام کو قدرے بہتر ہونے کا تاثر دے رہا تھا۔ہم The Hands of victory monument کے نیچے سے گزر رہے تھے۔پہلی یادگار دیو ہیکل سی تلواریں قوسی صورت میں اُوپر اُٹھتے اور ایک دوسرے سے ملتے ہوئے کراس بناتی تھیں۔فلڈ لائٹس سڑک کی شان میں اضافہ کر رہی تھیں۔دوسری یادگار کے نیچے سے گزرتے ہوئے رُک گئے۔ان کا ایک نام The Swords of Qadisiyah بھی ہے۔ہوا تیز تھی۔شام کی دھوپ چمکدار بھی تھی اور گرم بھی۔

یہ یادگاریں اپنی اصلی صورت کے ساتھ میرے سامنے نہیں تھیں۔افلاق نے مجھے اِن کی پرانی تصویریں دِکھائی تھیں۔1986ء میں

ایران عراق جنگ کے خاتمے سے قبل ہی ان کی ڈیزائننگ اور جرمن کمپنی سے ان کے بنانے کی بات چیت شروع ہوگئی تھی۔صدام نے خود ہی فتح کو عراق سے منسوب کرلیا تھا۔اس کی ڈیزائننگ میں بنیادی تصور بھی اُسی کی دماغی اختراع تھا۔عراق کے صف اوّل کے مجسمہ ساز عادل کمال نے صدام کے تخیّلی خاکے کو حقیقت کا روپ دیا تھا۔اس کی وفات کے بعد یہ کام محمد غنی حکمت نے کیا۔

میں جو کچھ دیکھ رہی تھی وہاں ہاتھوں کی صورت بگڑی پڑی تھی۔ہزاروں ہلمٹ لڑھکے ہوئے اور جال ٹوٹے پڑے تھے جن میں یہ مقید تھے۔

میں پتھر جیسا کلیجہ لیئے افلاق کو سُنتی تھی۔

یہ ہزاروں لاکھوں ہلمٹ استعارے تھے یا حقیقی ؟ میں نہیں جانتی تھی۔افلاق انہیں اصلی کہتا تھا۔یہ اُن لاکھوں نوخیز ایرانی لڑکوں کے جنہیں فوری بھرتی کر کے محاذ پر بھیج دیا گیا تھا اور جو اس فضول جنگ کا ایندھن بن گئے تھے۔

ماں تھی نا میں۔پھول کی پتیوں جیسی شکل کی اِس Basement میں پڑے یہ ہلمٹ مجھے اُن کی سُرخ وسفید صورتیں اور اُن کی نامراد جوانیاں یاد دلا رہے تھے اور میری آنکھیں بھر بھر آتی تھیں۔اگر یہ علامتی طور پر بنائے گئے تو کتنی سفاکی کا مظاہرہ تھا۔اقتدار کتنا بے رحم ہوتا ہے؟ انسان کو گوشت پوست کا تو رہنے ہی نہیں دیتا۔

دونوں جانب تلواروں کو تھامے آہنی ہاتھ جنہوں نے دستوں کو شکنجے کی طرح جکڑا ہوا تھا۔ان ہاتھوں کی نظر آتی فولادی انگلیاں جو دراصل صدام کے ہاتھ اور انگلیوں کا عکس تھے بنائے گئے تھے اور جنہیں میں نے تصویروں میں دیکھا تھا۔

ان ہاتھوں کی تو مٹی پلید ہوگئی جب نئی عراقی حکومت نے ایک کمیٹی بنائی۔حُکم دیا اُسے کہ صدام کے دور کی ہر یادگار کو ختم کردو۔ہتھوڑے چلے اور شاندار کامیابی بڑے بڑے ٹکڑوں کی صورت میں زمین بوس ہوئی۔لوگ انہیں اُٹھانے اور بیچنے کیلئے پاگلوں کی طرح بھاگے۔

ابھی توڑ پھوڑ جاری تھی جب اپوزیشن اور Preservationist کی طرف سے بلند وبالا احتجاج ہوا۔وہ زوردار آوازوں میں چلاّتے تھے۔

''بند کرو یہ توڑ پھوڑ۔یہ تاریخ ہے۔اچھی ہے،بُری ہے،جو بھی ہے اِسے رہنے دو۔''

وزیراعظم نورالمالکی کو ایک بڑی دھمکی سفیر زلمے خلیل زاد سے ملی جس کی سخت زبان نے سارے ہتھوڑے اور چھینیاں زمین پر رکھوادیں۔

پر عراقی گورنمنٹ خیر سے ابھی اُدھار کھائے بیٹھی ہے۔حکومت میں شیعہ عناصر زیادہ ہیں۔جب بس چلاوار ہوگا۔اگر سُنی عناصر اقتدار میں آگئے تو پھر اس کی مرمت ہوجائے گی۔

''واہ اقتدار کے بھی کیا کیا اور کیسے کیسے المیے اور تماشے ہیں۔''

یادگار کا جس دن افتتاح ہو رہا تھا۔صدام سفید براق گھوڑے پر سوار یہاں آیا تھا۔افلاق کا کہنا تھا کہ اُسنے خود کو نعوذ باللہ حضرت امام حسینؑ کے روپ میں پیش کیا تھا۔

''اُلّو کا پٹھا۔احمق کہیں کا۔'' بے اختیار ہی زبان سے نکلا۔

میوزیم بھی ساتھ ہی ہے۔اُسے تو میں نے بس باہر سے ہی دیکھا اور گاڑی میں بیٹھ گئی۔

اب ایران عراق فتح کی اور یادگاریں تھیں۔

زوارہ پارک کے ہمسائے میں یہ یادگاریں ایک پیچیدہ علامتی طرزِ تعمیر کی عکاسی کرتی تھیں۔داخلے کا مرحلہ عراقی سپاہیوں کی اجازت سے سر ہوا تھا۔گیٹ پر تین فوجی کھڑے تھے۔

اندر دفتر کے آگے مزید تین سنگینوں کے ساتھ چوکس بیٹھے تھے۔چار پانچ ٹہلتے پھر رہے تھے۔عراقی بھی بہتیرے گورے چٹے ہیں اور امریکیوں میں بھی کئی کالے کٹے ہیں۔

اب یہاں والے خالص ہیں یا آمیزہ ہیں۔افلاق بتاتا تھا کہ یہ چھوٹی موٹی ڈیوٹیاں انہوں نے سقوط بغداد کے ابتدائی دنوں میں خود دی تھیں کہ لوگ خوف سے شہر چھوڑ گئے تھے۔اب تو وہ ہیڈ کوارٹر میں بیٹھے ہیں۔یہ اُنکے چیلے چانٹے ''یَس سر یَس سر'' کہتے اور سلطنت چلاتے ہیں۔چھوٹے موٹے معاملات یہ خود نپٹاتے ہیں بڑے اور اہم وہ۔یہ سب تو خیر عراقی ہیں۔

سپاہیوں کو ایک پاکستانی خاتون کا پتہ چلا تھا۔بڑی محبت کا اظہار کیا تھا۔بڑی احترام بھری نظروں سے دیکھا تھا۔باتیں بھی کچھ کی تھیں۔افلاق نے ترجمہ کیا کہ شکریہ ادا کر رہے ہیں اور آپ سے محبت کا اظہار کرتے ہیں۔

خوبصورت وسیع وعریض پارک میں تھوڑی دیر کیلئے اِس ماحول کا حُسن حیرت زدہ کرتا تھا۔نامعلوم سپاہی کا مقبرہ۔شہدا کی یادگار۔نامعلوم سپاہی کی یادگار اور مختلف شخصیات کے مجسموں اور پارکوں سے شہر کی اہم جگہیں صدام حسین نے جیسے سجائی تھیں واقعتاً وہ لاجواب تھیں۔میں تو گُنگ سی کھڑی اِسے دیکھتی تھی۔میرے لیئے اس کی تفصیلات لکھنا قطعی آسان نہ تھیں۔اُسکا اوپری حصّہ تو مجھے اُڑن طشتری جیسا لگا تھا جو اچانک کہیں فضاؤں میں اُڑتی پھرتی یکا یک گر کر یہاں رُک گئی ہے۔

کہا گیا ہے کہ یہ یادگار ایک روایتی درا ''(Diraa)'' شیلڈ کی نمائندہ ہے جو میدان جنگ میں مرتے ہوئے عراقی جنگجو سپاہی کے ہاتھوں سے گر گئی ہو۔ایک مصنوعی پہاڑی کون کی صورت جو قدرے ڈھلانی مضبوط بیموں پر بیضوی شکل میں ماربل سے ڈھنپی اور سُرخ گرینائٹ پودوں سے سجی بیضوی پلیٹ فارموں سے اُوپر جاتی ہے۔سچی بات ہے کہ میں دُور دُور تک بکھرے گھاس کے قطعوں،اُن میں اُگے بوٹوں،بل کھاتے راستوں،سُورج کی روشنی میں چمکتے تانبے کی چھت اور سٹیل کے فلیگ پول جو قومی جھنڈے کے رنگوں کو نمایاں کرتے تھے کے پس منظر میں بلند وبالا عمارتوں کو دیکھتی تھی اور خود سے کہتی تھی۔

اِس کی ساخت سے متعلق کوئی بھی تفصیل میرے لیئے لکھنی بڑی

مشکل ہے۔

اس کا نصف حصّہ اپنے ڈیزائن کے اعتبار سے کسی حسینہ کے گلے میں پہنے نیکلس جیسا لگتا تھا۔ پھر یہ کہہ سکتی ہوں کسی ٹیلر ماسٹر کا کسی خاتون کی قمیض کے گلے کا انتہائی دیدہ ریزی سے بنائے گئے ڈیزائن کا نمونہ نظر آتا ہے۔ بھئی عورت ہوں نا تو ایسی ہی مثالیں اور تشبیہیں ذہن میں آئیں گی۔

رہی اس کی اتنی پیچیدگیاں جو وہ فوجی ہمیں بتاتا تھا کوئی یاد رکھنے والی تھوڑی تھیں۔ نیچے میوزیم بھی تھا اور روشنی اوپر سے نیچے جاتی تھی۔

غیر ملکی وفود یہاں پھولوں کی چادر چڑھانے آتے ہیں۔ کیوبا کا فیڈل کاسترو بھی یہاں آیا تھا۔ مجھے ہنسی آ گئی تھی۔

فیڈل کاسترو بھی ایک شے۔ پہلے صدام کی لن ترانیاں سُنی ہوں گی۔ بلند بانگ دعوے اور گپیں کہ وہ تو امریکہ کو جُوتی کی نوک پر رکھتا ہے۔ جو کاغذ اُسے بھیجتے ہیں وہ تو پڑھے بغیر ردّی کی ٹوکری میں پھینک دیتا ہے۔ پرکاہ برابر اہمیت نہیں دیتا۔ ٹشو پیپر سے زیادہ کی حیثیت نہیں ہے میری نظر میں اُن کی۔ بڑی بڑھکیں ماری ہوں گی کہ وہ ایسے ہی مارتا تھا۔

''ہائے'' میں نے لمبی سانس کھینچی۔ تدّبر اور سیاسی فراست سے خالی کھوپڑی۔ کاش تھوڑی سی عقل کر لیتا۔ اُس وفد کی ہی بات مان لیتا جو فیڈل کاسترو نے 1990 میں اُسے یہ سمجھانے بھیجا تھا کہ وہ کویت سے اپنی فوجیں واپس بُلا لے۔ اپنی تباہی کو آواز نہ دے۔ امریکہ جیسے ہاتھی کا مقابلہ کرنا آسان نہیں۔ ہائے بے چارہ ٹشو پیپر ہی کی طرح مَسل دیا گیا۔

جی چاہا تھا آہوں کا ڈھیر لگا دوں۔

ہواؤں کے زور سے لہراتے پھڑ پھڑاتے عراقی جھنڈے کو دیکھتے اس کی آزادی و خوشحالی کیلئے دعائیں مانگتی باہر آ گئی تھی۔

گاڑی میں بیٹھی تو یہ جانتی تھی کہ اب افلاق مجھے " یادگار شہداء" لے جا رہا ہے۔ یعنی عراق ایران ڈرامے کا ایک اور اپی سوڈ۔ اب کیا کہتی جتّا تیری مرضی نچا بیلیا۔ سچی بات ہے تیل کے قیمتی ذخائر سے حاصل ہونے والی آمدنی کا ایک بڑا حصّہ اِن بے کار شوبازیوں پر خرچ ہوا۔ چلو پارکوں کی ضرورت تھی وہ بنے۔ تاریخ کی نامور شخصیات سے وہ سجے۔ اچھی بات۔ مگر یہاں خود نمائیوں اور شجاعتوں کے جو اظہار تھے وہ خیر سے ملت اسلامیہ کی قیادت کے مفلس ذہن کے عکاس تھے۔

گاڑی کی رفتار بہت تیز تھی۔ عام پبلک کیلئے یہ صرف دو دن کھُلتا ہے۔ معلوم ہوا تھا۔

یہ بھی وہیں پاس ہی تھی۔ جمہور یہ پُل سے کوئی دو میل پر مشرقی جانب یہاں بھی فوجیوں کے پہرے تھے۔ گیٹ پر بھی اور اندر بھی۔

گیٹ سے اندر داخل ہوئی تو بڑا دل خوش کُن منظر تھا۔ اُس سے کہیں زیادہ خوبصورت اور حسین جو ابھی دیکھتی ہوئی آئی تھی۔ قطعوں اور ٹکڑیوں میں بٹا۔ دائیں بائیں بل کھاتی پختہ روشوں میں پھنسا، گھاس پھُولوں اور پودوں سے سجا، اُونچے اُونچے درختوں میں گھرا۔ ریگستانی زمین کو فردوس جیسا بنا چھوڑا تھا۔ عورتوں، بچوں اور مردوں کے دم قدم سے آباد۔

یادگار تو مجھے جھیل میں کھِلے کنول کے خوبصورت پھول جیسی لگی تھی۔ یہ عظیم یادگار اتاترک کے نام پر مصنوعی جھیل کے عین درمیان ایک بڑے گنبد کی صورت میں جو درمیان میں لمبائی کے رُخ سے دو حصّوں میں منقسم ہے ہنستی کھیلتی نظر آئی تھی۔ اِسے میں پھول کی پنکھڑی بھی کہہ دوں۔ یہ دل جیسا بھی ہے۔ یہ انڈے کے بیرونی خول کے دو ٹکڑوں کی طرح بھی نظر آتا ہے۔ انہی دو ٹکڑوں کے درمیان نہ بجھنے والا شعلہ جلتا ہے۔

اور تر و تازہ سبز گھاس کے میدان جن کے درمیان پختہ راستے پر چلتے ہوئے میں نے اِس فنکار نمونے کو گہری دلچسپی سے دیکھا تھا اور افلاق کی اِس بات کو سو فیصد سچ جانا تھا کہ جب شہرہ آفاق مجسّمہ ساز کینتھ آرمیٹج (Kenneth Armitage) 1986 میں اِسے دیکھنے آیا تو اُس نے بے اختیار اس کے آرٹسٹ سمر الخلیل کو سینے سے لگا لیا۔

یقیناً لگایا ہوگا۔ اُسے لگانا بھی چاہیئے تھا۔ بڑا فنکار دُنیا کے کسی بھی خطّے میں ہو سکتا ہے۔ پس ماندہ مُلکوں میں بھی کہ ذہانت اور فن پر کسی کی اجارہ داری نہیں۔

خوبصورت بچے روشوں پر بھاگتے پھر رہے تھے۔ غم امروز اور فکر فردا سے بے نیاز۔ لکڑی کے خوبصورت پُلوں سے چھلانگیں مار رہے ہیں۔ ان کے والدین باتیں کرتے، کہیں چہل قدمی کرتے اور کہیں بیٹھے نظر آتے۔

افلاق کچھ لوگوں کے پاس کھڑا تھا۔ شاید وہ انہیں جانتا تھا۔ میں سلیب پر بیٹھی اردگرد دیکھتی تھی۔ پھر میں نے اُسے ایک جوڑے کے ساتھ اپنی طرف آتے دیکھا۔ ہم سب متعارف ہوئے۔ ماڈرن سی خاتون جو مستنصر بازار میں گارمنٹس کا کاروبار کرتی تھی۔ شوہر بزنس مین تھا۔ تین پیارے پیارے بچے۔ سچے اور کھرے لوگ۔ خاتون صاحبِ نظر تھی۔ صدام کی تعلیمی پالیسیوں کی مدّاح۔ پورے مُلک میں کے جی سے یونیورسٹی لیول تک تعلیم فری۔ نصاب ایک۔ اُس کے قائم کردہ سٹڈی سرکل جہاں ہر پڑھی لکھی خاتون کو عورتوں کو پڑھانے کیلئے جانا لازمی ہوتا۔ کہہ لیجیے تعلیم بالغاں سینٹر۔ اُس نے ہر عراقی کو پڑھا لکھا بنایا۔ یہ کریڈٹ اُسے دینا پڑے گا۔ صحت کو اُس نے بڑی اہمیت دی۔ پورے عراق میں تقریباً دو سو پچاس فلٹریشن پلانٹ لگائے۔ صنعتیں اُس کی ترجیح تھیں۔ وہ اوّل و آخر ایک عراقی تھا۔ ظالم و جابر تھا۔ مُلک میں امن امان تھا۔ آزادی رائے پر پابندی تھی مگر لوگوں کی بہتری اور ان کی خوشحالی کا خواہاں تھا۔

باتیں شروع ہوئیں تو جیسے پردے چاک ہونے لگے۔ ایران عراق جنگ پر اُس نے لمبی سانس بھری تھی مگر فریقین کو لعن طعن کی بجائے اس کے پاس نئی نسل کا دُکھ تھا کہ اُس کے دو بھانجے بھی اِس آگ کا ایندھن بنے تھے۔

''آپ سوچ بھی نہیں سکتی ہیں کہ دونوں اطراف کی نوخیز اور نوجوان نسل کیسے خزاں رسیدہ پتوں کی طرح فنا کی دھول میں گُم ہوئی۔''

اُس کا شوہر ابوبکر محمد الزکریا مجھے کم گومعلوم ہوتا تھا کہ اب تک کی گفتگو میں دوسری بار شامل ہوا تھا۔

''اندازاً کوئی پونے تین لاکھ ایرانی ڈھائی لاکھ عراقی اِس بے کار جنگ میں ختم ہوئے۔کوئی اسی ۸۰ ہزار تعداد زخمیوں اور دس لاکھ کے قریب متاثرین تھے۔باقی نقصان بھی بے شمار تھا۔دُنیا نے تماشا دیکھا۔اور اپنے اپنے مفادات کا تحفظ کیا اور خوش ہوئے کہ دو مسلمان مُلک جو بڑھتی ہوئی طاقت تھے کمزور ہوئے۔کاش صدام سمجھدار ہوتا۔کاش امام خمینی بصیرت سے کام لیتے اور دونوں مُلک تباہ ہونے سے بچ جاتے۔''

پھر انہوں نے اجازت چاہی۔دونوں میاں بیوی نے اپنے گھر آنے کی دعوت دی۔وہ ال اُمل (ul'ummal) کے علاقے میں شارع خالد بن ولید پر رہتے تھے۔موبائل کا سیل نمبر انہوں نے میری کاپی پر لکھا اور گھر آنے کی پُر زور تاکید کی۔لائبریری ضرور گئی۔پر میں نے کِسی بھی چیز کو شوق و رغبت سے نہیں دیکھا۔یہاں اخبارات،کتابوں اور ویڈیو فلموں کی صورت پورا ریکارڈ موجود تھا۔نگران کِسی کام میں غالباً مصروف تھا۔پاکستان کا جان کر خوش ہوا۔چہرے پر مسکراہٹ بکھیری۔اور اس سوال کے جواب میں کہ کیسا محسوس کرتے ہیں جب آپ غلام بن جائیں تو۔

اُس نے بتیسی نکالی،خوش دلی سے ہنسا اور کہا۔

''لو کیا پہلے نہیں تھے۔اپنے کے تھے۔اُسے ہماری زبان کھولنی پسند نہ تھی۔اب دوسرے کے ہیں تو انکے منہ پر جُوتے بھی مارتے ہیں۔''

مجھے ہنسی آ گئی تھی۔بش اور منتدرُل زیدی دونوں آنکھوں کے سامنے تھے۔کاش میں مُنتدر ل زیدی سے مل سکتی۔دلبر بچہ جیل میں تھا۔

لائبریری میں میں اور افلاق ہی تھے۔ملحقہ لیکچر روم تھا۔ایک آڈیٹوریم بھی ہے یہاں۔

اور پھر میں آڈیٹوریم میں بیٹھی اُسے سنتی تھی جو ادارے کا منتظم اعلیٰ تھا۔سلیمانیہ کا کُرد عبدلکریم احمد بڑے گہرے اور پھیلے ہوئے وژن کا مالک۔میں نے امریکہ کے کردار کے بارے میں جاننا چاہا تھا اور وہ بولا تھا۔

''دراصل بنیادی خرابی یہیں تھی۔امریکہ سے انقلاب ایران ہضم نہیں ہو رہا تھا۔وہ اپنے اُس پٹھو شاہ ایران کی دوبارہ بحالی کیلئے سرگرم تھا۔صدام حسین بھی اس جیسی خواہشات رکھنے والا اُسکا چہیتی بھائی بند تھا۔اسی لیئے امریکہ کو صدام کے علاوہ کوئی اور موزوں بندہ نظر نہیں آتا تھا۔

ایک بڑے مذہبی رہنما ہونے کے باوجود کہنا پڑے گا کہ امام خمینی بھی اُس سیاسی بصیرت سے محروم تھے جو اُن جیسے انقلابی کیلئے ضروری تھی۔انہیں عراق کی شیعہ آبادی پر کیے جانے والے جبر اور پابندیوں پر غُصہ تھا۔عراقی حکومت ان کے نزدیک شیطانی تھی اور وہ اپنی پوری توانائیوں سے نعرہ بازی میں مصروف تھے۔اور اس اہم نُقطے کو انہوں نے قابل توجہ نہیں سمجھا تھا کہ تب عراق کی شیعہ آبادی کی اکثریت مسلک سے کہیں زیادہ اپنے عراقی تعلق کی وفادار تھی۔اُن کیلئے اپنا مُلک ،قبیلہ اور تاریخ کہیں زیادہ اہم تھی۔گو اب یہ صورت کُلی طور پر بدل گئی ہے۔

فوج میں 1920 سے 1958 تک شیعہ عنصر نہ ہونے کے برابر تھا مگر آزادی کے فوراً بعد اسمیں بہت اضافہ ہوا۔اب ذرا بڑی طاقتوں کے مفادات کو تو دیکھیں۔

امریکہ اور برطانیہ کی سپورٹ عراق کے لئے۔اسرائیل عراق کی بڑھتی طاقت سے خائف،ایران کا مددگار اور حامی۔خیر سے بڑی اور فضائی جنگ میں ٹینکوں اور طیاروں کے پُرزوں کی تیز ترین فراہمی اسرائیل کے توسط سے انجام پا رہی تھی۔جنگ طول پکڑ رہی تھی اور لاشوں کے ڈھیر لگ رہے تھے۔

صدام کو اپنی حماقتوں کا تو شاید احساس نہ ہوا ہو پر اپنا مستقبل ضرور داؤ پر لگتا نظر آیا تھا۔جھکنے میں عافیت جانی اور یک طرفہ جنگ بندی کی ذاتی پیش کش کر دی۔

قوموں کی تاریخ میں ایسے شاید جنم نہ لیں اگر کہیں فہم و فراست اور تدبر کے دیئے کوئی ایک طرف ہی جلا دے۔

اب امام خمینی نہیں مانے۔۱۹۷۵ والی بین الاقوامی سرحد کو مستقل تسلیم کرنے اور امام خمینی سے انکی پسند کے کِسی مقام پر ملنے کا صدام کی طرف سے اظہار ہوا۔مگر وہاں ٹھوس انکار تھا۔

آٹھ سال خون مسلم کی ارزانی۔اسلحہ کے بیوپاریوں کی موجیں۔جنگ کا اختتام جب ہوا۔نتیجہ یہ تھا کہ اِس لاحاصل جنگ کا کوئی فاتح نہیں تھا۔دونوں کے حصّوں میں تباہی بربادی اور کمزوری آئی تھی۔

یہ یادگار شہدا جسے دیکھ کر دل دُکھا تھا۔اس کے بنانے کی کوئی ضرورت تھی۔ایسی ہی حماقت کا اظہار ایران نے بھی کیا ہوگا۔

میں نے افلاق سے پوچھا تھا۔

تہران میں مَیں نے ''خون کا فوارہ'' دیکھا ہے۔وہ اس دعوے کے ساتھ ہے کہ انہوں نے عراق کا کچومر نکال دیا ہے۔

میں نے باہر آ کر کھلے آسمان کو دیکھا تھا۔

پتے ہواؤں کے زور سے لہراتے اور گرتے تھے۔راستے کشادہ اور خوبصورت تھے۔ایک طرف جھیل کا پانی سورج کی کرنوں سے چمکتا اور ہواؤں کے زور سے تھرتھراتا نظر آتا تھا۔

پھر جانے میں چلتے چلتے کیوں بیسمنٹ (Basement) میں اُتر گئی۔جہاں گرینائٹ کے پتھروں پر وہ نام تھے جو اس جنگ کا ایندھن بنے۔میں تو اپنا پلّو اسی سوچ سے چھڑا نہیں پا رہی تھی اور بے اختیار سوچے چلی جا رہی تھی کہ اُنہوں نے کِس کو پچھاڑا؟ کس کو مارا یا شہید کیا؟ دونوں شہیدوں کا دعوے کرتے ہیں۔شہید

کون ہیں؟ بے چارے معصوم سے لوگ جو حکمرانوں کی حماقتوں کی بھینٹ چڑھے۔

سیڑھیوں سے اوپر علامتی یادگار کے درمیان عراق کا جھنڈا لہراتا ہے۔ میرا دل وہاں بیٹھنے کو چاہ رہا تھا۔ پھر جیسے مجھے خود پر شدید غُصہ آیا۔

''یہ میں کس مسئلے میں اُلجھ گئی ہوں۔ ایران عراق تو پھر دو قومیں ہیں۔ مسلمان ہیں تو کیا؟ میری تو اپنی قوم نے اپنے ہی ہم وطنوں اور ہم مذہبوں پر ظلم وستم کے وہ پہاڑ توڑے تھے کہ خون کی ندیاں بہہ گئیں۔ 1971 یاد آیا تھا۔ سیاست دانوں کی ضدیں، جرنیلوں کی خودغرضیاں۔ بنگلہ دیشی یاد آئے تھے۔ مکتی باہنی یاد آئی تھی۔ انسانیت کہاں رہی تھی؟ اور بغداد کی تاریخ کونسی کم ہے؟ امویوں اور عباسیوں کے خونین معرکے۔ عباسیوں نے جو حشر امویوں کا کیا۔ بغداد کی پہلی بربادی امین اور مامون کے ہاتھوں ہی تو ہوئی۔ تاریخ کی خون ریزیاں۔

بلاشبہ انسان بہت خسارے میں ہے۔ میں شیشے کی طرح چمکتے فرش پر احتیاط سے چلتے ہوئے سب کو دفع دُور کر رہی تھی۔

میری کچھ پینے کی خواہش پر افلاق کولا کے ٹن پیک لے آیا۔ میں کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''ارے میرے سویٹ سے بچے۔ عمر دراز ہو تمہاری۔ پوچھ تو لیتے کہ مجھے کیا چاہیئے تھا؟ اب جو تھوڑی بُہت محنت ہو رہی ہے اِس موٹے سے وجود پر یہ اِن کولاؤں سے وہیں پھر آجائے گا اور کیے کرائے پر پانی پھر جائے گا۔''

وہ ہنسا پر بولا کچھ نہیں۔ یہ بات وہ گذشتہ پانچ دنوں سے گاہے گاہے وقفوں سے میرے منہ سے سُنتا تھا۔

مجھے جارج اینچ پاؤل یاد آیا تھا۔ جس نے کہا تھا۔

What is the use of worrying?It never was worth while.So pack up your troubles in your old Kit bag.and Smile, Smile, Smile.

میں کھڑی ہوگئی۔ میں نے افلاق کی طرف دیکھا اور کہا۔ افلاق

I am packing up my worries in my old Kit bag.

and I am going To Smile, Smile, Smile.

بقیہ: لائق اولاد

عشرت حسین نے ٹالنے والے انداز میں جواب دیا۔ HE IS MY FRIEND(وہ میرے دوست ہیں)

الہ آباد کے جج اکبر الہ آبادی نے صراحت کر دی۔

I AM NOT HIS FRIEND- I AM HIS MOTHER'S FRIEND

(میں اس کا دوست نہیں بلکہ اس کی اماں کا دوست ہوں)

صفیہ اختر کو تڑپنے کے لیے بھوپال میں چھوڑ کر ایک دوسری عورت کے ساتھ جاں نثار اختر ممبئی میں مزے اڑا رہے تھے۔ کم سن جاوید اختر کے دل میں اپنے باپ کے لیے کچھ اچھے جذبات نہیں رہ گئے تھے۔ وہ ساحر لدھیانوی سے مالی مدد حاصل کرتے تھے مگر اپنے باپ جاں نثار اختر سے قطع تعلق کر رکھا تھا حالانکہ جاں نثار بھی ساحر کے گھر پر ہی پڑے رہتے تھے مگر جاوید ان سے ملنا بھی گوارا نہیں کرتے تھے۔

اپنی جدوجہد کے دور میں باپ کے نام کو کیش CASH کروانے کی جاوید نے گلبرگہ و مدراس میں کوششیں بھی کیں۔ چنانچہ جاں نثار اختر نے بعض اخبارات ورسائل میں یہ اعلان چھپوا دیا کہ کوئی لڑکا اپنے آپ کو ان کا بیٹا بتا کر ادبی برادری کو ٹھگ رہا ہے۔ اس سے ہوشیار رہا جائے۔

پھر ایک دن وہ بھی آیا کہ اپنی شرطوں پر فلمی دنیا کا استعمال کرنے والے جاوید اختر نے اپنی کسی بھی فلم کے گانے جاں نثار اختر سے نہیں لکھوائے۔

وہ گوشۂ گم نامی میں مرے۔

مخفی مبادکہ علامہ اقبال نے بھی اپنے بڑے بیٹے آفتاب اقبال سے برأت کا اسی طرح اعلان کیا تھا جب وہ انگلستان میں زیر تعلیم تھے اور سر اکبر حیدری سے اپنے تعلیمی اخراجات کے سلسلے میں تعاون کے درخواست گزار ہوئے تھے۔ انگلستان میں سر اکبر حیدری نے آفتاب کی کچھ مدد بھی کی تھی۔ بعد میں باپ بیٹے میں مصالحت کروانے کے جتن بھی کیے تھے۔

بہار کے ایک سخن ور دوراں جو کمیونسٹ تھے اپنے گھر والوں پر بڑا ظلم کیا کرتے تھے۔ انھیں یہ اندیشہ ہی نہیں تھا کہ ان کا وہ بیٹا جسے وہ پیٹا کرتے تھے کچھ لکھ پڑھ لے گا اور بہ انداز جمال باپ کے جلال کی کہانی لکھ ڈالے گا اور ایک ہفتہ وار میں چھپوا بھی دے گا بھلے ہی اپنے نام کے ساتھ باپ کے نام کی نسبت کا لاحقہ بھی رکھے گا۔

حیدر آباد کے مشہور و ممتاز افسانہ نگار اقبال متین اپنے دو بیٹوں کے ساتھ ایک فلیٹ میں رہتے ہیں جس کا کرایہ چھے ہزار روپے ماہانہ ہے۔ دونوں بیٹے بیرون ملک کمار ہے ہیں۔ فلیٹ کا کرایہ دونوں بیٹے ہر ماہ دو دو ہزار روپے بھیجا کرتے ہیں باقی کے دو ہزار روپے اقبال متین ادا کرتے ہیں۔ یہ بات خود اقبال متین نے مجھے بتائی اور اپنا ایک دردناک مطلع بھی سنایا۔

وہ ایک سچ مرے مولا مگر نہیں جاتا مرا قصور یہی ہے کہ مر نہیں جاتا

''چشمِ ناحق''

سید سعید نقوی
(نیویارک)

کچھ تو ہونے کی شرمساری ہے
اور خوفِ زیاں بھی بھاری ہے

ہم ہیں زندہ سرابِ امکاں میں
ورنہ حالات پہ سکتہ طاری ہے

رک گئے ہیں زمیں کی حدت سے
پھر بھی رسمِ سفر تو جاری ہے

ہاتھ اوچھا رہا اناڑی کا
اس لیے زخم اتنا کاری ہے

حسنِ منظر کا دوش زیادہ تھا
چشمِ ناحق کیوں اشک باری ہے

دل کا کھونا اک حادثہ تھا سعیدؔ
باقی جو کچھ ہے اختیاری ہے

پروفیسر زہیر کنجاہی
(راولپنڈی)

کتنی مجھ کو پریشانی ہے دل کے لگانے میں
دیر تو آخر لگ جاتی ہے گھر کو بسانے میں

دُور بہت کیوں رہتا ہے وہ میری نظروں سے
اتنا وقت نہیں ہے لگتا آنے جانے میں

لفظوں لفظوں دیکھی ہے تصویرِ جوانی کی
ہم کو ایسا لطف ملا ہے شعر پُرانے میں

میں نے سینہ کھول کے رکھا کرتے عشقِ ستم
تُم کو بھی کیا عذر ہوا تھا تیر چلانے میں

تُم تو اس کی شیرینی میں ڈوب گئے ہو اب
کتنا میٹھا درد بھرا ہے میرے افسانے میں

میرے گھر میں کبھی تو ہوگا چین آرام زہیرؔ
سر سٹھ سال گزارے میں نے جس کو بنانے میں

عرش صہبائی
(جموں، کشمیر)

غم کا چشمہ اُبلتا رہتا ہے
درد سینے میں پلتا رہتا ہے

اک سے رہتے نہیں کبھی حالات
وقت کروٹ بدلتا رہتا ہے

کوئی صورت ہو کوئی عالم ہو
آپ کا ذکر چلتا رہتا ہے

ذہن میں جب خیال ہو اُس کا
دل کی صورت مچلتا رہتا ہے

راہ میں مشکلیں بھی آتی ہیں
کارواں پھر بھی چلتا رہتا ہے

آج کے دور میں ہر ایک بشر
اپنا چہرہ بدلتا رہتا ہے

کیا کرے گا سلوک پھولوں سے
کلیوں کو جو ملتا رہتا ہے

اس سے ہوتی ہے جب بھی کوئی بات
اس کا رُخ وہ بدلتا رہتا ہے

جو نہیں مصلحت پسند اے عرشؔ
اہلِ دنیا کو کھلتا رہتا ہے

○

نعیم الدین نظر (میرپورخاص)

جو ہماری نظر میں رہتا ہے — وہ ہمیشہ سفر میں رہتا ہے
اُس کو میری ہوا نہ لگ جائے — جو پرائے اثر میں رہتا ہے
جس کو دنیا سے پیار ملتا ہے — کب وہ اجڑے نگر میں رہتا ہے
گھر کو سیلاب کھا نہ جائے کہیں — خوف یہ بام و در میں رہتا ہے
چاند پر گھر بناؤں گا میں بھی — یہ جنوں میرے سر میں رہتا ہے
مجھ سے بچھڑا ہوا ستارہ اب — جانے کس رہ گذر میں رہتا ہے
بھید سارے وہ کھولتا ہے نظرؔ — گھر کا بھیدی جو گھر میں رہتا ہے

○

خورشید انور رضوی (اسلام آباد)

کل جو دیکھے گئے تھے درِ یار پر — آج دیکھا اُنہیں تختۂ دار پر
صد مبارک ہے ذِلت کی اُس جیت سے — جو خجالت مقدر ہوئی ہار سے
ظلم جب بھی کرے گا کوئی لشکری — سارا الزام آئے گا سردار پر
کون جانے یہ کب کس کی رگ پر چلے — ناز مت کیجیے اپنی تلوار پر
جو بدلتے رہے آئے دن اپنے رنگ — کیا بھروسہ رہے اُن کے کردار پر
کاش! اپنے گریباں میں جھانکیں کبھی — ساری تنقید ہے اپنی اغیار پر
کل کا سورج دکھائے خدا خیر سے — آج کی رات بھاری ہے بیمار پر
دل لہو تھا تو پلکیں تھیں یوں خوں فشاں — جیسے گل ہوں کھلے نوکِ ہر خار پر
ہم نے دیکھا تو تھا ہم نے پوچھا نہیں — خون کس کا وہ تھا دامنِ یار پر
اب یہ بے کار ہیں سب زباں بندیاں — اب تو دل کی لکھیں لوگ دیوار پر

○

سلیم ناز (کراچی)

سچ بولنے کے جرم میں سولی چڑھا دیا — لوگوں نے میرا مرتبہ کتنا بڑھا دیا
مفلس کی آدھی بات ہوا میں بکھر گئی — صاحب نے جلد کار کا شیشہ چڑھا دیا
مانگی دعائے رزق تو اُس بے نیاز نے — فاقہ زدہ کا اوراکِ فاقہ بڑھا دیا
رسوائیوں کے بعد کوئے یار سے آخر — میں نے قدم ہٹا لیا تھا پھر بڑھا دیا
زندہ ہے۔ سارا شہر مگر زندگی نہیں — یہ کس نے زندگی کا جنازہ پڑھا دیا
کیا کیا مزارِ عشق کے نذر و نیاز میں — میں نے تو جان و دل کا چڑھاوا چڑھا دیا

○

شگفتہ نازلی (لاہور)

صد شکر سارے سجدوں کا حاصل خدا رہا
سر پہ مرے وہ بن کے رِدائے دُعا رہا

ظاہر میں گو کہ کچھ بھی نہیں آتا تھا نظر
احساس اُس کا پھر بھی ہمیں جا بجا رہا

جس سے اگر گزرتے تو منزل تھی سامنے
رستہ ہمیشہ سے ہی وہ زنجیر پا رہا

سنتے ہی جس کو بیتے دن جوں لوٹ آتے تھے
کیا گیت تھا جواب بھی سب کو دلربا رہا

دورانیہ طویل جو ملتا تو کیا تھی بات
اک پل کا بھی خیال کتنا جانفزا رہا

کتنے ہی حربے جینے کا رخ موڑنے کے تھے
معلوم تب ہوا کہ جب سے لا دوا رہا

اب تک یہی کسی سے نہیں طے ہی ہو سکا
تھا بیوفا کہ یا تھا وہ باوفا رہا!

حفیظ انجم کریم نگری (بھارت)

ایسے ویسے کیسے لوگ!
عہدوں پر ہیں بیٹھے لوگ

میلے کچلے من کے لوگ
اُجلے کپڑے پہنے لوگ

زہر سے بھی ہیں کڑوے لوگ
دنیا سمجھی میٹھے لوگ

ان سے مت باندھو اُمید
کالے من کے گورے لوگ

بے شرموں کی دنیا ہے!!
عُنقا ہے شرمیلے لوگ

محلوں میں رہنے والے
کتنے ہیں یہ سستے لوگ

محنت سے ہے بیر اِنہیں
اچھے خاصے مسنڈے لوگ

کوئی مری سنتا ہی نہیں
سب ہیں گونگے بہرے لوگ

بے شک ایک زمانہ تھا
ہوتے بھی تھے ڈھنکے لوگ

گھر سے گھر بھر آئے ہیں
کفنانے دفنانے لوگ

دل میں دہکتے شعلے ہیں
گھر آئے ہیں ملنے لوگ

سب تنقیص میں ماہر ہیں
ادب سے بھی انجانے لوگ

منہ نہ لگو ان کے انجم!!
ہیں یہ بلکل ہلکے لوگ

وشال کھُلّر (لدھیانہ، بھارت)

بات کچھ ہوگی تو پھر خود ہی چلا آئے گا
وہ مرے ساتھ میں رہ لے گا مزا آئے گا

کیسی اُمید پہ قائم ہیں کہ چلتے چلتے
کس کو معلوم تھا اک اور خلا آئے گا

دل سمندر میں وہ دریا کی طرح اترے گا
ہو کے جب اپنی پناہوں سے رہا آئے گا

اس کے آنے میں کسر ہے کہ وہ جب آئے گا
دیکھنا قوسِ قزح ! رنگ جُدا آئے گا

جیسے تنہائی میں کھُلتا ہے خیالی پیکر
مجھ کو دیکھے گا تو وہ بند قبا آئے گا

دھوپ بن کر تو کبھی بن کے ہوا گزرے گا
دھیان رکھنا کہ ابھی دورِ وفا آئے گا

ہم خیالوں میں ترا روپ بسا رکھیں گے
جب بھی آنکھوں میں کوئی خواب نیا آئے گا

○

نویدسروش (میرپورخاص)

آنکھیں، منظراور خدشات — دکھ کا ساگر اور خدشات
عفت آنسو بدحالی — اُجلی چادر اور خدشات
دعد، اندیشے سازش — دشمن سر پر اور خدشات
بے امنی نا انصافی — حالت ابتر اور خدشات
حملے، دہشت، ویرانی — لاشیں بے سر اور خدشات
روز دھماکے ہنگامے — برپا محشر اور خدشات
پیاسے چشمے اور دریا — دھرتی بنجر اور خدشات
آنکھیں پرنم لب لرزاں — ہر دل مضطر اور خدشات
چوکی، پہرا اور کھڑکی — دیوار و در اور خدشات
نگراں، رہبر اور منصف — سب سوداگر اور خدشات
رنجش، بندش، مکّاری — جادو، منتر اور خدشات

○

مالک سنگھ وفا (جموں،کشمیر)

جو بھی ہے قدم میرا وہ تیزی سے رواں ہے — معلوم نہیں منزلِ مقصود کہاں ہے
تاحدِ نظر زندگی میں غم کا دھواں ہے — تفسیر سے باہر ہے جو یہ ایسا سماں ہے
آ جاتیں وہ اے کاش کبھی بہرِ ملاقات — کچھ رُت بھی سہانی ہے کچھ موسم بھی جواں ہے
اس چیز کی وقعت تھی کسی وقت مگر آج — انسان کو انسانیت کا پاس کہاں ہے
یہ قصّۂ پارینہ ہے تو ساتھ تھا میرے — اب میرے مقدر میں ترا قرب کہاں ہے
اب اور بیاں کیا کروں تفصیل میں اس کی — جو حال ہے میرا مرے چہرے سے عیاں ہے
ہے ایک حقیقت مجھے انکار کہاں ہے — اردو جسے کہتے ہیں محبت کی زباں ہے
کیوں دل میں چھپا کر اسے رکھتا ہے وفا تُو — جو راز بھی ہے تیرا زمانے پہ عیاں ہے

○

اصغر شمیم (کولکتہ،بھارت)

پل دو پل پُل صراط پر چلنا — کتنا مشکل ہے یہ سفر کرنا
راستے پیچ دار ہونے لگے — ہر قدم اپنا پھونک کے رکھنا
سن کے جس کو یہ دل مچل جائے — ایسا قصہ بیان مت کرنا
یہ جہاں اک سرائے فانی ہے — کون چاہے گا عمر بھر رہنا
مل ہی جائے گی ایک دن منزل — دل میں اصغر یہ حوصلہ رکھنا

○

کرشن گوتم
(چندی گڑھ، بھارت)

تان کی ایک ہلکی جنبش میں سات سمندر جُھول گئے
پربت جیسے طوفانوں کے سارے طُول فضول گئے

نکتہ دانوں کو سب نکتے اک نقطے میں بُھول گئے
آئے گل افشانی کرنے، بکتے اول جلول گئے

مجھ میں کیا دیکھا کہ مری وحشت کو جولانی سے
رنگ و نور کی دنیا والے اپنے آپکو بھول گئے

ناز اُٹھاتا سندرتا کے کون بھلا صحراؤں میں
اپنی جھلسی خوشبوؤں میں گھٹ کر مرتے پھُول گئے

کون سی سندر دُلہن تھی وہ جسکو لانے کی خاطر
ماں کے پیارے گبھرو بیٹے دار و رسن پر جھُول گئے

نعرۂ شبگیر لپکتا شعلہ تھا دیوانے کا
آسمان تک محل منارے جل کے اُڑاتے دُھول گئے

مہر و وفا کے آگے کب تک ٹھہر سکے ہیں جبر و ستم
ہستی کے قرطاس پہ جھپٹے بن کر نامعقول گئے

تیغ ہو یا چنگیز ہو کوئی آہِ رسا سا تیز نہیں
ہاو ہُو میں دنیا کی کیا گوتم! اتنا بھول گئے؟

○

شمیم ادیب (حیدرآباد، دکن)

غزل ہی سہی گنگنا کر تو دیکھو
خیالوں میں جنّت بسا کر تو دیکھو

انہیں اپنی چھت پر بُلا کر تو دیکھو
شرابِ محبت پلا کر تو دیکھو

پتہ تو چلے گا کہ دنیا بھی کیا ہے
سرابوں کے ہمراہ جا کر تو دیکھو

چکوروں کے مانند اُڑو آسماں تک
چمکتے ستاروں پہ چھا کر تو دیکھو

کنول چاہتوں کے کھلیں گے ندی میں
کبھی بارشوں میں نہا کر تو دیکھو

ملے گا تمہیں روشنی کا کنارا
اندھیرے کی چادر ہٹا کر تو دیکھو

بہاروں کی آمد رہے گی چمن میں
گلوں کا تقدس بڑھا کر تو دیکھو

پرندوں کی جھرمٹ بھی اچھی لگے گی
وہی گیت پھر سے سنا کر تو دیکھو

شمیم انکی زلفوں کا سایا حسیں ہے
اسے بازوؤں سے ہٹا کر تو دیکھو

○

سبھاش گپتا شفیق (ہوشیار پور، بھارت)

میں ہر جانب جو منظر دیکھتا ہوں
نہ دیکھا جائے ہے پر دیکھتا ہوں

کبھی تکتا ہوں میں اسکو مسلسل
کبھی کچھ دیر رک کر دیکھتا ہوں

کسی نے دھول کیا آنکھوں میں ڈالی
میں اب پہلے سے بہتر دیکھتا ہوں

نہیں میرے سوا اس گھر میں کچھ بھی
تو کیا راتوں کو اُٹھکر دیکھتا ہوں

ملے شاید مجھے آرام یوں ہی
کسی مشکل میں پڑ کر دیکھتا ہوں

کٹا ہے جسمیں بچپن خواب میں بھی
شفیق اب تک وہی گھر دیکھتا ہوں

○

''مقدمے کا فیصلہ محفوظ ہے''

پروفیسر خالد اشرف
(دہلی، بھارت)

اردو غزل قدیم عربی و فارسی روایات کی دین ہے۔ آج جب کہ غزل کا سرمایہ چار صدی سے زائد کے عہد پر محیط ہے، لوگوں سے کہا جا سکتا ہے کہ کلاسیکی مشرقی روایات کی زائیدہ ہونے کے باوجود غزل میں پرانے اور روایتی مضامین کی تکرار اور الفاظ کی نشست کی معمولی تبدیلیوں کے علاوہ غزل گویوں کا ایک رویہ تقلید شکن اور تجرباتی بھی رہا ہے۔ مثال کے طور پر قلی قطب شاہ کے بہ نسبت ولی دکنی کی شاعری زیادہ متنوع اور جدید معلوم ہوتی ہے۔ اسی طرح میر، سودا اور میر درد کے برعکس مرزا غالب کی غزل اور مکاتیب ایک ایسے دانش ور فنکار کو متعارف کراتے ہیں جو نئی انگریزی سیاست و معیشت کے زیر اثر ہونے والی اجتماعی و انفرادی تبدیلیوں سے مکمل طور پر آگاہ ہے۔ یہی صورتحال داغ کے مقابلے میں حالی اور محمد حسین آزاد کی ہے اور یہی جدیدیت پسندی اقبال اور حسرت موہانی کے مقابلے میں فیض اور راشد کی تخلیقات میں پائی جاتی ہے۔

ترقی پسندوں نے ابتدا غزل کے روایات کو مسترد کیا، لیکن ترقی پسندوں ہی کی صفوں سے فیض، مجروح، سردار جعفری اور جذبی جیسے شعراء نے غزل کے روایتی ڈھانچے میں شکست و ریخت کر کے اسے ایک سیاسی محاورہ اور نیا لہجہ عطا کیا۔

ہندوستان کی آزادی اور پاکستان کے قیام کے بعد ایک طرف ترقی پسندی کا بلند آہنگ دھیما ہوا، دوسری طرف حسن عسکری، انتظار حسین اور سلیم احمد وغیرہ نے ''اسلامی ادب/ پاکستانی ادب'' کا شاخسانہ کھڑا کیا جو ۱۹۵۱ء میں فیض اور سجاد ظہیر وغیرہ کی گرفتاری اور انجمن ترقی پسند مصنفین (پاکستان) پر سرکاری پابندی سے از خود ٹھنڈا پڑ گیا۔ پاکستان میں جب بدعنوانی، اقربا پروری اور فوجی آمروں کے جمہور کش رویوں نے آزادی سے قبل کے دکھائے گئے خوابوں کو شکست پہنچائی تو وہاں کے شاعروں کا عمومی لہجہ حزن، شکفتگی اور تنہائی کا تشکیل پایا۔ اس لیے ناصر کاظمی، منیر نیازی، افتخار عارف، مجید امجد اور اطہر نفیس وغیرہ کی غزلوں اور نظموں کا مجموعی تاثر امید افزا اور مثبت نہیں ہے۔

تاہم مروجہ سیاسی اور جاگیرداری جبر و استحصال کے ردعمل کے طور پر پاکستانی شاعری میں احتجاج اور مزاحمت کا محاورہ بھی متعارف ہوا اور انسانی مسائل کو بھی زیر بحث لایا جانے لگا۔ فیض، احمد ندیم قاسمی، احمد فراز، ظہیر کاشمیری، ابن انشاء، فہمیدہ ریاض، کشور ناہید، سارہ شگفتہ، زہرہ نگاہ، شائستہ حبیب، فارغ بخاری، رضا ہمدانی اور توقیر چغتائی وغیرہ کی شاعری میں احتجاج و مزاحمت کا ایک نیا آہنگ جاری رہا، جس کی بنا پر اس گروپ کو بہت طرح کے نقصانات اور عذاب برداشت کرنے پڑے۔

پاکستانی ادبیات کی ایک شناخت اس کی ذولسانیت 'BI-LINGUALISM' بھی ہے۔ یعنی ایسے ادیبوں اور شاعروں کی خاصی تعداد موجود ہے جو بیک وقت اردو/ سندھی اور اردو/ پشتو وغیرہ زبانوں میں شاعری کرتے یا نثر لکھتے ہوئے مل جائیں گے۔ اس ذولسانیت کی مثالیں بالخصوص پنجاب کے صوبے میں زیادہ ہیں جہاں کئی صدیوں سے ادیب اور شاعر اپنا اظہار مادری زبان اور ادبی زبان دونوں میں متوازن طور پر کرتے رہے ہیں۔ اسی ذولسانیت کی روایت کو ترقی دینے والے ادیبوں اور شاعروں میں ایک نام فخر زماں کا بھی ہے۔ فخر زماں بنیادی طور پر پنجاب کے ادیبوں کے بائیں بازو کے جرگے: عبداللہ حسین، احمد فراز، انور سجاد، ابن انشاء، کشور ناہید، رشید احمد، احمد جاوید، سمیع آہوجا اور احمد داؤد وغیرہ سے تعلق رکھتے ہیں جنھوں نے تشکیل پاکستان کے بعد تقریباً ۷۰ویں دہائی میں لکھنا شروع کیا اور یہ صرف اتفاق نہیں ہے کہ یہ گروہ اپنے ماضی کی روایات کا سلسلہ عرب و ایران سے نہیں، بابا شیخ فرید، بابا بلھے شاہ اور شہید بھگت سنگھ کی مشترکہ پنجاب کی قدیم روایات سے جوڑتا ہے۔

فخر زماں کا سیاسی و ثقافتی شعور بالخصوص جنرل ضیاء الحق کے مارشل لاء (۱۹۷۷ء۔۸۸) کی پیدا کردہ جبر و تعذیب کے ردعمل میں پروان چڑھا۔ اسی سیاہ دور میں ان کی پانچ تصانیف پر پابندی عائد کی گئی جو اٹھارہ سال بعد عدالت کے حکم سے ہٹائی گئی۔ انہوں نے اردو، پنجابی اور انگریزی میں ناول بھی لکھے ہیں اور شاعری بھی کی ہے۔ ان کی شعری تصانیف حسب ذیل ہیں:

۱۔ وقت کی سرگوشی (نظمیں)
۲۔ للکار (نظمیں)
۳۔ راستے کی دھول (نظمیں)
۴۔ شہر گرہن (غزلیں)

فخر زماں کی غزلوں اور نظموں کی جو خصوصیت سب سے زیادہ نمایاں نظر آتی ہے وہ ان کا غیر روایتی لہجہ اور لفظیات ہے۔ حالانکہ یہ تو حقیقت ہے کہ گل و بلبل والی راویتی شاعری کا چلن اقبال، فیض، احمد فراز اور سردار جعفری وغیرہ ہی نے تقریباً موقوف کر دیا تھا یہ گل و بلبل کی علامتوں کو نئے اور سیاسی معنی عطا کر دیے تھے بلکہ راشد اور اختر الایمان نے تو غزل کہنا ہی گناہ تصور کر لیا تھا، لیکن فخر زماں کی شاعری کی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے غزل کے میڈیم کو ذریعۂ اظہار بنانے سے گریز نہیں کیا ہے لیکن تمام طرح کی زوال زدہ علائم و لفظیات سے پرہیز کر کے غزل اور نظم کو ایک نئی شکل دی ہے۔

پہلے فخر زماں کی نظموں کا مطالعہ کیا جائے۔ فخر زماں کی نظموں کا پہلا تاثر پنجاب کی سرزمین سے ان کی وابستگی ہے۔ ان کی شاعری ماورائی، مافوق الفطرت یا پوسٹ ماڈرن یا رد تشکیل وغیرہ بھاری بھرکم لفظیات کے جھمیلوں سے آزاد ہے اور اپنی دھرتی، اپنی آب و ہوا کی بو باس سے آراستہ ہے۔ ان کے کلام میں زمین سے وابستہ عام انسانوں کے عام سے احساسات

اور روز مرہ کے چھوٹے چھوٹے مشاہدات کے سمعی و بصری پیکر دیکھنے کو ملتے ہیں۔مثال کے طور پر:

میں نے نظم سنائی
نظم جب ختم ہوئی تو میں نے اس کی جانب
پھر سوالیہ نگاہوں سے دیکھا
وہ ہلکا سا ہنسی
اور بولی گھر بھی کری ایشن کا کوئی چارہ کرو نا
اب تو لوگ بڑے طعنے مارتے ہیں
پانچ سال شادی کو ہونے والے ہیں
(کری ایشن)

میں نے ریڈیو پر سنا ہے کہ ہمارے جہازوں نے دشمن کے
شہر پر حملہ کر کے
ڈیڑھ سو دشمن مار دیے ہیں،
میں نے اس کی جانب یکبارگی دیکھا اور
مجھے دور ہٹا کے
کہنے لگی
''ظلم ہوا بیٹا، وہ بھی تو ماؤں کے بیٹے تھے''
(ماؤں کے بیٹے)

جیسے کھاٹ میں کان آ جائے
اسی طرح سے
زیست ہماری
بائیں دائیں میں بٹی ہوتی ہے
بائیں دائیں کا توازن کیسے قائم کریں
کس کا ڈالیں بوجھ
اور کتنا سا

(کان آتی چارپائی)

تاہم فخر زماں کی نظموں کا غالب اسلوب نئے شہری معاشرے فرد کی تنہائی اور بے مصرفی کا ہے۔ان کی شاعری کا مرکزی کردار اپنے اطراف کے حالات سے ناآسودہ، اپنی بھیڑ سے کٹا ہوا اور مستقل حزن کی کیفیت سے دوچار ہے۔ یہ جدید صارفی کلچر کا پیدا کردہ ایک فرد ہے جس کے احساس کی لے انتہائی بہتر ہے لیکن اس کی فکری تعبیر اس طرح سے ہوئی ہے کہ یہ ہر قسم کے اجتماعی احساس سے دور اور اپنی ذات کے درون میں یکہ و تنہا ہے۔ چند مثالیں:

چاقو میں چاقو
مجھے موت کی دھار پر
کھڑا کر کے
آپ کتنے خوش ہیں
کبھی تو آپ کا ہاتھ بھی کانپے
کبھی تو آپ کا وار بھی چوکے
کبھی تو کوئی چاقو
سیدھا میرے دل کو چھلنی کر دے
(چاقوؤں کا قیدی)

آنکھوں پر کھوپے چڑھے
ناک میں نکیل
باگیں دوسروں کے ہاتھوں میں
پھر بھی لوگ مجھے خودسر کہتے ہیں
(خودسر)

اپنی اپنی قبر بناؤ
اپنے ہاتھوں قبر میں اپنی لاش اتارو
مٹی کا اک دیا جلا کر
قبر پہ سر کی جانب رکھو
خود ہی نور کے تڑکے
وقت کے لمبے ہات
تمہاری قبر کی ڈر سے بھری ہوئی گہرائی کو
مٹی اینٹوں اور گارے سے بھر دیں گے
(مارا کری)

لیکن فخر زماں کی شاعری کا ایک رنگ احتجاجی بھی ہے۔فخر زماں خود روشن خیال سیاست سے وابستہ ہیں اور شعر و ادب کو عوامی احساسات و مسائل کا ذریعۂ اظہار سمجھتے ہیں اور ظلم و جبر، استحصال اور دقیانوسیت کے خلاف سفر و ادب کو بطور ایک مہم استعمال کرنا بھی مناسب سمجھتے ہیں، چند مثالیں:

صرف سر سلامت رہ گیا ہے
اسے بچا لیں
بدن تو سارا زخمی ہے
چپے چپے پر زخموں کے نشاں ہیں
یہ سب دشمن ہیں سر کے
اسے بچا لیں
(کریش ہیلمٹ)

ہمیشہ بھاری پتھر کو پہاڑ کی چوٹی پر
لے جانے کا حکم دینے والو!
اب تمہارے دن تھوڑے ہیں
اب یہی پتھر لڑھکتا لڑھکتا

نوکیلی کنکریوں میں تبدیل ہوجائے گا
اورتمہارے جسموں کو چھلنی کردے گا
(سسی فس جاگ پڑا ہے)

تو غریبوں کا رکھوالا
تو سورما غیرت والا
یہ سب کچھ مانا
پر ایک بات بتادے
تیری بہادری، جی داری، غیرت مندی
غریبوں، محکوموں، محنت والوں کی سرداری
کہیں اس لیے تو نہیں تھی
کہ تیری ماں کا اکبر کے بیٹے حیدری نے
دودھ پیا تھا
(دلّے بھٹی سے ایک سوال)

فخر زماں کی نظموں میں جاگیرداری معاشرے میں طاقتوروں کے تحکم کے زیر سایہ زندہ رہنے والی عورت کے انداز فکر اور خود کو محفوظ رکھنے کے طریقوں کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ روزمرہ کے تشدد اور گھر سے باہر سڑکوں، بازاروں اور دفتروں میں خود کو محفوظ رکھنے کے لیے اسے کس طرح کی ترکیبیں اپنانا پڑتی ہیں۔ اپنے اطراف کی مظلوم عورت کا یہی احساس زندگی فخر زماں کی نظموں ''حرام زادے''، ''تریا چرتر''، ''بدلہ''، ''کری ایشن''، ''پولی اینڈ ری'' اور ''کسبی'' وغیرہ میں واضح طور پر نظر آتا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ فخر زماں کے یہاں عورت کوئی سادہ اور اکہری نوعیت کا کردار نہیں ہے بلکہ اپنے اندر کافی پیچیدہ اور تہہ دار وجود رکھتی ہے۔

فخر زماں نے صرف نظم کو ہی ذریعۂ اظہار نہیں بنایا، غزل میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ لیکن ان کی غزل سرتاسر غیر روایتی اور کسی حد تک نامانوس لفظیات و تراکیب سے آراستہ ہے۔ مثال کے طور پر:

کھلے پڑے ہیں مرے سامنے نئے اوراق
بھلا دیا ہے سبق میں نے سارا پیچھے کا

کچھ بات نہیں جسم اگر میرا جلا ہے
صد شکر کہ اس بزم سے شعلہ تو اٹھا ہے
دیوار سے گوا ینٹ کھسک کر پڑی سر پر
صد شکر کہ روزن کوئی زنداں میں کھلا ہے

فخر زماں کی غزلوں میں فرد کی تنہائی کا وہ احساس بھی ملتا ہے جو ایک جدید معاشرت کی دین ہوتا ہے۔ یہ فرد اپنے اطراف کی بے پناہ بھیڑ کے باوجود اپنی ازلی تنہائی سے مجادلے میں مشغول رہتا ہے یا اپنی انا پر لگے ہوئے زخموں کو فنی اظہار کی شکل دینے میں مصروف رہتا ہے۔ مثال کے طور پر:

فضا میں آج رات کیوں ہے درد سا رچا رچا
ستارے زرد زرد ہیں تو چاند ہے بجھا بجھا
ملال کیا جو کر دیا ہے تو نے آ کے گل اسے
کہ مدتوں سے یوں بھی تھا چراغِ دل بجھا بجھا

پھر شہر پہ آسیب کا سایہ ہے مسلط
ہر آنکھ ہے پتھرائی ہوئی جسم میں ساکت
جس شخص کو مارا گیا ہر اک کی رضا سے
موضوعِ سخن آج ہوئی اس کی ہلاکت

شیو بڑھی ہے ساکت آنکھیں بکھرے بکھرے بال
فخر تو کیسے حال میں گم ہے اپنا آپ سنبھال
ریزہ ریزہ ٹوٹ گئی ہے شخصیت کی دیوار
قطرہ قطرہ بہہ اٹھا ہے سوچوں کا سیّال

سالِ رواں میں فخر زماں کی غزلوں کا مجموعہ ''شہر گرہن'' شائع ہوا ہے۔ اس کی اہمیت نہ صرف اس بنا پر ہے کہ فخر زماں نے غزل جیسی روایتی صنف سخن کی طرف رجوع کیا ہے، بلکہ اس کی غزلوں میں تازہ کاری اور غیر روایتی لفظیات و اسلوب بھی اس کی بڑی پہچان ہے۔ ''شہر گرہن'' کی اکثر غزلوں میں ردیف کی پابندی روا نہیں رکھی گئی ہے اور خیال کو بنیادی اہمیت دی گئی ہے۔ مثال کے طور پر:

میں نے کہا تیار ہوں سناؤ فرد جرم
اس نے کہا مقدمے کا فیصلہ محفوظ ہے
میں نے کہا کہ جج نہ وکیل استغاثہ
اس نے کہا مقدمے کا فیصلہ محفوظ ہے
میں نے کہا سنا دو جو ہے حکم حکمراں
اس نے کہا مقدمے کا فیصلہ محفوظ ہے

بڑا عجیب سا شخص تھا وہ اور عجب سی اس کی عادت تھی
دن کو سویا رہتا تھا اور ساری رات وہ جاگتا تھا
بڑا عجیب سا شخص تھا وہ اور عجب سی اس کی عادت تھی
وہ شخص نہیں اب دنیا میں جو میرے دل میں بستا تھا
دامن بچا کے اپنا کسی طور سے گزر
بازار میں لگی ہوئی ہے عزت کی لوٹ سیل
معلوم ہے خلاف ہے تیرے مزاج کے
پر تو منافقوں کے ساتھ ان کا نہ کھیل کھیل

جدید اردو غزل میں ظفر اقبال اور سلیم احمد، بشیر بدر اور پروین شاکر وغیرہ نے انگریزی لفظیات کا استعمال کیا، جو نظم میں حالی، محمد حسین آزاد اور اکبر الٰہ آبادی وغیرہ لگاتار کرتے رہے تھے۔ فخر زماں کی لفظیات میں بھی انگریزی اور پنجابی زبان کے الفاظ کے حوالے سے یہی روایت شکن صورتحال نظر آتی ہے۔ فخر زماں کے یہاں اصل اہمیت خیال اور مواد کی ہے، نہ کہ ہیئت یا ساخت کی۔ اسی لیے ان کی غزلوں میں اسی قسم کے تجرباتی اشعار بھی اکثر مل جاتے ہیں:

ہے وکیل اور جج بھی آخر پھر عدالت سج گئی
پھر پیالہ زہر کا تیار ہے سقراط کا

میں نے بتا دیے ہیں تمہیں زندگی کے راز
میں نے چھپا کے رکھا نہیں اپنا پاس ورڈ

کاٹ دینا ڈائری سے میرا نمبر اور نام
زندگی کا کیا بھروسہ وقت کا کیا اعتبار

میں نے اُگا دیا ہے شجر اپنی چھت پہ یوں
اب گھر میں ایک اینچ بھی باقی نہیں زمیں

فخر زماں کی فکر اور نظریے کا ایک بڑا گہرا اور بنیادی تعلق پنجاب کی سرزمین سے ہے۔ اس لیے وہ نہ کبھی پنجاب کے عاشقوں کو فراموش کرتے ہیں اور نہ کبھی پنجاب کے ان بہادروں کو جنہوں نے خارجی حملہ آوروں کا مقابلہ کر کے اپنے کلچر اپنی زبان اور اپنی روایات کو محفوظ رکھنے کی کوشش کی یا اس کی مدافعت میں اپنی جان نچھاور کر دی۔ مثال کے طور پر:

جتنی دیر میں سوہنی کا کچا گھڑا
جتنی دیر میں دانا باد سے کھیوے کے گھر تک
پکی پہنچی
جتنی دیر میں پورن کو سلوان
نے بازو ٹانگیں توڑ کے اندھے کنوئیں میں پھینکا
جتنی دیر میں شاہ حسین نے چرخہ ڈال کے کاتا سوت
جتنی دیر میں بالو نے دل دریا میں غوطہ لگایا
جتنی دیر میں میاں محمد نے
سیتے میں گنے کی طرح
رس نکلوایا
جتنی دیر میں بلھے شاہ نے پوچھا
''کیا جانوں، میں کون!''

(نظم: دیر کا سٹہ)

کہ تیری ماں کا اکبر کے بیٹے حیدری نے
دودھ پیا تھا
اور وہ شہزادہ، تخت کا وارث
اور تو اک عام سا کاشتکار
ہل چلانے والا!
کہیں تو بھی ان غریبوں کا
بے تاج بادشاہ بن کے
اپنی ماں کے دودھ کی برابر تقسیم کا
طالب تو نہیں تھا؟

(نظم: دلّے بھٹی سے ایک سوال)

فخر زماں نے صرف پنجاب ہی کی سرزمین کی قصہ کہانیوں کو اپنی نظموں اور غزلوں کا موضوع نہیں بنایا ہے، بلکہ ان کے یہاں یونانی، دیومالا اور انگریزی قصے کہانیوں کے کردار اور واقعات بھی اکثر دیکھنے کو مل جاتے ہیں اور اس کی اصل وجہ فخر زماں کا وسیع و بسیط مطالعہ ہے۔ کچھ مثالیں ان کی شاعری سے:

سپاہی اک اک کر کے اندر سے نکلیں
ایڑیوں کے بل
اور اچانک شہر کی اونچی دیواروں میں
اونگھتے پہرہ داروں کے
سوتے جاگتے پہرہ داروں کے
سر، تن سے جدا کر دیں

(نروجن ہارس)

آدھی رات قبر سے اٹھ کر
ہماری گردن کی پھولی
نسوں سے لہو چوسیں
لہسن کی بو صلیبیں
انہیں روک نہ پائیں
روشنی کو یہ موٹے اور کالے پردوں میں قید کریں

(ڈریکیولا)

اب میں اپنے آپ کو وہ غلطی نہ کرنے دوں گا
اب میں اپنی ایڑی کو خشک نہ رہنے دوں گا
اب تو میرے سارے تن کو گھلا دیں
اب تو میں اپنی ایڑی پر
پیرس کا زہر میں بجھا تیر کھا کر
سیانا ہو گیا ہوں

(نیا ایکلیز)

باقی صفحہ ۹۸ پر ملاحظہ کیجیے

افسانوں میں کربلا

ڈاکٹر عفت ذکیہ
(میرٹھ، بھارت)

اسلم جمشید پوری کا شمار 1980 کے بعد اپنی شناخت قائم کرنے والے ان افسانہ نگاروں کی فہرست میں ہوتا ہے جو کسی تحریک یا رجحان کے تحت لکھنے والوں کی صف میں نہیں آتے بلکہ اپنا راستہ الگ بناتے ہیں۔ زیادہ تر وہ مختصر کہانیاں لکھتے رہے ہیں۔ ادھر کوئی 2007 سے ان کی افسانہ نگاری نے ایک نیا موڑ اختیار کیا ہے۔ مختصر کہانیوں کے ساتھ انھوں نے طویل کہانیاں بھی لکھی ہیں۔ ان کی مختصر کہانیوں کی طرح طویل کہانیاں بھی کامیاب کہی جاسکتی ہیں۔ ان کی کہانیوں کا ایک خاص وصف یہ ہے کہ وہ زندگی کی تلخ وشیریں حقیقتوں کی ترجمان ہیں۔ وہ اپنے افسانوں کے تانے بانے اطراف کے ماحول اور ان کی سچائیوں سے بنتے ہیں۔ انسانی نفسیات کو مدنظر رکھ کر وہ اپنی کہانیوں کو آگے بڑھانے کے فن سے بخوبی واقف ہیں۔ ان کے افسانوں میں حقائق کے ربط وضبط کے ساتھ واقعات اور حالات میں بھی آپسی تال میل ملتا ہے۔ ان کے زیادہ تر افسانوں میں کرداروں کی نفسیات پر تجزیاتی مشاہدے نظر آتے ہیں۔ انفرادی الجھنوں اور مسائل کی عکاسی میں انھیں بھرپور دسترس حاصل ہے۔ احمد صغیر ان کی افسانہ نگاری کی ضمن میں یوں رقم طراز ہیں:

''اسلم جمشیدی پوری نے کسی نظریے، تحریک یا رجحان کی بالادستی کو قبول کر کے اپنی شناخت بنانے کی کوشش نہیں کی بلکہ تخلیقی عمل پر زور دیا۔ انھیں تخلیقی عمل کے حقیقی رمز کا عرفان حاصل ہے۔ وہ زندگی کے ساتھ آزادانہ مکالمہ کرتے ہیں۔ ان کے یہاں تخلیقی عمل اپنی خالص صورت میں موجود ہے۔ وہ.....زندگی کی سچائیوں پر نظر رکھتے ہیں اور اپنے اردگرد جو دیکھتے ہیں، محسوس کرتے ہیں اسے افسانے کی صورت میں ڈھال دیتے ہیں۔''1

کہانی 'پانی اور پیاس' تاریخ پر اسلم جمشید پوری کی بھرپور دسترس کا بین ثبوت ہے جس میں انھوں نے پوری تاریخ عالم کو افسانے میں سمونے کی کوشش کی ہے۔ پانی کو بنیاد بنا کر لکھا گیا یہ ایک کامیاب افسانہ ہے۔ پورے افسانے میں پانی کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے۔ افسانے کے دو پہلو ہیں۔ ایک پانی کی قلت سے نمو پذیر پریشانیاں، دوسرے پانی کی فراوانی کے باعث برپا ہونے والی حشر سامانیاں، پورا افسانہ پانی اور پیاس کے گرد ہالہ بناتا ہوا چلتا ہے۔ افسانے میں فقط ایک مرکزی کردار ہے۔ پوری کہانی اس کے اور اس کے خیالات کے گرد گھومتی ہے۔

یوں تو افسانے کا منظر نامہ صرف نصف شب پر محیط ہے۔ لیکن اگر دیکھا جائے تو یہ افسانہ عہد نوحؑ سے لے کر عہد حاضر تک کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ افسانے کا آغاز تقریباً ڈھائی سے تین بجے شب ہوتا ہے جب پیاس کی وجہ سے افسانے کا مرکزی کردار نیند سے بیدار ہو جاتا ہے۔ وہ یونیورسٹی کا طالب علم ہے اور ہاسٹل میں قیام پذیر ہے۔ اسے اپنے کمرے میں پانی نہیں ملتا۔ لائٹ غائب ہونے کی وجہ سے اسے بڑی پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وہ اپنے کمرے کی ہر چیز میں پانی تلاش کرتا ہے۔ جگ گلاس وغیرہ سب خالی ملے یہاں تک کہ باتھ روم کے کسی بھی نل میں پانی نہیں آرہا تھا۔ امتحان ختم ہو جانے کے باعث تقریباً سبھی طلبا اپنے اپنے گھر جا چکے ہیں۔ کچھ رکے ہوئے طلبا ایسے ہیں جو یونیورسٹی میں سیاست کرنے کی غرض سے ہاسٹل خالی نہیں کر رہے۔ انھیں یونیورسٹی کی جانب سے ULTIMATUM بھی دیا جا چکا ہے۔ انھیں طلبا میں کچھ ایسے طلبا بھی ہیں جن کے امتحان ابھی ختم نہیں ہوئے۔ افسانے کا مرکزی کردار بھی ایسا ہی ایک طالب علم ہے جس کے ابھی کچھ امتحان باقی ہیں۔

پیاس کی شدت کے باعث اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا کہ کیا کرے۔ شدت عطش سے بے حال وہ پورے ہاسٹل میں پانی تلاش کرتا ہے لیکن اسے کہیں پانی نہیں ملتا۔ اس کی پیاس کی شدت کا اندازہ ذیل کے جملوں سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے:

''پیاس کی شدت سے حلق میں کانٹے اگ آئے تھے، بے چینی پہلے پریشانی اور اب خوف میں تبدیل ہونے لگی تھی، اندھیرا، گھپ اندھیرا....ایسے میں پیاس نے اپنے تیور دکھانے شروع کر دیے تھے۔ اس کی حالت پاگلوں کی سی ہو رہی تھی، اپنے ہاتھوں سے سر کے بالوں کو نوچ رہا تھا۔ حلق سے صرف ''پانی.... پانی نکل رہا تھا.....'' اسے لگ رہا تھا کہ اگر اور تھوڑی دیر میں پانی نہ ملا تو شاید اس کی جان نہ چلی جائے۔.....''ہاتھ پاؤں میں دم نہیں تھا۔ حلق خشک ہو چکا تھا۔''2

اسے خیال آتا ہے کہ طلبا سے ہاسٹل خالی کرانے کی وجہ سے شاید یونیورسٹی انتظامیہ نے سخت اقدامات کی صورت میں بجلی اور پانی کی سپلائی کاٹ دی ہے ورنہ اتنی طویل مدت کے لیے بجلی اور پانی کبھی نہیں گئے۔

پورے افسانے میں پانی کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے۔ پانی وہ شے ہے جو پوری کائنات میں خشکی سے تین گنا زیادہ ہے، آج اسی کائنات کا ایک انسان ایک قطرہ پانی کو ترس رہا ہے۔ پانی آج اس سے اپنی حیثیت منوا رہا ہے:

''آج اسے پانی کی اہمیت کا اندازہ ہو رہا تھا۔ اس نے کبھی اپنے کمرے میں پانی بھر کر نہیں رکھا، کبھی جگ میں رکھ لیا کبھی گلاس بھر کے...بس...ایسا تو علم نہیں تھا کہ بات یہاں تک آجائے گی۔''3

اسلم جمشید پوری کا یہ افسانہ پانی کی اہمیت کے ساتھ ساتھ اسلامی تاریخی واقعات پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔ اس میں ایک نہیں کئی تاریخی واقعات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ ایسے واقعات جن کا تعلق پانی سے ہو انھیں استعاراتی طور پر افسانے میں شامل کیا گیا ہے مثلاً جب شدت عطش سے بے حال افسانے کا ہیرو ہر سو، پانی تلاش کرتا ہے تو اسے محسوس ہوتا ہے جیسے:

''دور تک صحرا ہی صحرا ہو، سورج کی تپش بھی شدید ہو اور پانی کا کہیں نام نہ ہو.....''3

پیاس کی شدت، صحرا کا تصور، تمازت آفتاب اور قلتِ آب، یہ تمام چیزیں مل کر اسے صحرائے کربلا لے جاتی ہیں جہاں امام حسین اور ان کے اعزا و اقربا تین دن کی پیاس میں یکے بعد دیگرے جام شہادت نوش کر رہے تھے۔ بہادران فوج کا تو ذکر ہی کیا، کربلا کے تپتے ریگستان میں خاندان رسالت کے اطفال و خواتین بھی بے آب و گیاہ تھے۔

اسلم جمشید پوری نے جس خوبصورتی کے ساتھ سانحۂ کربلا کو اس افسانے کی زینت بنایا ہے۔ یہ ان کی تاریخ پر بھرپور دسترس کا ثبوت ہے۔ کیونکہ کربلا کے جس واقعے کو اس افسانے میں تحریر کیا گیا ہے وہ واقعہ فوج یزید کی بے حسی اور درندگی کو بے نقاب کرتا ہی ہے ساتھ ہی افسانہ نگار کی فن پر دسترس کی ضمانت بھی لیتا ہے۔ پوری تاریخ کربلا کُجا تاریخ عالم میں ایسی دوسری مثال نہیں ملتی جہاں ایک معصوم بچے کو سوالِ آب کے بدلے تین بھال کے تیر سے سیراب کیا جائے۔ اسلم جمشید پوری نے پیاس اور پانی کے تصور کے ساتھ امام حسین کے چھ ماہ کے بچے کی شہادت کو جوڑ کر حالات سے مکمل ہم آہنگی کا جو ثبوت دیا ہے وہ موضوع کے ساتھ ان کے لگاؤ کی بھرپور وضاحت کرتا ہے:

''حسین بچے کو لیے ہوئے خیمے سے باہر آئے۔ باہر سورج آسمان پر قہر برسا رہا تھا۔ نیچے زمین تپش کے مارے انگارہ بنی ہوئی تھی۔ ریگزار میں بے گور و کفن ساتھیوں کے لاشے دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ سامنے عدو کا لشکر تھا جو ہر حرکت پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ انھیں فتح قریب نظر آرہی تھی کہ اب صرف فوج کا سپہ سالار باقی رہ گیا تھا۔

امام حسین نے دشمنوں سے مجبور و بے کس ہو کر کہا ''دیکھو یہ چھ ماہ کا شیر خوار بچہ تمھاری دشمنی مجھ سے ہے۔ اس بیچارے کا کیا قصور۔ خدا کے لیے اسے پانی دے دو۔''

زبان نے زیادہ ساتھ نہ دیا، حلق خشک ہوا جا رہا تھا۔ خود بھی بے حد پیاسے تھے۔ ہاتھوں میں لرزہ طاری تھا بچے کی حالت ناقابل دید تھی۔ پورے جسم کی طاقت زبان میں سمیٹے ہوئے حسین دوبارہ گویا ہوئے۔

'تم سمجھتے ہو بچے کے بہانے حسین پانی پی لے گا.... حرام ہے مجھ پر ایسا ایک قطرہ بھی.... لو میں بچے کو یہاں چھوڑ دیتا ہوں۔ تم خود اسے پانی پلا دو۔''

کہتے ہوئے حسین نے تپتی ہوئی ریت پر علی اصغر کو لٹا دیا.... بچہ دھوپ اور ریت کی تپش سے تڑپنے لگا.... دشمنوں میں چہ میگوئیاں جاری تھیں۔ کوئی اسے حسین کی کوئی چال سمجھ رہا تھا، کسی کا خیال تھا کہ دشمن دشمن سب برابر ہیں، کیا بڑا، کیا بچہ.... اور پھر پانی پر پابندی لگا کر ہی تو ہم نے فتح کا منصوبہ بنایا تھا۔ بچے کو پانی پلانے سے ہماری منصوبہ بندی ختم ہو جائے گی۔

بچے کی تڑپ اور دشمنوں کے اٹل رویے کو دیکھتے ہوئے امام حسین نے دوڑ کر بچے کو اٹھا لیا۔ گود میں لے کر پیار کرنے لگے۔

''بیٹے صبر کیجیے.... صبر.... خدا کی یہی مرضی ہے۔''

باپ کے ان جملوں نے معصوم کے دل پر پھائے کا کام کیا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ کی ایک لکیر نمودار ہوئی، اتنے میں وہ ہوا، جو شاید دنیا نے کبھی نہ دیکھا ہو۔ آسمان اور زمین کانپ گئے تھے۔ عدو نے ایسا تیر مارا کہ علی اصغر کے حلق کے پار ہوتا ہوا امام حسین کے بازو میں پیوست ہو گیا۔ بچے نے جام شہادت پیا اور اپنی پیاس ابدی طور پر بجھالی تھی۔''4

یوں تو کربلا کا پورا واقعہ ہی اپنے اندر بھرپور اثر انگیزی رکھتا ہے لیکن شہادت علی اصغر فوج یزید کے ایسے گھناؤنے اقدام میں سے ایک ہے جس کی مثال دنیا میں کہیں نہیں ملتی۔ کائنات میں کوئی بھی بچہ پیاس میں تیر سے ذبح نہیں کیا گیا۔ یہ خون ناحق فقط سرزمین کربلا پر ہی بہایا گیا جو تا قیامت دامنِ انسانیت پر ایک بدنما داغ کی صورت نمودار رہے گا۔

پانی کے موضوع پر لکھے گئے افسانے میں علی اصغر کی پیاس کا تصور مصنف کا کرداروں کی نفسیات پر دسترس کا گواہ ہے۔ ورنہ روز عاشور میدان کربلا میں کتنے لوگ ایسے تھے جو تین دن سے پیاسے تھے۔ علی اصغر کا ذکر ہی کیوں؟ وہ اس لیے کہ ایک شیر خوار بچہ جس کی غذا فقط شیر مادر اور آب ہے۔ پیاس کی شدت کے باعث اس کی ماں کا دودھ خشک ہو گیا ہے اور پانی اسے میسر نہیں۔ اس وقت اس بچے سے زیادہ تشنہ دہن بھلا اور کون ہوگا۔

انسان خواہ کتنا بھی پیاسا ہو، علی اصغر کی پیاس کی برابری نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلم جمشید پوری کی کہانی کا ہیرو علی اصغر کی پیاس کے تصور سے کانپ جاتا ہے اور اسے اپنی پیاس کی شدت بہت ہیچ معلوم ہوتی ہے۔ افسانہ اس لیے بھی ایک کامیاب افسانہ ہے کہ اس میں ایک پیاسے شخص کا پیاس کی شدت میں علی اصغر کی تشنہ لبی کا تصور افسانے کو عصریت عطا کرتا ہے:

''نہیں... نہیں....'' خوف اور دہشت کے مارے اس کی آنکھوں کے پپوٹے پھیل گئے۔ ''پیاس کے لیے دنیا میں ایسا بھی ہو سکتا ہے.... میری پیاس تو کچھ بھی نہیں۔'' اسے حوصلہ ملا.... اس کی نظروں میں علی اصغر کا سراپا گھومنے لگا۔ ایک شیر خوار، چھ ماہ کا معصوم.... جسے کربلا کے سب سے کم عمر شہید ہونے کا اعزاز حاصل ہوا... اسے پیاس اور پانی کے رشتے کی اہمیت سمجھ میں آنے لگی۔''5

کربلا کے واقعے کے بعد جہاں کہیں بھی پانی اور پیاس کا مسئلہ کھڑا ہوتا ہے انسان کا تصور فوراً میدان کربلا پہنچ جاتا ہے۔ کربلا، جہاں خیر بھی ہے، شر بھی۔ خیر کا استعارہ 'حسین' ہیں اور شر کا استعارہ 'یزید'۔ دنیا میں جب کسی پر پانی بند کیا جاتا ہے تو پانی بند کرنے والے کو یزید سے تشبیہہ دی جاتی ہے۔ کربلا کے سانحہ عظیم سے قبل تاریخ میں کہیں کسی پر پابندیٔ آب کا ذکر نہیں ملتا تبھی تو ہاسٹل میں پانی میسر نہ ہونے پر افسانے کا ہیرو اپنے وائس چانسلر کو یزید تصور کرنے لگتا ہے اور اسلم جمشید پوری اپنے کردار کی زبان سے یہ تاریخی جملہ ادا کرا دیتے ہیں؛

''یہ وائس چانسلر ہے یا یزید۔''6

اسلم جمشید پوری نے اپنے اس افسانے میں کربلا ہی نہیں بلکہ اس سے تقریباً بارہ سو سال قبل رونما ہونے والے واقعے پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ جب پیاس کی

شدت سے جاں بلب ہوکر ہیرو اپنے گھر کا نمبر ملاتا ہے اور فون اس کی ماں اٹھاتی ہے، بچے کی پیاس کے تصور سے وہ بے قرار ہوجاتی ہے اور سمجھ نہیں پاتی کہ کوسوں میل دور بیٹھے اپنے بیٹے کے لیے کس طرح پانی کی سبیل کرے۔ اچانک اس کا تصور میدان عرفات پہنچ جاتا ہے:

''اسے ایسا لگا کہ وہ بی بی ہاجرہ ہے اور لق ودق صحرا میں ننھا اسماعیل، پانی، پانی.... پکار رہا ہے...واقعی عرب کے دور تک پھیلے ریگستان میں ایک ننھا بچہ، اپنی ماں کی گود میں پانی کے لیے ترس رہا ہے۔ حضرت ہاجرہ پریشان ہوجاتی ہیں۔ دور دور نظر دوڑاتی ہیں، پانی تو پانی کہیں آثار بھی نظر نہیں آتے.... بچے کو زمین پر لٹا کر دوڑتی ہوئی ایک سمت کو جاتی ہیں۔ دور سے دیکھنے پر ایسا لگتا ہے گویا پانی بہہ رہا ہے۔ دوڑتی ہوئی پانی کی طرف جاتی ہیں۔ گرتی پڑتی جب وہاں پہنچتی ہیں تو چمکتی ہوئی گرم ریت کے سوا کچھ بھی نہیں.... سرابوں کے پیچھے دوڑتے دوڑتے وہ تھک چکی تھیں۔ حوصلے پست ہوگئے تھے۔ ہمت جواب دے گئی تھی..... بچے کا خیال آتے ہی، بچے کی طرف دوڑتی ہیں۔ پاس پہنچ کر دیکھتی ہیں، بچہ کھیل رہا ہے اور بچے کی ایڑی کے پاس سے چشمہ ابل رہا ہے۔''7

اسلم جمشید پوری نے اس کہانی میں جس فنی مہارت کا ثبوت دیا ہے وہ ان کی فنکارانہ بصیرت کا ثبوت ہے۔ پورے افسانے میں عصری حسیت قدم قدم پر نظر آتی ہے۔ یہاں بھی ماں اپنے بیٹے کی پیاس کے تصور کے ساتھ ساتھ کائنات کی ایک ایسی عظیم ماں کے تصور میں کھوجاتی ہے جس کا عمل پروردگار عالم کو اتنا پسند آیا کہ اس نے ارکان حج کا ایک واجب رکن قرار دے دیا۔ وہ قدرت کے انتظام کی قائل ہوجاتی ہے اور پھر ماضی سے حال میں آموجود ہوتی ہے:

''واللہ کیسی پیاس تھی.....؟ جسے بجھانے کو اللہ نے چشمہ ہی جاری کردیا۔'' پریشان ماں کو تھوڑی دیر کے لیے راحت نصیب ہوئی۔ اچانک انھیں اپنے بیٹے کے فون کی یاد آئی۔''8

اسلم جمشید پوری نے اپنے اس افسانے میں پانی کی قلت پر ہی نہیں پانی کی فراوانی سے ہونے والی تباہیوں اور بربادیوں کا بھی احاطہ کیا ہے۔ جب پانی کی قلت ہوتی ہے تو انسان کا زندہ رہنا محال ہوجاتا ہے لیکن اگر یہی پانی طغیانی پر آجائے تب بھی انسان کی جان پر بن آتی ہے۔

افسانے میں طوفان نوح اور جناب ہاجرہ اور اسمٰعیل کے واقعات کا بیان افسانہ نگار کی علوم قرآن سے واقفیت کی دلیل ہے۔ جب ان کے افسانے کا ہیرو پیاس سے بے حال ہونے لگتا ہے اور ہاسٹل میں اسے کہیں پانی میسر نہیں آتا تو وہ ہاسٹل سے نکل کر نہر کی جانب بھاگنا شروع کردیتا ہے اور دل میں خدا سے دعا کرتا ہے:

''اے اللہ پانی.... پانی پلادے... تیرے خزانے میں کیا کمی ہے، تو دینے پر آتا ہے تو ہر کمی پوری ہوجاتی ہے تو، تو اپنے بندوں کا امتحان لیتا ہے۔ کبھی پانی پانی کرکے اور کبھی قطرے قطرے کو محتاج کرکے۔'' اس کی نظروں میں ایک ایک منظر زندہ ہونے لگے۔ کبھی طوفان نوح میں آسمان سے برستا اور زمین سے ابلتا پانی، جس نے سوائے چند افراد اور حیوانوں کے سب کچھ غرقاب کردیا تھا۔''9

تاریخ کے ساتھ ساتھ افسانہ نگار حالات حاضرہ سے بھی بڑی حد تک باخبر ہے۔ وقتاً فوقتاً دنیا میں پانی سے ہورہی تباہیوں پر بھی اس کی بھرپور نظر ہے۔ ایک جز کو دوسرے جز سے جوڑنے اور افسانے کی شکل میں کُل کی صورت عطا کرنے پر مکمل دسترس حاصل ہے۔ زیر نظر افسانہ اس بات کا زندہ ثبوت فراہم کرتا ہے:

''اس کی نظر میں ایک ایک منظر زندہ ہونے لگے.... کبھی اڑیسہ میں پانی کے سونامی کی تباہی کا دردناک منظر نامہ، تو کبھی ترقی یافتہ ملک جاپان میں سونامی کے ذریعہ ایٹم بم کی تباہی کو یاد دلانے والا طوفان.... کبھی گنگا اور جمنا کے بے قابو پانی سے ہونے والی تباہیوں کا منظر....''10

اسلم جمشید پوری نے بڑی فنی پختگی کے ساتھ پانی اور پیاس دونوں کو ایک دوسرے میں اس طرح پیوست کردیا ہے کہ پانی اور پیاس کے سارے تصورات بیدار ہوجاتے ہیں۔ قاری ایک کے بعد دوسرے واقعے میں کھوسا جاتا ہے۔ پوری کائنات میں وقتاً فوقتاً رونما ہونے والے ان سبھی واقعات کا منظر نامہ اس کی نظروں کے سامنے رقص کرنے لگتا ہے جو اسلم جمشید پوری اپنے کردار کے ذریعے اسے دکھانا چاہتے ہیں:

''اس کی نظروں میں کبھی پیاس اور کبھی پانی.... یکے بعد دیگرے جھماکوں کی طرح آتے رہے۔''11

افسانہ نگار نے اس افسانے میں اپنی فلسفیانہ بصیرت کا ثبوت بھی دیا ہے۔ زیر نظر اقتباس میں پانی کی اہمیت اور افادیت کے ساتھ ساتھ مصنف کی سر ابھارتی ہوئی فلسفیانہ سوچ بخوبی دیکھی جاسکتی ہے:

''پانی جو پیاس بجھاتا ہے۔ لوگوں کے حلق، زمیں کے گلے، درختوں کی جڑوں کو سیراب کرتا ہے۔ کیا پانی کو پیاس نہیں لگتی۔ پانی کبھی کبھی اپنی پیاس بھی بجھاتا ہے۔''12

افسانے میں کئی مقامات پر مصنف نے لفظوں کی بازیگری کے جوہر بھی دکھائے ہیں۔ جملہ سازی، لفظوں کا تال میل اور بے ساختگی نے ان سے بڑے خوبصورت اور پیارے پیارے جملے ادا کرائے ہیں۔ چند جملوں کے ذریعے افسانہ نگار کی فنکارانہ صلاحیت ملاحظہ فرمائیں:

''اس کے جسم کی طاقت سوراخ زدہ غبارے کی مانند نکلی جارہی تھی۔''

''اس کے حلق سے لفظ نہیں نکل پارہے تھے۔ انھیں حلق کے اندر اگ آنے والے کانٹوں کی مزاحمت کا سامنا تھا۔''

''اچانک اس کے حلق کے کانٹے صحت مند ہونے لگے۔''

افسانہ 'پانی اور پیاس' مصنف کی افسانے کے فن سے بخوبی واقفیت پر دال ہے۔ افسانہ نگار کی خوبی یہ ہے کہ اس نے بڑی فنکارانہ مہارت سے ایسے واقعات کو حلقہ در حلقہ ایک دوسرے میں پیوست کیا ہے کہ واقعات کے تسلسل میں جہاں اسلامی روایات کی گونج سنائی دیتی ہے وہیں عصری حسیت کی صدائیں بھی قاری کے ذہن ودل پر ثبت ہوجاتی ہیں۔ انھوں نے ایک مالا میں نہ جانے کون کون

سے نایاب موتی پرودیے ہیں۔ پیاس کی شدت کا احساس جو افسانہ نگار کے قلم سے کہانی کے مرکزی کردار تک پہنچتا ہے وہ کہانی کے اختتام پر قاری کی پیاس بن کر ابھرتا ہے اور پیاس کا ایک ایسا منظر نامہ ترتیب دیتا ہے جس کا تناظر آفاقی ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ یہ افسانہ اسلم جمشید پوری کے ذریعے کوزے میں سمندر کو سمونے کی کامیاب کوشش ہے، تو بے جا نہ ہوگا۔ المختصر یہ کہ افسانہ 'پانی اور پیاس' عصری حسیت سے معمور خالص تلمیحی کہانی ہے جو اسلم جمشید پوری کی افسانہ نگاری کے باب میں ایک خوبصورت اضافہ ہے۔

عیدگاہ سے واپسی

اسلم جمشید پوری کا ایک تازہ ترین افسانہ 'عیدگاہ سے واپسی' ان دنوں موضوع بحث بنا ہوا ہے۔ یہ افسانہ ہندوستان میں ماہنامہ آجکل کے نومبر 2011 کے شمارے میں اور پاکستان میں سہ ماہی 'اجرا' کراچی، اکتوبر تا دسمبر 2011 کے شمارے میں شائع ہوا ہے۔ یہ کہانی پریم چند کی مشہور و معروف کہانی 'عید گاہ' کو دیہات کے نئے منظر نامہ میں آگے بڑھانے کی کامیاب سعی ہے۔ مصنف نے پریم چند کے ننھے حامد کو ستر سال کا بزرگ دکھایا ہے اور اس درمیان ہندوستان کی سماجی، سیاسی اور معاشی صورت حال میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کے درمیان میاں حامد کے کردار کو حیات بخشی ہے۔ میاں حامد ایک ایسا کردار ہے جو قدیم روایتوں کا امین ہے جس کی پرورش غیر مسلم گھرانے میں ہوئی ہے جو ہندو مسلم منافرت سے کوسوں دور ہے اور ہمیشہ گاؤں کی عزت اور تحفظ کے لیے پیش پیش رہتا ہے۔ ایسے بھولے بھالے کرداروں کا ہندوستان میں پھیلے فرقہ وارانہ ماحول میں چالاک اور عیار قسم کے لوگ جو حشر کرتے ہیں وہ قابل غور ہے۔ موضوع اور TREATMENT کے اعتبار سے 'عیدگاہ سے واپسی' ایک اچھا افسانہ تو ہے ہی اور پریم چند کی کہانی کو نئے تناظر میں افسانہ کرنے کی ایک کامیاب کوشش بھی۔ لیکن اس کہانی کی اہمیت وافادیت اس وقت مزید بڑھ جاتی ہے جب کہانی کے کلائمکس پر میاں حامد پردھان کے بڑے بیٹے امرپال کی گولیوں کا نشانہ بن کر اپنے پوتے ماجد کو گود میں لیے لیے زمین پر گر جاتے ہیں تو مصنف کا خیال فوراً کربلا کے دشت میں امام حسین کی گود میں تیر سے زخمی علی اصغر کی طرف چلا جاتا ہے:

''وہ اطمینان سے ساجد کی انگلی پکڑے گاؤں کی طرف چل پڑے۔ ابھی وہ گاؤں میں داخل ہی ہوئے تھے کہ گاؤں سے ایک شور بلند ہوا ''مارو... پکڑو.....''

اس سے قبل کہ میاں حامد کچھ سمجھ پاتے ایک جتھا سامنے سے آتا دکھائی دیا۔ خون کی پیاسی تلواریں، آنکھوں میں درندگی اور وحشت سمائی ہوئی۔ انھوں نے پلک جھپکتے ہی ساجد کو اپنی گود میں اٹھالیا اور جیسے ہی ایک طرف کو بھاگنا چاہا، کھیا کے بیٹے، بیرپال کی دونالی سے نکلنے والی ایک بے رحم گولی نے ساجد کو نشانہ بنالیا۔

ساجد کے جسم کو پار کرتی ہوئی گولی میاں حامد کے سینے میں پیوست ہوگئی تھی۔ دونوں زمین پر آرہے۔ خون کا فوارہ دونوں جسموں سے بلند ہو رہا تھا۔ زمین ساکت تھی، آسمان خاموش تھا۔ ہوا سانس لینا بھول گئی تھی۔ تاریخ نے ایک بار پھر خود کو دہرایا تھا۔ حامد میاں اس طرح اپنے پوتے کو گود میں لیے گاؤں کی زمین کا پیوند بن گئے تھے جیسے کربلا میں امام حسین اور ان کی گود میں علی اصغر نے اجل کو لبیک کہا تھا۔ دونوں کے خون میں لت پت لاشے پڑے تھے اور تھوڑی ہی دور پر ساجد کا کمپیوٹر، نازو کی گڑیا۔ بہو کا سوٹ، اور ایک دھوتی، ایک خوبصورت اور چھوٹی سی پیتل کی لٹیا پڑی تھی جو میاں حامد بابا سکھ دیو کے گھر والوں کے لیے لائے تھے۔''13

مصنف نے اس واقعے کو امام حسین کی گود میں علی اصغر کی شہادت کے واقعے سے جوڑ کر نہ صرف قاری کو چونکایا ہے بلکہ قاری کو سوچنے پر بھی مجبور کر دیا ہے کہ واقعۂ کربلا ہمیشہ ہمارے آس پاس زندہ ہے جبھی تو ظلم و جبر اور قتل و غارت گری کے وقت کربلا کے خونیں واقعات اور معصومین کی شہادت کی یاد ہمارے ذہن و دل میں تازہ ہو جاتی ہے۔ اسلم جمشید پوری نے بڑی صناعی سے کہانی کا اختتام کربلا سے جوڑ کر کہانی کو آفاقیت عطا کی ہے۔ پوری کہانی کا تاثر کربلا کے واقعے کے ساتھ قاری کے ذہن و دل میں اس قدر عمیق اتر جاتا ہے کہ قاری عصریت اور تلمیح دونوں سے بیک وقت ہمکنار ہو جاتا ہے۔ دونوں کا تصادم اس کے ذہن و دل پر ثبت ہو کر اسے بے چین و مضطرب کر دیتا ہے۔ اس طرح کی کہانیاں اردو ادب میں خال خال ہی نظر آتی ہیں۔ مصنف کا یہ بھی کمال ہے کہ صرف ایک جملہ واقعۂ کربلا کے تعلق سے لکھ کر پوری کہانی کو کربلائی رنگ دے دیتا ہے۔ علی اصغر کی شہادت کے واقعے کی شدت اور ہولناکی اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ قاری کے دماغ کی اسکرین پر چلنے لگتی ہے اور وہ کربلا میں پہنچ جاتا ہے۔

'عیدگاہ سے واپسی' بظاہر ایک ایسی کہانی ہے جس میں کہانی کا مرکزی کردار عیدگاہ جاتا ہے اور وہاں سے اس کی واپسی ہوتی ہے لیکن مجموعی اعتبار سے کہانی میں مثبت اقدار، تہذیبی روایات اور اسلامی معاشرت کی واپسی ہے۔ اردو کہانی میں بہت زمانہ بعد اسلامی واقعات کو تلمیحی انداز میں اشاروں کنایوں کے ساتھ بیان کرنے کے رجحان کی واپسی ہوئی ہے۔ دراصل مذہب کے بعض معاملات ہماری معاشرتی زندگی کے معیار و میزان کی حیثیت اختیار کر جاتے ہیں۔ واقعۂ کربلا بھی اسی طرح ہماری زندگیوں میں سرایت کر چکا ہے۔ کہ ہم دنیاوی پریشانی والم، ظلم و ستم، اور حق و باطل کی معرکہ آرائی کے وقت واقعۂ کربلا کو اپنے نزدیک تر پاتے ہیں۔ اس کہانی میں بھی اسلم جمشید پوری نے دنیاوی ظلم و جبر کو تلمیح کے حوالے سے واقعۂ کربلا سے جوڑنے کی کامیاب سعی کی ہے۔

ایسا لگتا ہے کہ مصنف علی اصغر کی شہادت سے اس قدر متاثر ہے کہ انھوں نے تازہ ترین دو افسانوں میں اسی واقعے کو مختلف شکل میں افسانے میں استعمال کیا ہے۔ 'پانی اور پیاس' اور 'عیدگاہ سے واپسی' دونوں افسانوں میں مصنف نے کنایۃً علی اصغر کی شہادت کا ایسا تخلیقی استعمال کیا ہے جس سے کہانی میں ایک نئی طرح کا منظر نامہ ترتیب پاتا ہے۔ یہ اکیسویں صدی میں پائے جانے والے نئے رجحان کی نوید ہے۔ ساتھ ہی ساتھ مصنف نے دونوں کہانیوں میں تلمیح سے روشنی لے کر عصری اندھیروں کو دور کرنے کی کوشش کی ہے اور مجھے لگتا ہے یہ ان کی کامیاب کوشش ہے جو کہانی کو ایک نئی سمت عطا کرتی ہے۔

عاشی اور تتلی

مسرت کلانچوی

(لاہور)

چند لڑکیاں ایک بند کمرے میں بیٹھی اونگھ رہی تھیں۔ انہیں بتا دیا گیا تھا باہر موسم نامہرباں ہے۔ بارش ہوتی ہے تو طوفانی۔۔۔ ہوا چلتی ہے تو برفانی۔۔۔ دھوپ نکلتی ہے تو دل وجسم دونوں جل جاتے ہیں۔۔۔ رات ہوتی ہے تو اندھیری۔۔۔ چاند کو دیکھنا۔۔۔ چاند کی تمنا نہ کرنا۔ چاند لڑکیوں کے وجود پر چاندنی نہیں آگ بکھیرتا ہے۔

ان لڑکیوں میں سے عاشی نے گھٹنوں سے اپنا سر اٹھایا۔۔۔ بند آنکھیں کھولیں۔۔۔ اس کے من میں کوئی کچھ کہہ رہا تھا۔۔۔ من کیا کہہ رہا ہے؟ کہیں لفظ بھی کھو نہ جائیں۔

اس نے قلم اٹھایا اور لکھا۔

کبھی دیکھو
کسی ننھی سی چڑیا کو
بہت تیز بارشوں میں
کبھی دیکھو
کسی سنہری مچھلی کو
زہریلے پانیوں میں
کبھی دیکھو
کسی رنگین تتلی کو
بے گل موسموں میں
کبھی دیکھو
کسی تنہا ستارے کو
آسماں کی وسعتوں میں
کبھی دیکھو
اپنے بغیر مجھے
ان سارے منظروں میں

اور پھر دیکھنے کی خواہش عاشی کے اندر اتنی شدت سے ابھری کہ اس نے اٹھ کر صدیوں سے بند دروازہ کھولا اور باہر نکل آئی۔ رنگ روشنی خوشبو ٹھنڈک۔۔۔ اور اس کے ساتھ ہی جذبوں اور محبتوں کے بادل امڈ آئے۔ رم جھم کرتی لفظوں کی بارش نے لوح قلب پر صدیوں سے جمی گرد کو دھو ڈالا۔ ہر شے صاف اور نکھری نکھری نظر آ رہی تھی۔ اس دنیا میں خوشیاں بھی تھیں اور آنچل میں منہ چھپاتی شرمیلی محبتیں بھی۔

عاشی نے لکھا

دودھیا بادلوں پر
دھوپ اور بارش کا ملن ہوا
خوابوں کی پریاں
قطار اندر قطار
سات رنگوں کے جھولے پر
محوِ سفر تھیں
قوس وقزح کا یہ منظر
دیکھ کر۔۔۔
میرے سارے سپنے
اڑ کر۔۔۔
تمہاری سمت چلے گئے

عاشی خوش تھی کہ میں نے ایک نئی دنیا پائی ہے۔ ایک نئی کائنات تلاش کر لی ہے۔ اس دنیا کا موسم خوش رنگ موسم ہے۔ یہاں کھلنے والے پھول کبھی نہیں مرجھاتے۔۔۔ یہاں فضاؤں میں خوشبوئیں لہراتی ہیں اور ہوائیں سریلے گیت گاتی ہیں۔ عاشی کو پھولوں بھرے موسم میں رنگین تتلی اڑتی نظر آئی۔ وہ اس تتلی کے پیچھے دوڑی۔

تتلی بولی۔ میرے پیچھے نہ آنا۔ میرا سفر صحرا کا سفر ہے۔ میری راہیں خاردار ہیں۔ میرے سفر میں بادِ صبا بادِ سموم میں بدل جاتی ہے۔۔۔ خاردار جھاڑیوں اور گرم بگولوں کا سامنا کر سکو گی۔

ڈالیوں سے پھول جھڑتے دیکھنا
پیڑ کو موسم سے لڑتے دیکھنا
آفتابِ دوپہر کو اک نظر
عصر کی سُولی پہ چڑھتے دیکھنا
معترض لمحوں کی عاشی قید میں
وقت کو پہلو بدلتے دیکھنا

عاشی صرف رنگوں اور خوشبوؤں کی تلاش میں نہیں۔۔۔ بلکہ صحرا کی گرم ریت پر چلنے کا حوصلہ رکھتے ہوئے یہاں آئی تھی۔۔۔ اور جلد ہی اس نے تیز بارشوں میں ننھی چڑیا۔۔۔ زہریلے پانیوں میں سنہری مچھلی اور بے گل موسم میں رنگین تتلی کو بھی دیکھا اور عاشی نے سوچا میں اس تتلی کو بے گل موسم میں مرنے نہیں دوں گی۔

عاشی اس کے پیچھے دوڑتی رہی۔۔۔ دیکھتی رہی۔۔۔ سوچتی

رہی۔۔۔اس کے آنسو قطرہ قطرہ اس کے دل پر گرتے رہے اور لفظوں کے موتی پروتے رہے۔دل خود ایک کتاب بن گیا۔۔۔عاشی ایک کہانی ایک افسانہ ایک نظم اور ایک غزل نظر آنے لگی۔۔۔یوں محسوس ہوا عاشی سراپا تحریر بن گئی ہے۔

کوئی کیا جانے کس ڈگر میں ہوں
قریۂ ذات کے سفر میں ہوں
شوخ رنگوں میں دردِ پنہاں میں
زرد چہرے میں چشم تر میں ہوں
میری ہستی بہار کا پرتو
پتی پتی شجر میں ہوں

اور پھر عاشی لفظوں اور جذبوں کی ہواؤں کے ساتھ محبتوں کی روشنیوں کے ہمراہ گھر گھر آنگن آنگن بکھر گئی۔اور سب کو یوں محسوس ہوا وہ کتاب میں نہیں ہمارے دلوں میں لکھی گئی ہے۔۔۔ہمارے ہی گھر آنگن میں بس رہی ہے۔۔۔ وہ ہمارے پاس سے آہستہ آہستہ چلتی ہوئی گزر جاتی ہے۔۔۔اور نجانے کہاں۔۔۔کس کونے میں چھپ کر ہمیں دیکھ رہی ہے۔۔۔ ہمارا کوئی راز ہمارا نہیں رہا۔۔۔اس نے تو ہمارا ہر دکھ ہر درد ہر جذبہ چرا کر اپنی تحریروں میں چھپا لیا ہے۔وہ ہماری درد آشنا محسوس ہوتی ہے۔

عاشی نے اپنی نظم درد آشنا میں لکھا:

تجھ پر بھی تو بیتی ہوگی
پہلی سردی پہلی گرمی
پہلی بارش.....

عاشی نے درد آشنا۔۔۔خواب دیکھنے والی۔۔۔محبتیں بانٹنے والی۔۔۔عہد وفا کرنے والی عورت کو سزا پاتے دیکھا۔

کہیں مٹی کے تیل سے
جسم جلایا جاتا ہے
کہیں نامناسب رویوں سے
روح جلائی جاتی ہے
کبھی صبر کرتی ہے تو
کبھی بول پڑتی ہے تو
کسی کو ناسمجھی کی
کسی کو سمجھداری کی
سزا دی جاتی ہے
عورت جلادی جاتی ہے

تب وہ خود بھی جان گئی۔۔۔جذبے رنگ بدلتے ہیں۔۔۔لفظ اپنا مفہوم و معنی کھو بیٹھتے ہیں۔سچائیوں کی روشنی دھیمی پڑ جاتی ہے۔عاشی نے دیکھا تتلی بھی کہیں جا چکی ہے۔کہیں کھو گئی ہیں۔تتلی سچ کہتی تھی اور سچ کہنے والا سنگسار کر دیا جاتا ہے۔عاشی بے کل ہو گئی۔۔۔وہ اس تتلی کو بچانا چاہتی ہے جو احساس کی تتلی ہے۔۔۔محبت و وفا کی تتلی ہے۔۔۔حسین جذبوں کی تتلی ہے۔۔۔رنگین لفظوں کی تتلی سے۔

عاشی نے کہا:

کونجوں کے اڑنے سے پہلے
دو موسم ملنے سے پہلے
کلیوں کے کھلنے سے پہلے
آج مجھے یہ کہنے دو
تتلی زندہ رہنے دو

کہیں دور سے تتلی نے جواب دیا۔

عاشی ۔۔۔ میں زندہ ہوں۔۔۔ زندہ رہوں گی۔۔۔تمہاری شاعری میں۔

(عائشہ مسعود کے پہلے شعری مجموعے ''تتلی زندہ رہنے دو'' کی تقریب رونمائی کے موقع پر اسلام آباد میں پڑھا گیا)

- بقیہ -

مقدمے کا فیصلہ محفوظ ہے

ان مثالوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ فخر زماں کی شاعری کی کئی جہات اور کئی پہلو ہیں۔ان کی نظموں اور غزلوں کا مزاج بنیادی طور پر روایت شکن ہے جو ہر طرح کی تزئین و اہتمام کے خلاف ہے اور جس کا بنیادی مقصد ہیئت پر نہیں، اظہار خیال پر ہے۔اسی لیے ان کی غزلوں میں اکثر ردیف و قافیے کی پابندیوں کو نظر انداز کیا گیا ہے اور نظم میں بھی پابندی اور اوزان و بحور کو کم سے کم اہمیت دی گئی ہے۔

فخر زماں غزل، نظم، افسانہ، ناول، کردار، پلاٹ، کہانیاں، علامت اور استعارے کے تکنیکی مباحث میں الجھنے کے بجائے خیال اور نظریے کو کاغذ پر منتقل کرنے کی طرف زیادہ توجہ دیتے ہیں اور اپنے اطراف و جوانب کی زندگی کو بغیر رنگ روغن اور آرائش و زیبائش کے سامنے لانے کو زیادہ بہتر اور بامقصد تصور کرتے ہیں۔فخر زماں بنیادی طور پر شعر و ادب میں اپنے انسان دوست اور روشن خیال نظریات کو نظم کرتے ہیں اور چونکہ اپنی زمین اور زمین پر بسنے والے عام انسانوں سے ان کا رشتہ گہرا ہے، اس لیے ان کی تخلیقات میں چاہے وہ شعری ہوں یا نثری، اپنے عصر کی انسانی زندگی کی تمام حشر سامانیاں اور پیچیدگیاں قاری کے سامنے روز روشن کی طرح واضح نظر آتی ہیں، کیونکہ فخر زماں کو اپنے افکار کو اپنے قاری تک پہنچانے کا ہنر بخوبی آتا ہے۔

''دل کا پنچھی''

میرا دیوان

محمودالحسن

(راولپنڈی)

اُن سے مل جانے کا آخر پورا جب ارمان ہوا
دل کا پنچھی قید میں آ کر جانے کیوں حیران ہوا

اُن کے پیچھے چلتے چلتے ہم منزل تک آ پہنچے
اُن کا چلنا پھرنا اُٹھنا بیٹھنا سب قُران ہوا

ایک امانت تھی جو کسی سے ارض و سما میں اُٹھ نہ سکی
آخر جس نے اُس کو اٹھایا وہ بھی اِک انسان ہوا

سارے شہر میں کون کسی دیوانے کو پہچانتا ہے
بڑھتے بڑھتے یہ دیوانہ خود اپنی پہچان ہوا

مجھ کو دیکھ کے دنیا والے جانے کیا کیا کہتے ہیں
کاش اُسے بھی کوئی دیکھے جس پر میں قربان ہوا

اللہ اللہ میرے نبیؐ کے پاس جو بیٹھنے والے تھے
اُن میں کوئی ابو ذرؓ نکلا اور کوئی سلمانؓ ہوا

اہلِ نظر میں وُقعت پائی میرے شعر نے اے محمؔود
حسنِ نعتِ نبیؐ سے مُزیّن جب میرا دیوان ہوا

○

شری سمپورن سنگھ گلزار کو دھن باد

یونس صابر

(پشاور)

جہلم میں ایک بیوپاری کا نیک تھا برخوردار
بنا قلم مزدور تو نکلا گیانی اور فنکار
یعنی اپنا مہا کوی سمپُورن سنگھ گلزار

مانی جائے گی لاہور کی پریس فوٹو شہکار
اُس میں بابا ندیؔم کے لب پر تھی ہلکی مسکان
بے شک جو لگتے تھے شری گلزار کو پتا سمان
آشا رہی ادھوری مل پانے کی دوجی بار

جانا گنگا دیس نصیب ہوا مجھ کو دو بار
مل کر ستیہ پال آنؔند اور امرتا پریتم جی سے
میرا من مچلا کیوں نہ ممبئی تلک ہو آ ؤں
سرکاری افسر تھا تین جگہوں کی ملی اجازت
آڑے آئی برلن جیسی ویزے کی دیوار

○

فخر رہے گا شہرِ فارؔغ کے یونس صابؔر کو
وہ رکھتا ہے ان دیکھے لیجنڈ سے سچّا پیار
میرا اک محسن ہے سرؔدر سخنور تجھ پہ صدقے
اس سے سوا دُوجا بھی ہے جاوید کہانی کار

(مدیر چہارسو گلزار جاوید)

○

''یہ راستہ تم نے خود چُنا ہے''

Live in Relation

یوگیندر بہل تشنہ (کینیڈا)

اے تہذیبِ نو کے دیوانو
تم کیا جانو
عزت و ناموس ہے کیا شئے
تمہارے ادراک کی حد
محدود ہے اپنی ذات تلک
کہ تم تھکتے نہیں یہ دہراتے
جو چاہیں گے کریں گے ہمتو!
جیسے چاہیں گے جئیں گے ہمتو!!
معاشرے کے پابند نہیں ہم!!!
ہم نہیں پابندِ اصول و ضوابط!!!!
یہ زندگی ہماری ہے

سوچو، تم نے آخر
نصف سال لِوان ریلیشن میں رہ کر
کیا کھویا، کیا پایا، کیا سیکھا، اور کیا درس لیا؟؟؟؟
تو ہاں کر ہا، تم نے آخر
معاشرے میں عزت و ناموس کی خاطر
رشتے کو مستند کرنے کی خاطر
فیصلہ لیا
تمہاری ''ہاں'' پر ہی تمکو
آن، بان، شان سے ازدواجی جیون میں باندھا
شاد تھے تُم، خوش تھے سب
دیکھ دیکھ شادی کی البم اِترا رہے تھے تم دونوں
اک دوجے پہ مہربان ہوئے تھے
اب یہ کیا!

ایک ہی سال ازدواجی جیون جیتے!
جینا دوبھر لگنے لگا ہے، زندگی زہراب بنی ہے!!
جیون میں وِش کہاں سے آیا!!!
غور کرو
تم دونوں میں اَن بن کیوں ہے
دہراؤ، دہراتے جاؤ، دہراتے ہی جاؤ
اَن بن کیوں ہے، اَن بن کیوں ہے
اَن بن کیوں ہے۔۔۔
اپنے اندر جھانکو، اپنی انّا طاق پر رکھ دو
ساتھ ساتھ رہنا کیوں دشوار ٹھہرا ہے
تمکو شائد علم نہیں تھا
کھٹّا، میٹھا، تیکھا، کڑوا، کسیلا
جیون کے سب رنگ ہوتے ہیں
نادان نہیں ہو، جہل نہیں ہو
لِوان ریلیشن Live in Relation
شرمندۂ تعبیر ہوا ہے
مذاق اڑا رہا ہے لِوان ریلیشن تمہارا
یہ راستہ تم نے خود چُنا ہے
یہ روح فرسا حکایتیں کیوں
یہ شکوے، یہ شکایتیں کیوں
کوئی نہیں ہے، تم سے جو شکست کی داستان
سنے گا۔ اگر سنے گا تو پہلے جی کھول کر
ہنسے گا۔ پھر مضحکہ خیز انداز میں کہے گا
یہ راستہ تم نے خود چُنا ہے۔

○

وقت منتظر ہے پھر!

(اسرائیل کی فلسطین پر بربریت کے تناظر میں)

غالب عرفان

(کراچی)

لمحہ لمحہ صدیوں کا روپ لے کے ٹھہرا ہے
گرد اڑ رہی ہے اور گردشوں کا پھیرا ہے
آتشیں بگولوں کا رقص ہو رہا ہے

- یا -

آدمی میں پوشیدہ وحشیانہ پن پھر سے
شعلۂ جبلّت کی شکل میں اُبھرتا ہے
زندگی جہنم کی شعلگی میں جلتی ہے
ہر طرف دھواں صورت
دُھند کی کثافت میں
دہشتوں کے منظر ہیں
فرد پیار کا پیاسا گولیاں نگلتا ہے
پھر لہو اُگلتا ہے!
خون بہتا رہتا ہے!!

خون انتقالی بھی! خون ہے جلالی بھی!
خون انضمامی بھی! خون انتقامی بھی!
خوف جسم میں اُترے
تو حیات کی صورت ہر نفس اُبھرتا ہے
خون آنکھ میں اترے
تو ستم کی بنیادیں بے ثبات کرتا ہے
وقت راہ تکتا ہے!
وقت منتظر ہے پھر!!

○

اسیرِ زلفِ سخن

پروفیسر حسن عسکری کاظمی

(لاہور)

قلم کا رشتہ عظیم تر ہے
جو لوحِ دل پہ رقم ہوا ہے
لہو کا رشتہ بھی معتبر ہے
مگر زمان و مکاں سے آگے
جہانِ شعر و سخن میں جتنے سفیر گزرے
وہ ایک رشتے میں منسلک ہیں
قلم کا رشتہ عظیم تر ہے
کہ اس حوالے سے ان سفیروں نے زندگی کو نکھار بخشا
وقار بخشا
قلم قبیلے نے ہر قدم پر چراغِ فکر و نظر جلا کر
ہماری وسعت پذیر دنیا کو روشنی دی
یہی تعارف اسیرِ زلفِ سخن کا ٹھہرا
یہی حوالہ ہماری نظروں میں معتبر ہے
کہ ہم تخیل کی وادیوں میں اب اس کے لہجے سے آشنا ہیں
مثالِ پرچم وہ لب کشا ہے
وہ ایک نغمہ۔۔۔ وہ ایک دھن ہے
کہ اس کے لہجے میں حرف گویا شعورِ ملت جگا رہا ہے
وہ اعتبارِ وطن ہمارے قلم قبیلے کی آبرو ہے
وہ اپنے زخمِ جگر کے ہاتھوں نڈھال ہو کر بھی سرخرو ہے
غزل کا شیدا، وہ نغمہ گر ہے وہ شہرِ خوباں کا ترجماں بھی
وہ حرف حق بھی، وہ اس جہاں کے شہیدِ اعظم کا نوحہ خواں بھی
اسی حوالے سے سیف زلفی ہماری نظروں میں معتبر ہے
وہ مر گیا ہے۔۔۔ مگر امر ہے
قلم کا رشتہ عظیم تر ہے

○

ایک فلسطینی کی طرف سے

سید نصرت بخاری
(اٹک)

ہم نے سب کچھ دیکھا ہے
ظالم کیسا ہوتا ہے
گولی کیسے چلتی ہے
گولا کیسے پھٹتا ہے
جاں کی کتنی قیمت ہے
چھوٹی چھوٹی لاشوں پر مائیں کتنا روتی ہیں
تم نے شاید دیکھا ہو
ہم نے سب کچھ دیکھا ہے
تنہائی کیا ہوتی ہے
اجڑی اجڑی گلیوں میں اجڑے اجڑے لوگوں پر کس کی آنکھیں روتی ہیں
گھر میں سونے والوں کو بے گھر کی تکلیفوں کا کتنا صدمہ ہوتا ہے
ہم نے سب کچھ دیکھا ہے
نعرے میں کیا طاقت ہے
باتیں کتنی وزنی ہیں
یو۔این۔او اور او۔آئی۔سی کتنے خوش کن دھوکے ہیں
ہم نے سب کچھ دیکھا ہے
امت کتنی مخلص ہے
بے حس کیسے ہوتے ہیں
کس میں کتنی غیرت ہے
ہم نے سب کچھ دیکھا ہے

○

گفتہ نا گفتہ

شگفتہ نازلی
(لاہور)

کچھ کہنے کی خواہش سے۔۔۔
کچھ ہم کہہ نہیں پاتے ہیں۔۔اور۔۔۔کچھ کہتے رہتے ہیں۔۔۔

جذبوں کی مہکاروں میں۔۔۔جھرنوں کی جھنکاروں میں۔۔۔
چپ سادھے تصویروں میں چہروں کی تحریروں میں۔۔۔

اور انجان جزیروں میں۔۔۔
کچھ کہنا اور نہ کہہ پانا۔۔۔ایک تواتر سے رہتا ہے۔۔۔
اک بے نام خلش کے ساتھ۔۔۔

کچھ کہتے رُک جاتے ہیں۔۔۔کچھ رُک رُک کر کہہ جاتے ہیں۔۔۔
کہنے نہ کہنے میں ہی شاید۔۔۔پل پرواز کئے جاتے ہیں۔۔۔
منظر منظر کچھ کہتے ہیں۔۔۔ورق ورق پتے اُڑتے ہیں۔۔۔

حرفوں کی لَو دھندلاتی ہے۔۔۔سوچوں کو نندیا آتی ہے۔۔۔

کہی اَن کہی رہ جاتی ہے۔۔۔

○

پرندے کے پیر پر

فیصل عظیم
(کینیڈا)

اک اندیشہ چپکا ہوا ہے
پلکوں کو یوں جکڑے ہوئے ہے
جیسے آنکھوں میں سوزش ہو
کوئی علامت ہو آشوب کی
وہ سیّال ہو، جس کے شر سے
آنکھیں مَلنا، کھولنا مشکل تر ہو جائے
بس پلکوں کی درزوں سے کچھ روشنی باہر کی آتی ہے
ناکافی ہے۔۔۔۔
پھر بھی ناکافی منظر نے
دل کو تھپکی دے رکھی ہے
''سب اچھا ہے
اس کو اچھا ہی رہنے دو
باہر کی چبھتی کرنوں کو
آنا ہو تو آ جائیں گی
اندیشے کا ماڈہ آنکھیں کھلنے سے جو روک رہا ہے
روکے رکھو
خواب سہی، پر خواب نہ توڑو
جب تک یہ ناکافی منظر دیکھ سکو
بس دیکھتے جاؤ''

اندیشہ لیکن آنکھوں میں گھس کر دہرائے جاتا ہے
''منظر بدلا تو کیا ہوگا
خواب ہوا تو
ٹوٹ کے اور بھی کرچیں آنکھوں میں بھر دے گا
خواب نہیں تو
دھو لینے پر شاید سوزش بڑھ جائے گی''

اندیشہ اب تک چپکا ہے
آنکھیں اب بھی بند نہیں ہیں
منظر اب بھی ناکافی ہے
خواب، حقیقت، جانے کیا ہے
سوزش تو بڑھتی جاتی ہے
اندیشہ، 'آشوب کا چیلا'
دھیرے دھیرے آنکھوں کو بھرتا جاتا ہے۔۔۔

خواہشیں

جہانگیر اشرف
(لندن)

میں نے ہر سو
خواہشوں کا جنگل دیکھا
اور ان میں گھرا ہوا ہر دِل دیکھا

یہ خواہشیں
زندگی کی علامت ہیں
اندھیری راتوں میں
روشنی کی علامت ہیں

خواہشیں ہی دراصل
منزل کا پہلا زینہ ہیں
زندگی کے سمندر میں
صورتِ سفینہ ہیں

اپنی خواہشوں کے ہاتھوں
انساں برباد بھی ہے
کل کے لئے پریشاں
آج کو ناشاد بھی ہے

یہ جو اُدھوری ہوں
تو اک فریاد ہیں
یہ جو پوری ہوں
تو شاد ہیں، آباد ہیں

یہ خواہشیں
رہزن بھی ہیں، رہبر بھی
یہ خواہشیں
قاتل بھی ہیں، دلبر بھی

○

''خدا بھول گئے''

فائق باپ کی لائق اولاد

رؤف خیر (حیدرآباد، دکن)

اردو ادب کے بعض مشہور و ممتاز ادیبوں شاعروں کے ساتھ ان کے اپنے بیٹوں کے ''حسنِ سلوک'' کے چند عبرت خیز واقعات کسی فلم کی کہانی پر مشتمل نہیں بلکہ حقیقت پر مبنی ہیں۔

عامر خان نے اپنے ٹی وی سیریئل ستیمے وجیتے میں چند عام ماں باپ کو پیش کیا تھا جنھیں بے یار و مددگار چھوڑ دیا گیا تھا۔ یہاں چند خاص مستند شخصیات کے ساتھ ان کی اولاد کے رویّے کا مصدقہ ذکر کیا جا رہا ہے۔

نریش کمار شاد پہلے لاہور ہی میں رہتے تھے۔ وہ اپنے وطن سے نسبت کر کے خود کو شاد نکودری لکھا کرتے تھے۔ ان کے باپ درد نکودری پختہ اور عروضی قسم کے شاعر تھے تقسیم کے بعد دونوں باپ بیٹے انڈیا آ گئے تھے۔ ایک مشاعرہ سندور میں ہوا جہاں نریش کمار شاد نے قتیل شفائی کو اپنے باپ درد نکودری سے ملوایا تھا۔ قتیل شفائی نے اپنی خودنوشت ''گھنگھرو ٹوٹ گئے'' میں شاد اور درد کی بڑی عبرت انگیز روداد بیان کی ہے کہ ''باپ بیٹے دونوں بیٹھے پی رہے تھے اور ایک دوسرے کو ڈال ڈال کر پلا بھی رہے تھے شاد نے اپنے والد سے قتیل کو ملواتے ہوئے کہا: ''یہ میرے والد ہیں درد نکودری۔ آپ نے ان کا نام سنا ہوگا''

قتیل نے کہا ''بالکل سنا ہے۔ اچھے شعر کہہ لیتے ہیں''

باپ بولا ''قتیل صاحب۔ میں جیسا بھی شاعر ہوں۔ مجھے فخر ہے کہ میں نے ایک اچھا شاعر پیدا کیا ہے۔ میرا بیٹا آپ کے سامنے ہے''

نریش کمار شاد کہنے لگے ''دیکھو قبلہ والد صاحب! آپ اس کا کریڈٹ نہ لیجئے۔ آپ اپنی شاعری کی بات کیجئے۔ مجھے آپ نے شاعر پیدا نہیں کیا تھا۔ میں پیدا ہو گیا تھا اور شاید آپ ہی نے پیدا کیا ہے لیکن شاعر میں خود بنا ہوں۔ یہ کریڈٹ آپ نہ لیجئے۔''

باپ نے کہا ''تو بہت بدتمیز ہو گیا ہے۔ باپ سے اس طرح بات کی جاتی ہے۔''

شاد نے کہا ''آپ بیٹے کے کمائے ہوئے نام میں حصہ دار بننا چاہتے ہیں''

چنانچہ اس بات پر دونوں میں لڑائی ہو گئی۔ باپ نے بیٹے کو تھپڑ مار دیا اور بیٹے نے باپ کو گریبان سے پکڑ لیا اور ہم (قتیل) نے بڑی مشکل سے انھیں چھڑایا۔ جب ایک شرابی کی انا غلط راستہ اختیار کر لیتی ہے تو اس کا ہاتھ باپ پر بھی اٹھتا ہے۔ یہ ہاتھ ایک شرابی کا نہیں بلکہ ایک شاعر کی انا کا ہاتھ تھا جو غلط راستے پر چل نکلی تھی۔'' (گھنگھرو ٹوٹ گئے)

پاکستان کے مشہور شاعر و ادیب جمیل یوسف نے ماہ نامہ ''الحمراء'' لاہور، اپریل ۲۰۱۳ء میں ''بجنگ آمد'' کے مصنف کرنل محمد خان کے بارے میں ایک دردناک واقعہ بیان کیا ہے۔ جب کرنل صاحب نے چک لالہ سکیم نمبر III راولپنڈی میں اپنا عالی شان مکان بنوالیا تو پنڈی کلب کی رہائش سے اس نو تعمیر شدہ مکان میں منتقل ہو گئے۔ اپنے آخری دنوں میں انھوں نے اپنا وہ نیا مکان امریکہ میں مقیم اپنے اکلوتے بیٹے کے نام ہبہ (GIFT) کر دیا۔ (اور GIFT DEED اپنے بیٹے کو بھیج دیا) دو تین ماہ کے اندر ہی بیٹے نے وہ مکان اپنی بیوی کے نام منتقل کر دیا۔ کرنل صاحب کی بہو نے اپنے چند لوگوں کے ساتھ آ کر انھیں گھر سے نکلنے پر مجبور کر دیا تا کہ اسے کرائے پر چڑھا کر چالیس پچاس ہزار روپے ماہانہ کرایہ وصول کر سکے۔ کرنل صاحب نے فون پر بہو کی شکایت کی تو اس زن مرید بیٹے نے معذوری ظاہر کرتے ہوئے کہا:

''ابا جی میں نے غلطی سے مکان اس کے نام منتقل کر دیا ہے۔ اب وہ کہتی ہے میں مکان کی مالک ہوں جو چاہوں کروں۔ وہ میرے کہنے میں نہیں ہے۔ اور نہ میری بات سنتی ہے۔ میں اب کیا کر سکتا ہوں''

جناب جمیل یوسف نے یہ بھی لکھا کہ کرنل محمد خان نے اس ناگفتہ بہ صورتِ حال اور بہو کے اپنے اس مکان پر قبضہ کرنے کی نیت کا اظہار اپنے دوست بریگیڈیئر اسمٰعیل صدیقی سے فون پر کیا۔ گھر کے لان میں بہو مکان پر قبضے کے لیے اپنے چند حواریوں کے ساتھ موجود تھی جب کہ کرنل نے گھر میں گھس کر دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا۔ اندر ہی سے اپنے دوست کو فون کر کے بلایا۔ بریگیڈیئر اسمٰعیل صدیقی آئے اور کرنل محمد خان کو اپنے گھر لے گئے کیونکہ بہو قانونی طور پر مکان کی حقدار ہو چکی تھی۔

ظاہر ہے بہو اور بیٹے کے اس رویے سے کرنل صاحب کو سخت صدمہ پہنچا جو جاں کاہ ثابت ہوا اور ان کی صحت تیزی سے بگڑنے لگی۔ اسی صدمے کے اثر سے وہ فالج کا شکار بھی ہوئے۔ کرنل محمد خان نے اپنی زندگی کے آخری دن چک لالہ III راولپنڈی ہی میں بیٹی کے ہاں بسر کیے جہاں جمیل یوسف نے آخری بار ان سے ملاقات بھی کی تھی۔ (ماہ نامہ الحمراء۔ لاہور۔ اپریل ۲۰۱۳ء)

سرسید احمد خان کے ساتھ بھی ایسی ہی کچھ صورتِ حال پیش آئی تھی۔ ان کے فرزند ارجمند جسٹس محمود نے انھیں اپنی حویلی سے نکال دیا تھا۔ سرسید ایک صندوق لے کر سڑک پر کھڑے ہوئے تھے کہ ان کے ایک قریبی دوست اسمٰعیل صاحب کا ادھر سے گزر ہوا۔ انھیں سرسید نے بتایا کہ ان کے بیٹے نے انھیں بے گھر کر دیا ہے تو وہ سرسید کو اپنے گھر لے آئے۔ سرسید کہتے تھے اتنی بڑی یونیورسٹی قائم کرنے والا کیا اپنے لیے ایک جھونپڑی نہیں بنا سکتا تھا۔ پتہ نہیں تھا کہ یہ دن دیکھنے ہوں گے۔ مختصر یہ کہ سرسید کو سخت دلی صدمہ پہنچا اور وہ چند ہی دنوں میں انتقال کر گئے۔ لائق اولاد جسٹس محمود کو انتقال کی خبر دی گئی تو اس پر کچھ اثر نہ ہوا۔ سرسید کی تجہیز و تکفین کے لیے ان کا صندوق کھولا گیا تو اس میں سے کچھ

نہ نکلا۔ چنانچہ چندے سے میت اٹھانے کا ارادہ کیا گیا۔ سب سے پہلے سرسید کے قریبی دوست محسن الملک سے رجوع کیا گیا تو انہوں نے پچاس روپے چندہ دیا یہ کہہ کر کہ یہ آخری چندہ ہے۔ اسی رقم سے سرسید کی موت مٹی کی گئی۔

علامہ اقبال کے لائق و فائق فرزند جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال نے اپنی خودنوشت سوانح عمری ''اپنا گریباں چاک'' (مطبوعہ سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور نیا اضافہ شدہ ایڈیشن 2006ء) میں صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے فرقہ ملامتیہ کے فرد کی طرح بیان کیا:

''والد (اقبال) کی وفات کے بعد میں ان کے نافذ کردہ ڈسپلن DISCIPLINE سے آزاد ہوگیا۔ جن باتوں سے انھوں نے منع کر رکھا تھا میں نے بڑی رغبت سے ان میں سے ہر ایک کو اپنایا۔ صحیح وغلط میں سے غلط اور نیکی وبدی میں بدی کا راستہ منتخب کرنا بہتر سمجھا۔ اگر سرِشام گھر میں رہنے کا حکم تھا تو میں آدھی رات سے پہلے گھر میں قدم نہ رکھتا تھا۔ اگر سنیما دیکھنا منع تھا تو ہر روز دو دو بلکہ تین تین شو دیکھتا۔ روزمرہ کے باورچی خانے کا حساب لکھتے وقت پیسوں میں گھپلا کرتا۔ رنگ برنگی ریشمی قمیصیں، مہنگے ولایتی بوٹ اور یورپی انداز کے سلے ہوئے سوٹ، نک ٹائیاں، اوورکوٹ، دستانے اور فیلٹ ہیٹ زیب تن کرتا۔ مئے نوشی، یورپی طرز کے رقص اور رات کے کھانے کے لیے معروف جگہوں پر جاتا۔''

اور تو اور جاوید اقبال کو بہت گراں گزرتا ہے جب لوگ انھیں علامہ اقبال کے حوالے سے یاد کرتے ہیں۔ ان کی انا کو ٹھیس لگتی ہے۔ انہوں نے کتاب کے پیش لفظ میں صاف صاف لکھا:

''بچپن میں باپ کے حوالے سے پہچانا گیا تو میں نے برا نہیں مانا کیونکہ مجھے علم ہی نہیں تھا کہ وہ کون ہیں اور کیا کرتے ہیں۔

جوان ہوا تب بھی باپ کے حوالے سے پہچانا گیا۔ یہ میرے لیے پدرم سلطان بود کی بناء پر فخر کا مقام تھا۔

زندگی میں اچھا برا مقام پیدا کیا تب بھی باپ کے حوالے سے پہچانا گیا تو مجھے برا لگا۔ یہ میری ''انا'' کی نشوونما میں مداخلت تھی۔

اب بوڑھا ہو چکا ہوں، تب بھی باپ کے حوالے سے میری شناخت ہوتی ہے۔ عجیب اتفاق ہے میرے والد کے پرستاروں نے مجھے بڑا ہونے نہیں دیا۔''

علامہ اقبال سے تعلق کو اعزاز کے بجائے بوجھ سمجھنے والے جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال جو کچھ ہیں THANKS TO IQBAL ہی تو ہیں۔ خودنوشت سوانح عمریاں تو بے شمار لکھی گئیں مگر خریدنے والا یہ سوچ کر خریدتا ہے کہ علامہ اقبال کے بیٹے نے آخر کیا لکھا ہے۔ جگن ناتھ آزاد کو سلام کرنے کو جی چاہتا ہے وہ بجائے خود کیسے ہی شاعر کیوں نہ رہے ہوں، علامہ اقبال کے حوالے سے پہچانے جانے پر نازاں تھے۔ انھیں اقبال کا بیشتر کلام ازبر بھی تھا۔ اک ایسے وقت جب کہ ہندوستان میں اقبال کا نام لینا بھی جرم سمجھتا جاتا تھا جگن ناتھ آزاد نے سرکاری سطح پر علامہ اقبال کی شاعرانہ حیثیت کا احساس کروایا۔ ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا'' کو ترانہء ہندی کا درجہ دلایا جو آج بھی برقرار ہے۔

علامہ اقبال کے بے حد قریبی دوست سر شیخ عبدالقادر مدیر ''مخزن'' کے بیٹے کا بھی یہی حال ہے۔ خودنوشت سوانح عمریوں میں ایک اور شخص کا ذکر انتظار حسین نے کیا ہے جو اپنے باپ کے نام سے بدکتا تھا۔ وہ سر شیخ عبدالقادر کے لائق صاحب زادے ریاض قادر تھے'' (ماہ نامہ الحمراء لاہور مارچ ۲۰۱۳ء)۔

مجھے نہیں معلوم ریاض قادر کی ادبی حیثیت کیا ہے جب کہ سر شیخ عبدالقادر کو ادب کا ہر طالب علم جانتا ہے۔

اکبر الہ آبادی نے نئی تعلیم کی مخالفت کے باوجود اپنے بیٹے عشرت حسین کو نہ صرف زر کثیر دے کر اعلیٰ تعلیم کے لیے ولایت بھیجا تھا اور وہاں جا کر جب لائق فرزند نے ماں باپ ہی کو بھلا دیا تو ایک طنزیہ قطعہ (بیٹے سے خطاب) لکھ کر انھیں احساس دلانے کی کوشش کی تھی۔

عشرتی گھر کی محبت کا مزہ بھول گئے
کھا کے لندن کی ہوا عہدِ وفا بھول گئے
پہنچے ہوٹل میں تو پھر عید کی پروا نہ رہی
کیک کو چکھ کے سویوں کا مزہ بھول گئے
بھولے ماں باپ کو اغیار کے چرچوں میں وہاں
سایہء کفر پڑا ۔نورِ خدا بھول گئے
موم کی پتلیوں پر ایسی طبیعت پگھلی
چمنِ ہند کی پریوں کی ادا بھول گئے
کیسے کیسے دلِ نازک کو دکھایا تم نے
خمِ فیصلہء روزِ جزا بھول گئے
بخل ہے اہلِ وطن سے جو وفا میں تم کو
کیا بزرگوں کی وہ سب جود وعطا بھول گئے
نقلِ مغرب کی ترنگ آئی تمہارے دل میں
اور یہ نکتہ کہ مری اصل ہے کیا بھول گئے
کیا تعجب ہے جو لڑکوں نے بھلایا گھر کو
جب کہ بوڑھے روشِ دینِ خدا بھول گئے

نئی تعلیم کی تحریک چونکہ سرسید احمد خاں نے چلائی تھی اس لیے آخری شعر میں ان پر بھی چوٹ ہے۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ عشرت حسین مغربی تعلیم حاصل کرنے کے وجہ سے مشرقی تہذیب والوں کو چشم کم سے دیکھتے تھے۔ ایک موقع پر ایک مغربی تہذیب یافتہ دوست نے قلندرانہ ہیئت کذائی والے اکبر الہ آبادی کی طرف اشارہ کر کے عشرت حسین سے پوچھا ? WHO IS THAT FELLOW (یہ کون شخص ہے؟)

باقی صفحہ ۸۳ پر ملاحظہ کیجیے

ذرا سی زندگی

وجاہت علی عباسی

(نیویارک)

جب ''۱۳'' کے عدد کو اُلٹا کیا جائے تو یہ بنتا ہے ''۳۱'' گو کہ یہ صرف دو نمبر ہیں اس کے باوجود ان کی میرے لیے، میرے خاندان اور اُردو زبان کے لیے بہت اہمیت ہے۔

۱۳ یعنی ۱۳ر جون جس تاریخ کو قمر علی عباسی اس دنیا میں آئے اور ۳۱ر مئی جب وہ اس دنیا کو ہمیشہ کے لیے الوداع کہہ کر چلے گئے۔

قمر علی عباسی کی پیدائش ہندوستان کے شہر امروہہ میں ہوئی۔ وہ شہر جس کے ہر گھر میں کوئی نہ کوئی ایسا بچہ ضرور پیدا ہوتا ہے جو ادب کی دنیا میں بڑا نام پیدا کرتا ہے زیادہ دور نہ جائیں تو سید محمد تقی، رئیس امروہوی، جون ایلیا، نذر امروہوی سب ہی کا تعلق امروہہ سے تھا، اس روایت کو قائم رکھتے ہوئے قمر علی عباسی نے تیرہ برس کی عمر سے جنگ اخبار کے بچوں کے صفحے اور مختلف رسائل میں لکھنا شروع کیا وہ حیدر آباد میں رہتے تھے لیکن ڈاک کے ذریعے اپنی کہانیاں کراچی چھپنے بھیجتے۔

قمر علی عباسی کی پیدائش سے پہلے اُن کے تین بھائی اللہ کو پیارے ہو چکے تھے، قمر علی عباسی کے والدین نے اُن کے لیے بے شمار منتیں مانگیں اور ایک منت پوری کرنے کے لیے اُنہوں نے اٹھارہ سال کی عمر تک ایک کان میں بالی بھی پہنی۔ اُن کے والدین نے منّت اُن کی زندگی اور کامیابی کے لیے مانگی تھی۔ وہ کامیابی کی راہ جو اُنہیں بچپن میں ہی مل گئی تھی، اُنہیں عشق تھا اردو زبان سے اور اس کی خدمت میں زندگی وقف کرنے کا فیصلہ اُنہوں نے لڑکپن سے ہی کر لیا تھا۔

نوجوانی کے زمانے میں ہی قمر علی عباسی ریڈیو سے وابستہ ہو گئے۔ ریڈیو وہ جگہ جہاں پاکستان کی ثقافت اور اُردو زبان کی نوک پلک سنوارنے کا بہت کام کیا گیا، سیّد سلیم گیلانی، سلیم احمد عزیز حامد مدنی، حمید نسیم، عمر مہاجر جیسے نام ریڈیو کی شان تھے جہاں طلعت حسین، قربان جیلانی، جمشید انصاری جیسے فنکار قمر علی عباسی کے ریڈیو ڈرامے کے سفر کے ساتھی تھے وہیں امیر خاں، رفعت قدیر ندوی، محمود علی اور محمد یوسف جیسے فنکاروں سے اُنہوں نے بہت کچھ سیکھا۔

زندگی میں سب سے اہم فیصلہ ہوتا ہے شادی، اگر آپ کی شادی کسی ایسے شخص سے ہو جاتی ہے جس سے آپ کی ذہنی ہم آہنگی نہیں ہے اور آپ کی شادی کامیاب نہیں ہے تو چاہے آپ میں کتنا ہی ٹیلنٹ کیوں نہ ہو زندگی صرف روزمرہ کے جھگڑوں کے چھوٹے سے دائروں میں گھر کر رہ جاتی ہے لیکن اگر آپ کی شادی کامیاب ہے آپ کا شریک حیات آپ کو سمجھتا ہے اور آپ کے کام کو آپ کے مقصد کو عزت دیتا ہے تو پھر کامیابی آپ کے قدم چومتی ہے اور یہی کامیابی قمر علی عباسی کو حاصل ہوئی۔

نیلوفر علیم میڈیا کا ایک بہت بڑا نام تھیں لیکن شادی کے بعد اُنہوں نے اپنی تمام تر ترجیحات اپنے شوہر قمر علی عباسی اور بچوں کے لیے وقف کر دیں، نہ صرف ایک بہت اچھی بیوی بلکہ بہت ہی اچھی دوست ثابت ہوئیں۔

میں نے اکثر لوگوں کو خصوصاً خواتین کو یہ کہتے سنا ہے کہ مرد شادی کے ایک دو سال بعد بدل جاتے ہیں لیکن قمر علی عباسی کی شادی شدہ زندگی کا میں چشم دید گواہ ہوں کہ اُنہوں نے نیلوفر عباسی کو ہمیشہ وہی درجہ دیا جس کی وہ مستحق تھیں۔

ہر انسان کی زندگی میں ایک موڑ ایسا آتا ہے جس کے بعد اُس کی زندگی بدل جاتی ہے قمر علی عباسی کی زندگی میں یہ موڑ ''لندن لندن'' تھا، بچوں کی کئی کتابیں لکھنے اور ایوارڈز حاصل کرنے کے بعد اُن کا یہ پہلا سفر نامہ شائع ہوا جس کے بعد سفر ناموں کا یہ سلسلہ کبھی رُکا نہیں۔ اُن کے تیس سے زیادہ سفر نامے شائع ہوئے جو ایک ریکارڈ ہے۔

میں بہت چھوٹا تھا کہ جب اپنے والد کی کتابوں کی رونمائی کی تقریبات میں جانا شروع کیا اور صحیح طرح پڑھ پانے کی عمر تک پہنچنے سے پہلے ہی مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ قمر علی عباسی باکمال لکھتے ہیں۔ ڈاکٹر اسلم فرخی، ڈاکٹر جمیل جالبی، حکیم محمد سعید، سحر انصاری، ڈاکٹر محمد علی صدیقی اور ڈاکٹر پیرزادہ قاسم جیسی شخصیات اُن کی تحریر کی تعریف کرتے تو مجھے اُن کا بیٹا ہونے پر فخر ہوتا۔

ریڈیو کا جب بھی نام لیا جائے گا قمر علی عباسی کو لوگ ضرور یاد کریں گے اُنہوں نے صرف نوکری نہیں کی ریڈیو پاکستان کی بہتری کو اپنی ذمہ داری سمجھا۔ بڑا انسان وہ نہیں ہوتا جو اپنے افسر کو دیکھ کر کھڑا ہو جائے۔ بڑا آدمی وہ ہوتا ہے جو ایک ریٹائرڈ افسر جس سے اب کسی کو کوئی کام نہیں اُسے اپنے آفس میں آتا دیکھ کر اپنی کُرسی چھوڑ کر کھڑا ہو جاتا ہے اور کہتا ہے کہ ''سر یہ آپ کی کرسی ہے، آپ اس پر ہی بیٹھیں گے''۔ یہ تھے قمر علی عباسی۔

اسپانسر کروا کر ریڈیو کے ایسے اہل کاروں کو عمرہ اور حج کروانا جو اس کی استطاعت نہیں رکھتے تھے، ریٹائرڈ ملازمین کی پنشن اور میڈیکل بلز، لوگوں کا وقت پر دفتر آنا اور پورے وقت دیانت داری سے کام کرنے کی پابندی یہاں تک کہ ریڈیو کی بلڈنگ کے باہر فٹ پاتھ پر سینکڑوں بسیرا کرے والے ہیروئنچیوں کو ہٹانا اور ریڈیو کی عمارت کو چاروں طرف سے پھول اور سبزے سے ڈھک دینے کا سہرا قمر علی عباسی کے سر جاتا ہے۔

زندگی جب آپ پر مہربان ہوتی ہے تو آپ دنیا میں جہاں جاتے ہیں پاسپورٹ کے ساتھ اپنی قسمت بھی لے جاتے ہیں، قمر علی عباسی ریڈیو سے ریٹائر ہونے کے بعد امریکہ آ گئے وہ جگہ جہاں زندگی شروع کرنا انتہائی مشکل ہے اور اکثر لوگ عمر کے دوسرے حصے میں امریکہ آ کر بڑی مشکل زندگی گزارتے ہیں

لیکن منتوں مرادوں سے پیدا ہونے والے قمر علی عباسی کو اللہ تعالیٰ نے یہاں بھی وہی رتبہ دیا جو پاکستان میں تھا اور اُن کی اُردو کی خدمت اُس طرح جاری رہی۔

میں خوش نصیب ہوں کہ اللہ نے اتنے بڑے آدمی کا رشتہ مجھ سے جوڑ دیا اور مجھے زندگی میں کتنی ہی اچھی باتیں اُن سے سیکھنے کا موقع دیا، سب سے اہم بات جو میں نے اُن سے سیکھی وہ یہ کہ خوش رہو میں نے اُنہیں کبھی رنجیدہ نہیں دیکھا وہ کہتے تھے کہ یہ ذرا سی زندگی ہے جس کا ہر دن ایک نعمت ہے جب تم کسی بھی دن رنجیدہ ہوتے ہو تو اللہ کی دی نعمت کو ٹھکراتے ہو۔

مئی اکتیس (۳۱) کو قمر علی عباسی کو ہم سے بچھڑے ایک سال ہو گیا لیکن کچھ لوگ اپنی ذرا سی زندگی میں اتنے بڑے کام کر جاتے ہیں کہ اُنہیں ایک زمانہ یاد رکھتا ہے۔ قمر علی عباسی آج بھی اپنی کتابوں میں سانس لے رہے ہیں وہ کہیں گئے نہیں ہیں آج بھی میرے ساتھ موجود ہیں جب اُن سے بات کرنی ہوتی ہے تو اُن کی کوئی بھی سامنے رکھی کتاب کھول کر اُن سے بات کر لیتا ہوں اور وہ مجھے پھر ایک بار ''زندگی کتنی اچھی ہے'' کسی نہ کسی طرح سمجھا جاتے ہیں۔

۳۱ر مئی ۲۰۱۳ء کو قمر علی عباسی اس جہانِ فانی سے رخصت ہونے کے بعد اپنے پیچھے کتابوں کا ایسا خزانہ چھوڑ گئے جو اُنہیں اُس وقت زندہ جاوید رکھے گا جب تک ایک بھی اردو لکھنے پڑھنے اور بولنے والا زندہ ہے، اُنہوں نے نہ صرف کتب تحریر کیں بلکہ اُنہیں آواز کا جامہ پہنایا اُن کے لیے جو بصارت سے محروم ہیں، پڑھ نہیں سکتے سن سکتے ہیں ایسے افراد کے لیے اُنہوں نے ''بریل'' میں بھی اپنی کتابیں منتقل کروائیں۔

قمر علی عباسی کی اہلیہ نیلوفر عباسی اور اُن کے بچوں ثوبیہ، وجاہت، ماریہ، داماد ذکاء الرحمٰن، انصب خاں اور بہو ارج وجاہت عباسی نے ''قمر علی فاؤنڈیشن'' کی بنیاد رکھی جو اُن فلاحی کاموں کو جاری و ساری رکھنے کا عزم رکھتی ہے جو قمر علی عباسی نے اپنی زندگی میں انجام دیتے تھے۔

۱۳ر جون قمر علی عباسی کی سالگرہ کا دن۔ اس سال اس تاریخ پر فاؤنڈیشن نے نیویارک کے ایک ہوٹل میں شاندار تقریب کا اہتمام کیا جہاں نامور شعراء اور ادیبوں نے قمر علی عباسی کو زبردست خراجِ تحسین پیش کیا۔

نیویارک کی ادبی تاریخ میں اُردو زبان کی ترقی و ترویج کے لیے تین کیش ایوارڈز کا اعلان کیا گیا، ایک ایوارڈ بہترین کالم نگاری پر تھا جو کرامت اللہ غوری کو دیا گیا، بہترین سفر نامہ نگار کا ایوارڈ کینیڈا کے اطہر رضوی کو دیا گیا، اُردو زبان کی ترقی و ترویج پر خدمات کے صلے میں ایوارڈ مامون ایمن کو دیا گیا۔

اس موقع پر قمر علی عباسی کی شخصیت پر مضامین اور تصاویر سے مزین نہایت خوبصورت بروشر بھی بانٹا گیا۔

''برف کے شہر'' قمر علی عباسی کی زندگی کا آخری سفر نامہ تھا۔ اس کی اشاعت کا اہتمام نیلوفر عباسی نے اپنے حالیہ کراچی کے سفر کے دوران کیا۔ اس موقع پر ''برف کے شہر'' کو حاضرین نے بے حد سراہا، جلد ہی اس سفر نامے کی تقریب رونمائی کا اہتمام کیا جائے گا، دیگر سفر ناموں کی طرح یہ سفر نامہ بھی ویلکم بک پورٹ کراچی نے شائع کیا۔ اس موقع پر قمر علی عباسی نے مختلف انٹرویوز اور تقاریر پر مبنی ایک ڈاکومینٹری بھی پیش کی گئی۔

نیویارک شہر میں موسلا دھار بارش اور ہوا کے جھکڑوں کے باوجود قمر علی عباسی کے چاہنے والے بڑی تعداد میں اس تقریب میں شریک ہوئے اور نہایت گرمجوشی کے ساتھ اپنے بہترین الفاظ میں قمر علی عباسی کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے پھر ملنے کی آرزو میں بوجھل دلوں کے ساتھ رخصت ہو گئے۔

..... نعت نگینے .....

نسیم سحر کو میں اُس وقت سے جانتا ہوں جب وہ ابھی شاعر بھی نہ بنے تھے اور شعر کہنا میرے لیے تعجب انگیز ہرگز نہ تھا اس لیے کہ پنجاب کے نامور شاعر استادِ سخن حضرت عبدالعزیز فطرت نسیم سحر کی براہِ راست تربیت کر رہے تھے۔ یہ ان کی تربیت کا اثر ہی تھا کہ ان کے شعر میں روانی اور پختگی اس حد تک آ گئی کہ وہ اوائل عمر ہی میں ایک پختہ کار کی طرح نظر آنے لگے۔ انہوں نے اردو کی تمام اصناف سخن میں شعر کہنا شروع کیا اور ایسا معلوم ہونے لگا کہ وہ طرزِ شعر گوئی کا خاص ملکہ لے کر وارد ہوئے ہیں۔ لطف کی بات یہ تھی کہ وہ پرانے طرز کے شاعر نہ تھے۔ ان کی سوچ بھی وقت کے عین مطابق تھی۔

نعت نگاری ذوق سے آگے شوق کی کیفیت انگیز صنفِ سخن ہے۔ عربی، فارسی، اردو بلکہ ہندی میں بھی عاقبت سنوارنے کے لیے شعراء نے رسول اکرم ﷺ سے شرفِ باریابی کی تمنا میں ان کے حضور منظوم التجاؤں کے نذرانے گذرانے ہیں۔ آپ ﷺ کی تعریف و توصیف کا مکمل احاطہ نہ قلم کے بس میں ہے نہ خیال کی بساط میں۔ غالب ''ثنائے خواجہ بہ یزداں گذاشتم'' کہہ کر اس باب میں خوبصورتی کے ساتھ اپنے عجز اظہار کو تسلیم کر گئے۔ تاہم عقیدت اور محبت کی زبان کو مکمل روانی نہ بھی نصیب ہو، یہ رواں ضرور رہتی ہے۔ نسیم سحر کا معاملہ بھی دیگر تمام نعت نگاروں کی مانند ایسا ہی جاننا چاہیے۔

نسیم سحر نے سادہ زبان میں اس بہت ہی لطیف و نازک صنفِ سخن میں اپنے جذبات عقیدت کو خوبصورتی کے ساتھ ڈھالا ہے اور جا بجا نیا مضمون نکالا ہے۔

.....ایوب محسن

''گدھا'' سمجھ کے وہ چپ تھا

ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی
(کراچی)

انسان کو گدھا قرار دینے میں انسان کی توقیر میں تو کوئی خاص اضافہ نہیں ہوتا البتہ گدھے کا استحقاق بری طرح مجروح ہوجاتا ہے۔ گدھے کو کئی شعبوں میں انسان پر فوقیت حاصل ہے مثلاً اس کا سر ہمیشہ ایسی حالت میں رہتا ہے گویا کہہ رہا ہو۔قبول ہے! اس ''قبول ہے'' کا ایک فائدہ تو وہ ضرور اٹھاتا ہے جو اس کا حق بنتا ہے، اس کے علاوہ اس غریب کی قسمت میں اگر کچھ ہے تو کام ،کام اور صرف کام۔ اس لحاظ سے اُس میں اور ایک اوسط درجے کے شوہر میں صرف اتنا ہی فرق رہ جاتا ہے جتنا ہمارے ملک کی دو بڑی سیاسی جماعتوں میں ہے کہ ایک کو چھپاؤ اور دوسری کو نکالو۔

اہل مغرب نے 1824ء میں انجمن انسداد بے رحمی حیوانات'' (SPCA) کے نام سے ایک تنظیم بنائی تھی۔ ہمیں اس کے قیام پر کوئی اعتراض نہیں اس لیے کہ یہ ہماری اس دنیا میں ''لینڈنگ'' سے بہت پہلے کا واقعہ ہے البتہ یہ بات ضرور کھٹکتی ہے کہ اس کے دائرہ کار میں آنے والے ''حیوانات'' کی فہرست بہت محدود ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ بعض مخصوص ''دوپایوں'' کو بھی اس فہرست میں جگہ دی جائے کیونکہ ان کا حال بھی کم بدحال نہیں۔

اپنی حالت اگر میں خود نہ کہوں
کیا انہیں بھی نظر نہیں آتی؟

(ساحر ہوشیارپوری)

ایس پی سی اے ایک بین الاقوامی تنظیم ہے اور پاکستان بھی اس کا ممبر ہے چنانچہ تنظیم کے انسپکٹر کبھی کبھار سڑک پر اُس گدھا گاڑی والے کا چالان کرتے نظر آتے ہیں جس کا گدھا بوجھ برداشت نہ کرنے کی وجہ سے بموں کے سہارے ہوا میں معلق ہوتا ہے لیکن اس سے پہلے گدھے والا راہ گیروں کی مدد سے اپنے گدھے کو زمین پر اتار چکتا ہے۔ بعد ازاں انسپکٹر صاحب اپنے ''فرائض غیر منصبی'' ادا کر کے رفو چکر ہوجاتے ہیں۔ گاڑی بان صرف اتنا کرتا ہے کہ گاڑی میں رکھے ہوئے بوجھ کو سرکا کے آگے کر لیتا ہے اور خود زیادہ کنارے پر آبیٹھتا ہے۔ اسے اس سے کوئی غرض نہیں ہوتی کہ اس طرح گدھے کی مشقت دوچند ہوجاتی ہے۔ ہمیں گدھوں سے پوری ہمدردی ہے اس لیے ہم کراچی ڈنکی کارٹ ایسوسی ایشن کے صدر ذوالفقار شاہ کے اس بیان کا خیر مقدم کرتے ہیں کہ گدھوں پر زیادہ بوجھ نہ ڈالا جائے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ شاہ صاحب نے کون سے گدھوں کی بات کی ہے؟

گدھے خود تو ذات پات کے قائل نہیں (یہاں بھی وہ انسانوں پہ بازی لے گئے) لیکن معاشرے کے وسیع تر مفاد میں ان کو تین طبقات میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ اول وہ جو دفاتر میں پائے جاتے ہیں اور جو اپنے نکمے پن کے باعث گدھوں کے نام پر کلنگ کا ٹیکہ ہیں۔ وہ خارج از بحث ہیں۔ دوم وہ جو گھروں میں ملتے ہیں اور جنھیں عرف عام میں شوہر کہا جاتا ہے اور سوم وہ جو سڑکوں پر نظر آتے ہیں۔ اگر ذوالفقار شاہ صاحب نے یہ بیان صرف تیسری قسم کے گدھوں کے حق میں دیا ہے تو یہ حد درجے کی تنگ نظری ہے۔ گدھا تو گدھا ہے، چاہے گھر کا ہو یا سڑک کا۔ ہر نیک کام کا آغاز گھر سے ہوتا ہے لہٰذا شاہ صاحب کو پہلے اُن گدھوں کی فکر کرنی چاہیے تھی جن کا کوئی والی وارث نہیں۔ سڑک والے گدھوں کو تو ایس پی سی اے کی سرپرستی بھی حاصل ہے، گھر کے مسکین گدھوں پر میر صاحب کا وہ مصرع صادق آتا ہے کہ

ع منہ تکا ہی کرے ہے جس تس کا۔

ہم جن گدھوں کی بات کر رہے وہ بے زبان تو نہیں البتہ کام کی زیادتی انہیں کبھی کبھار بدزبان بنا دیتی ہے جس کا خمیازہ انہیں زیادہ کام کر کے بھگتنا پڑتا ہے بالکل ایسے ہی جیسے کہا جاتا ہے کہ جمہوریت کی تمام خرابیوں کا علاج مزید جمہوریت ہے۔ کچھ عرصے قبل ہمارے ایک دوست نے ہمیں اور ہماری بیگم کو اپنے نئے گھر میں دوپہر کے کھانے پر مدعو کیا۔ کھانے سے پہلے ہلکی پھلکی گفتگو کا رخ نہ جانے کس طرح صنفی مساوات کی طرف مڑ گیا۔ ہمارا موقف یہ تھا کہ چونکہ مرد اور عورت ایک گاڑی کے دو پہیے سمجھے جاتے ہیں لہٰذا دونوں کے حقوق برابر ہونے چاہئیں۔ تاہم ہمارے دوست کی بیگم نے ہم سے اختلاف کرتے ہوئے کہا ''بھائی صاحب، شاید آپ مجھے قدامت پسند کہیں لیکن سچی بات یہ ہے کہ مرد گھر کا باس ہوتا ہے۔ اسے عورت پر فوقیت حاصل ہے۔'' ایک پڑھی لکھی اور جہاندیدہ خاتون کے منہ سے یہ کریمانہ گفتگو سن کر ہم سُن ہوگئے۔ (اگر ان کے الفاظ کی بلاغت پر زیادہ غور کرتے تو شاید ''مُن'' بھی ہوجاتے۔) ہمیں زیادہ خوشی اس بات کی تھی کہ انہوں نے حق وصداقت کا یہ علم ہماری بیگم کی موجودگی میں بلند کیا تھا۔ ہم نے ایک نظر بیگم پر ڈالی تو انہوں نے ایسی کھا جانے والی نگاہوں سے ہمیں گھورا گویا کہہ رہی ہوں ''مجھے ذلیل کرانے یہاں لائے تھے؟'' اسی اثنا میں ہمارے دوست، مشروبات سے بھرے گلاسوں کی ایک ٹرے لیے کمرے میں آئے۔ جب وہ بڑی سعادت مندی کے ساتھ مشروبات مہمانوں کے آگے رکھ کر لوٹ رہے تھے تو ان کی بیگم اپنا گلاس اٹھاتے ہوئے تحکمانہ لہجے میں ان سے مخاطب ہوئیں ''جیلانی صاحب، میلے کپڑے بہت جمع ہوگئے ہیں، دھو دیے نا؟'' اب ہماری بیگم نے ایک فاتحانہ نظر ہم پر ڈالی لیکن ہم نے اسے ایک زوردار چھینک میں اڑا دیا۔

ہمارے ایک سابق رفیق کار بڑے اصرار کے ساتھ کہا کرتے تھے کہ عورت مرد کی ہر بات کا یقین کر لیتی ہے۔ ہم سمیت دیگر تمام احباب کو ان سے اختلاف تھا۔ عام خیال اور تجربہ یہی بتاتا ہے عورتیں ہمیشہ نا کہنے والوں (Naysayers) میں رہتی ہیں۔ عورت، مرد کی بات کا یقین کر لے یہ ممکن ہی نہیں۔ ایک روز جب انہوں نے بڑی شدّ ومد کے ساتھ اپنے موقف کا اعادہ کیا تو دوستوں نے ان کے لتّے لے لیے۔ تاہم انہوں نے ایسا مضبوط استدلال پیش کیا کہ سب ساتھی ان سے اتفاق کرنے پر مجبور ہو گئے۔ بقول موصوف ''شادی سے پہلے کی ملاقاتوں میں محترمہ کو راغب کرنے کی خاطر مَیں ان سے کہتا تھا کہ تمام عمر تمہارا غلام بن کر رہوں گا۔ بس اس پر انھوں نے اندھا یقین کر لیا اور اپنے اس یقین میں ذرا سی بھی دراڑ کو گناہ تصور کرتی ہیں۔'' اگرچہ بات بالکل واضح تھی لیکن ہم نے مزید اطمینان کے پیش نظر ان سے دریافت کیا ''گھر کے کام کاج کون کرتا ہے؟'' ''کام کاج؟'' وہ منمنائے ''اس معاملے میں وہ مجھے گدھا سمجھتی ہیں۔ اب آگے کیا کہوں؟'' ان کے جواب سے ہمیں بڑی تقویت حاصل ہوئی کہ وہ بھی ہمارے ''پیٹی'' بھائی نکلے۔

ذوالفقار شاہ صاحب کے بیان پر ہمارا دوسرا اعتراض یہ ہے کہ انہوں نے صرف گدھوں کی بات کی ہے... پٹھوں کو نظر انداز کر گئے۔ ''پٹھ'' اس جونیئر وی آئی پی گدھے کو کہتے ہیں جسے محنت کش گدھے کے ساتھ محض مصاحبت یا پھر تربیت کی غرض سے جوت دیا جاتا ہے۔ گاڑی کا تمام بوجھ ''وفاقی گدھے'' پر ہوتا ہے وہ غریب لاٹھی کھاتا بھی ہے اور سہتا بھی ہے۔ ہم نے اپنی آنکھوں سے لاٹھی کو بطور ایکسی لریٹر بھی استعمال ہوتے دیکھا ہے۔ اس کے برعکس وی آئی پی ''پٹھ'' کے نصیب میں بغیر کام کیے تمام مراعات لکھ دی گئی ہیں۔ بیوروکریسی کے حوالے سے آپ ''پٹھ'' کو او ایس ڈی کہہ سکتے ہیں جبکہ نظام حکومت کے تناظر میں ''پٹھ'' کو وزیر مملکت، مشیر یا معاون خصوصی سمجھ لیں تو بات بالکل واضح ہو جائے گی۔ سابق وزیر حج مولانا حامد سعید کاظمی کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ حج پھڈے میں وہ اندر بھی گئے، کابینہ سے باہر بھی ہوئے اور آج تک مقدمات کی پیشیاں بھگتا رہے ہیں۔ ان کی اتنی سی بات کوئی ماننے کو تیار نہیں کہ ان کے بنک اکاؤنٹ میں جو بھاری غیر ملکی کرنسی پائی گئی وہ ان کے ایک بھائی نے بھیجی تھی اور ان کی ملکیت میں جو وسیع وعریض زمین ہے وہ ان کے مریدوں نے بطور ہدیہ انھیں دی تھی۔ سچ یا جھوٹ کا فیصلہ ابھی ہونا باقی ہے لیکن دوسری طرف ان کی وزیر مملکت محترمہ شگفتہ جمانی کی نیک نامی پر حرف نہیں آیا۔ جب کوئی کام ہی نہیں ہوگا تو پھر کہاں کی انکوائری اور کہاں کا مقدمہ!

ہم یہ کالم ختم کر رہے تھے کہ ایک دیرینہ دوست ملاقات کے لیے آ گئے۔ ہمارے ان دوست نے کبھی شادی نہ کرنے کا عہد کر رکھا تھا۔ شاید اسی لیے وہ اپنے حلیے سے بے نیازی برتتے تھے۔ اپنے بے ہنگم لباس اور بے تکی وضع قطع سے وہ ایک انتہائی بدذوق بلکہ پھوہڑ شخص لگتے تھے۔ ہم نے جب بھی ان کی توجہ اس طرف مبذول کرائی انہوں نے جواب میں ناصر کاظمی کا یہ مصرع پڑھ کر ہمارا منہ بند کر دیا کہ

ع نئے کپڑے پہن کر جاؤں کہاں اور بال بناؤں کس کے لیے؟

تاہم اس روز ہم نے دیکھا کہ موصوف انتہائی نفیس اور استری شدہ سفاری سوٹ میں ملبوس تھے۔ چہرے پر تازگی تھی اور جوتا چمک رہا تھا۔ گرمی کے باعث انہوں نے پیر جوتوں سے باہر نکالے تو ہم نے دیکھا کہ موزے (جن میں سے عموماً انگلیاں جھانکتی تھیں اور انگوٹھے پورے کے پورے باہر ہوتے تھے) صحیح سلامت تھے۔ ہم نے ان کی اس نئی جُون پر اظہار مسرت کرتے ہوئے کہا ''آخر توڑ دیا نا آپ نے اپنا غیر شرعی اور غیر فطری عہد؟'' بولے ''ہاں یار، وہ صفائی ستھرائی کا بہت خیال رکھتی ہے۔ سب سے پہلے اس نے مجھے یہی کام سکھائے۔''

ماں کے اندر ایک سمندر

بعض لوگ جن میں یعقوب نظامی، عمران شاہد بھنڈر، محمد حسین چوہان اور اردو فورم کے دوست جیسے تارکِ وطن شامل ہیں، ان کی شاعری کی حیثیت دیکھ کر پہلے حیرانی ہوتی ہے پھر جب ان کی شاعری میں ایک تارکِ وطن کے احساسات وجذبات کا مشاہدہ ہوتا ہے تو وہ ان کی تصورات کی ترجمانی لگتی ہے۔ چنانچہ محمد اقبال بھٹی بھی دوسری سماجی خوبیوں کے ساتھ شعری وصف کے حامل ایسے شاعر ہیں جن کا دل ہر وقت محبت کے گیت گاتا ہے۔ حال ہی میں اُن کا دوسری شعری مجموعہ ماں! اب گلے لگا لو مجھ کو منظر عام پر آیا ہے۔ تو ماں کی عظمت پر یہ نظمیں دیارِ غیر میں محمد اقبال بھٹی صاحب کو طمانیت قلب سے سرشار کر رہی ہیں۔

میں نے انہیں لاہور میں بیٹھ کر پڑھا تو مجھے اپنی والدہ محترمہ (مرحومہ) کی شفقت، محبت اور اپنائیت یاد آ گئی جس سے میں اب محروم ہوں اور یوں محسوس ہوا کہ میری ماں کا سایہ اب بھی موجود ہے اور ابرِ کرم کی طرح میرے وجود پر چھایا ہوا ہے۔ برطانیہ میں مقیم یعقوب نظامی، ممتاز احمد خان، محمد حسین چوہان، ملک فضل حسین، خواجہ محمد عارف، شفیق قاسم، ممتاز احمد، ڈاکٹر عبد الرب ثاقب، فاروق نسیم، جہانگیر اشرف، افتخار احمد اور عمران شاہد بھنڈر نے اپنے الفاظ میں محمد اقبال بھٹی کی شاعری کو سراہا ہے۔ لیکن مجھے یوں محسوس ہوا کہ اپنے پیش الفاظ میں یہ سب اپنی اپنی ماؤں کو یاد کر رہے ہیں اور ان کی آنکھیں آنسوؤں سے نم ہیں۔

''فون پر بات''

ایک ملاقات دھرم راج سے

امرناتھ دھمیجہ
(لدھیانہ، بھارت)

فون پر بات کی ہم نے ایک دن دھرم راج سے
ملنا چاہتے ہیں ہم آپ کو کچھ کام کاج سے

دھرم راج کاپی اے بولا تو ہم آپ کو ملا نہیں سکتے
موت آنے سے قبل کسی بھی بشر کو لا نہیں سکتے

اتفاق سے کچھ دن بعد اچانک ہمارا ہارٹ فیل ہوگیا
دھرم راج سے ہمارا سیدھا ہی میل ہو گیا

دیکھا جو کھاتہ دھرم راج نے ہمارا تو مسکرانے لگے
بلایا اپنے دوت کو اور یوں فرمانے لگے

مورکھو میں نے کہا تھا کہ لانا ہے سیٹھ سوم ناتھ کو
آپ پکڑ لائے ایک غریب سے شاعر امر ناتھ کو

دوت بولا سر یہ تو کارپوریشن والوں کی Mistake ہے
ایک کی کوٹھی کا نمبر ہے گیارہ اور دوسرے کا بٹہ ایک ہے

دائیں سوم ناتھ ہے اور بائیں رہتا امرناتھ ہے
ہم تو اُسی کو پکڑ لائے جو لگا ہمار ے ہاتھ ہے

دھرم راج جی مجھ سے مخاطب ہوکر بولے آپ نے اپنی صفائی میں کچھ کہنا ہے
اب آ ہی گئے ہو تو بتاؤ کہ پہلے سورگ میں جاؤ گے یا نرک میں رہنا ہے

میں نے کہا حضور میں تو آپکے اونچے دوار میں آیا ہوں
کفن سے ڈھانپے منہ اپنا ہو کے بہت شرم سار آیا ہوں
گناہوں کی گٹھڑی تھی اتنی بھاری کہ اٹھا نہ سکا
چار بھائیوں کے کندھوں پہ ہو کے سوار آیا ہوں

آپ کے اس نرک سے دنیا کا نرک بھی کچھ کم نہیں
وہاں میں اپنی تمام عمر گذار آیا ہوں

آپ تھکے ماندے ہو کیونکہ آئے ہو ہزاروں میل سے
دھرتی پہ بھی کیا نرک ہے بتاؤ تو سہی ذرا تفصیل سے

میں نے کہا پرم پتا پرماتما نے بنا کے بھیجا تھا انسان ہمیں
دولت کے لالچ نے بنا دیا شیطان ہمیں

کیا کیا کرم کیے ہم نے یہ بتا نہیں سکتا
کھڑا ہوں سر جھکائے نظریں میں آپ سے ملا نہیں سکتا

ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے کچّی کلیوں کو ماں کی کوکھ میں مارا ہم نے
اگر زندہ بچ گئیں تو جہیز کی بلی پر اتارا ہم نے

لیڈر جو بنے ہم تو ہندو مسلم کو مذہب کے نام پر لڑا دیا
خود بیٹھے گدی پر اور انہیں مندر مسجد میں الجھا دیا

جہاں چاہا جب چاہا مذہب کی آڑ میں دنگا کرا دیا
اور تو اور اپنی ہی بہو بیٹیوں کو سربازار ننگا کرا دیا

چلتی بس میں ایک معصوم کی عزت کو تار تار کر دیا ہم نے
اپنی ہوس کی خاطر ساری قوم کو شرم سار کر دیا ہم نے

سیندھ لگا رہا ہے ہر انسان دھرم راج جی آپکی ریاست میں
بڑا ماہر اور چالاک ہے یہ انسان ووٹوں کی سیاست میں
جس دن کامیاب ہوگیا یہ انساں موت کو قابو کرنے کی پوزیشن میں
دھرم راج جی آپ کی گنتی ہوگی اپوزیشن میں

رشوت مہنگائی اور گھوٹالوں کا تو ذکر ہی کیا ہر جانب بیڑا ہی غرق ہے
اب بتاؤ دھرم راج جی آپکے نرک میں اور ہمارے نرک میں کیا فرق ہے

اپنے مُرلی والے سے کہہ دو اب ضرورت نہیں مرلی کی تان کی
ایک بار جا کر تو دیکھو کیا حالت کر دی انسان نے انسان کی

آج کا یہ ترقی یافتہ انسان عزت آبرو تو کیا انسانیت تک کھو رہا ہے
قدم قدم پر ہو رہا ہے دروپدی کا چیر اور ہر گھر میں تیرا سداماں رو رہا ہے

ایک صدی کا قصہ

نوشاد علی

دیپک کنول (ممبئی، بھارت)

میں اس مضمون کی شروعات ایک دلچسپ واقعہ سے کرتا ہوں۔ ایک نوجوان کی شادی ہونے والی تھی۔ نکاح سے پہلے باپ نے بیٹے کو الگ لے جا کر کہا کہ بیٹا اگر لڑکی والے تم سے پوچھیں گے کہ تم کیا کام کرتے ہو تو یہ مت کہنا کہ میں فلموں میں کام کرتا ہوں۔ کہنا کہ میں بمبئی میں درزی کا کام کرتا ہوں۔ آپ جانتے ہیں یہ نوجواں کون تھا۔ یہ تھا موسیقار اعظم نوشاد۔ یہ وہ زمانہ تھا جب فلم میں کام کرنے والوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھا نہ جاتا تھا۔

نوشاد کا جنم 25 دسمبر 1919 کو اُتر پردیش کے نوابی شہر لکھنو میں ہوا۔ اُنکے والد کا نام واحد علی تھا جو کہ پیشے سے عدالت کے منشی تھے۔ واحد علی بڑے ہی نیک اور پرہیز گار آدمی تھے۔ وہ پانچ وقت کے نمازی تھے اور دینی اصولوں کے پابند تھے۔ نوابوں کے شہر میں رہ کر بھی وہ کوئی نوابی شوق نہیں رکھتے تھے۔ وہ گانے بجانے سے انتہائی نفرت کرتے تھے۔ ویسے بھی اُس زمانے میں اس پیشے کو میراثیوں کے ساتھ منسوب کیا جاتا تھا۔ نوشاد کو بچپن سے ہی موسیقی کے ساتھ لگاؤ تھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ جب بچہ تھا تو لکھنو سے 25 کلومیٹر دور بارہ بنکی چلا جاتا تھا جہاں دیوا شریف کے مزار پر میلہ لگتا تھا اور جہاں ملک بھر سے آئے ہوئے قوال اپنا پروگرام پیش کرتے تھے۔ ننھا نوشاد ان قوالوں کو سن کر جھوم جایا کرتا تھا۔

نوشاد نے سب سے پہلے جو ساز بجانا شروع کیا وہ ہارمونیم تھا۔ اصل میں اُسے ہارمونیم کی مرمت کرنے والوں کے یہاں کام مل گیا۔ بس مرمت کا کام سیکھتے سیکھتے اُسنے ہارمونیم بجانا سیکھ لیا۔ کم عمری میں ہی اُسنے جونیر تھیٹریکل کلب میں شمولیت اختیار کی۔ چونکہ وہ ہارمونیم بجانا جانتا تھا اسلئے اُسکو موسیقاروں کا سرپرست بنایا گیا۔ اُن دنوں کیا ہوتا تھا کہ تھیٹر کے مالک بہت سارے سازندوں کو جمع کرتے تھے اور وہ سارے بیٹھ کر خاموش فلم دیکھتے تھے۔ فلم کے سین دیکھ کر وہ نوٹس بنالیا کرتے تھے اور پھر سین کے حساب سے پردے کے آگے بیٹھ کر سنگیت بجایا کرتے تھے۔ رائل تھیٹرس لکھنو کے مالکان نے نوشاد کو یہ کام سونپا۔ نوشاد اور اُسکے سارے سازندے پردے کے سامنے بیٹھ کر سین کے حساب سے سنگیت بجایا کرتے تھے جس سے دیکھنے والوں کا مزہ دوبالا ہو جاتا تھا۔ نوشاد کو یہیں سے بیک گراونڈ موسیقی کی تربیت ملی اور وہ اس کام میں ماہر ہو گیا۔

کم سنی میں ہی اُسنے اپنا میوزک گروپ بنالیا جس کا نام اُسنے ''وینڈ سر میوزک اینٹرٹینرز'' رکھا۔ یہاں سے وہ لکھنو کی گول گنج کالونی میں چل رہی سٹار تھیٹریکل کمپنی میں چلا گیا۔ یہاں رہ کر اُسنے لاڈن خان کی نگرانی میں موسیقی کی تربیت لی۔ وہ تب تک اُن کے ساتھ رہا جب تک کہ اس قابل نہ ہوا کہ وہ آزادانہ طور پر موسیقی ترتیب دے سکے۔ اسی گروپ میں رہ کر اُسنے ہندوستانی لوک سنگیت سے ایسے ایسے گیت جمع کئے جو کہ نایاب تھے۔ پنجاب، راجستھان، گجرات اور سوراشٹر کے لوک سنگیت سے اُسنے بھرپور استفادہ کیا۔ اُنکی تھیٹر کمپنی شہر شہر گھومتی تھی۔ نوشاد ملک کے ہر خطے کے کلچر سے واقف ہو رہا تھا۔

نوشاد فلموں کا دیوانہ تھا۔ 1931 میں جب فلمیں بولنے لگیں تو بارہ سال کا نوشاد کا جنون تو اور بھی بڑھنے لگا۔ نوشاد علی کے والد کو جب اس بات کی بھنک لگ گئی کہ اُنکا بیٹا سنگیت کے پیچھے دیوانہ ہو چکا ہے تو وہ چراغ پا ہو اُٹھے اور اُنہوں نے بیٹے کو اپنے کمرے میں بلا کر کہا کہ ''تمہیں موسیقی چاہیے یا یہ گھر'' نوشاد منہ سے کچھ نہیں بولے۔ اپنے والد کی طرف الوداعی نگاہوں سے دیکھا اور پھر وہ فوراً گھر سے نکل گیا اور سیدھے بمبئی کا رخ کیا۔

شروع کے ایام اُس نے لکھنو کے ہی ایک جان پہچان کے آدمی کے گھر میں گزارے جو کہ کولابہ کے علاقے میں رہتے تھے۔ اُسے یہاں سکون نہ ملا اور وہ یہ جگہ چھوڑ کر دادار کے علاقے میں رہنے چلا گیا۔ یہاں وہ براڈوے تھیٹر کے فٹ پاتھ پر رات گزارا کرتا تھا۔ دادا میں رنجیت اسٹوڈیو کے سامنے سنگیت کے ساز و سامان کی ایک دکان تھی۔ نوشاد اکثر اُس دکان کے سامنے جا کر کھڑا ہو جاتا تھا۔ ایک دن مالک دکان نے اُس سے پوچھا کہ بھئی بات کیا ہے۔ تم میری دکان کے سامنے کھڑے کیوں ہو جاتے ہو تو نوشاد نے کہا کہ وہ کام کی تلاش میں ہے۔ وہ ہارمونیم کی مرمت کرنا بخوبی جانتا ہے۔ مالک دکان نے اُسے ملازم رکھا اور کچھ دنوں کے بعد دکان کی چابی بھی اُسی کو سونپ دی تا کہ وہ دکان میں سو بھی سکے اور صبح جلدی اُٹھ کر دکان کی صفائی بھی کر سکے۔ ایک دن دکان کا مالک جلدی ہی آ گیا۔ اُسنے کیا دیکھا کہ یہ لڑکا ہارمونیم کے سروں میں ایسا ڈوبا ہوا ہے کہ اُسے اس بات کا بھی ہوش نہیں کہ دکان کا مالک اُسکے سر پر آ کے کھڑا ہے۔ وہ آدمی بھی بڑا بھلا مانس تھا اُسنے اندازہ لگالیا کہ یہ لڑکا اپنے اندر بے پناہ صلاحیت رکھتا ہے۔ اُسنے اُسکی مدد کرنے کی ٹھانی اور وہ اُسے اُسوقت کے مشہور موسیقار اُستاد جھنڈے علی خان کے پاس لے گیا۔ جھنڈے خان نے اُسے چالیس روپے ماہانہ پر اپنے اسسٹنٹ کے طور پر رکھ لیا۔ نوشاد نے پہلی بار ایک گانا کمپوز کیا جس کے بول تھے۔ ''کیوں یہ دل دیوانہ۔ ہے عقل سے بیگانہ'' یہ فلم جس کا سنگیت اُس وقت جھنڈے خان دے رہا تھا اُس کا پروڈیوسر ایک روسی تھا۔ فلم کسی وجہ سے بن نہ پائی تو نوشاد کا گیت بس ایک یاد بن کر رہ گیا۔ جھنڈے خان سے الگ ہونے کے بعد نوشاد کو اُستاد مشتاق حسین کے گروپ میں جگہ مل گئی۔ نوشاد پیانو بخوبی بجاتا تھا۔ اُس نے مشتاق حسین کے معاون کے طور پر 1938 میں دو فلمیں کیں جن کا نام ''نرالا ہندوستان'' اور ''باغبان'' تھا۔ 1939 میں اُسنے مشتاق حسین کے اسسٹنٹ کے طور پر ایک اور فلم کی جس کا نام ''پتی پتنی'' تھا۔ افسوس کے اُسے کوئی کریڈٹ نہ ملا۔ اسی بیچ اُسے ایک

نامکمل فلم کا سنگیت پورا کرنے کا موقع مل گیا اور پہلی بار اُسے موسیقار حسین کے معاون کا کریڈٹ مل گیا۔اس سے پہلے کہ وہ اپنی پہلی کامیابی کا جشن منا پاتا خبر ملی کہ وہ فلم کمپنی بند ہوگئی اور نوشاد ایک بار پھر فٹ پاتھ پر آ گیا۔

بہت جلد قسمت اُس پر مہربان ہوگئی۔ایک دن کھیم چند پرکاش اُسکی زندگی میں خوشی کی نوید لے کر آ گیا۔اُسنے 60 روپے ماہانہ کی پگار پر اُسے اپنے ساتھ بطور معاون رکھ لیا۔یہ فلم تھی رنجیت اسٹوڈیو کی ''کنچن'' جسکے موسیقار کھیم چند پرکاش تھے۔موسیقار کھیم چند پرکاش اُس زمانے کے پائے کے سنگیت کار مانے جاتے تھے۔وہ ایک ایسی فلم کمپنی کے ساتھ جڑ گئے تھے جو اُس زمانے میں سب سے معتبر اور اول نمبر کی کمپنی مانی جاتی تھی۔یہ کمپنی تھی ''رنجیت اسٹوڈیو'' جسکے روح رواں سیٹھ چندولال شاہ تھے جن کے حکم کو کوئی نہیں ٹالتا تھا۔نوشاد کھیم چند پرکاش کے اس احسان کو ساری زندگی نہ بھلا پائے۔وہ اُنہیں گورو کھیم چند پرکاش کہہ کر بلاتے تھے۔نوشاد نے بطور سازندہ منوہر کپور اور کھیم چند پرکاش کے ساتھ دو فلمیں کیں۔''آنکھیں'' اور ''غازی صلاح دین''۔

ڈی این مدھوک اپنے زمانے کے مشہور رائٹر تھے جن کی انڈسٹری میں بڑی عزت تھی۔اُنکی لکھی ہوئی بیشتر فلمیں کامیابی کے جھنڈے گاڑ چکی تھیں۔وہ ایک پنجابی فلم بنا رہے تھے جس کا نام ''مرزا صاحباں'' تھا۔اس فلم کا موسیقار منوہر کپور ہی تھا اور نوشاد بطور معاون اُسکے ساتھ کام کر رہا تھا۔اس فلم کے دوران ڈی این مدھوک نے نوشاد کی چھپی صلاحیتوں کو پہچانا اور اُسنے اس لڑکے کو آگے بڑھانے کا بیڑہ اُٹھا لیا۔یہ وہ زمانہ تھا جب ڈی این مدھوک کی انڈسٹری میں کافی دھاک تھی۔ایک دن وہ اُسے رنجیت اسٹوڈیو کے مالک چندو لال شاہ کے پاس لے کر گئے۔ڈی این مدھوک اُنکی فلم لکھ رہے تھے۔اُنہوں نے سیٹھ چندولال شاہ کے سامنے نوشاد کو کھڑا کیا اور سیٹھ جی سے بولے کہ آپ اپنی اگلی فلم کا سنگیت دینے کا چانس اسے دیجئے۔اگر آپ اس کی سنگیت سے مطمئن نہ ہوئے تو جو پیسہ آپ مجھے دینے والے ہیں اُس میں سے وہ سارے پیسے کاٹ لیجئے جو آپ سنگیت پر خرچ کریں گے۔یاد رہے کہ اُس زمانے میں مدھوک صاحب سب سے مہنگے رائٹر تھے۔مدھوک کا اس لڑکے میں اسقدر اعتماد دیکھ کر چندولال شاہ نے مدھوک صاحب کی بات مان لی۔

چندولال سیٹھ نے نوشاد کو اپنی اگلی فلم کے لئے سائن کیا۔نوشاد نے اس فلم کے لئے ایک گانا بھی ریکارڈ کیا۔گانے کے بول تھے۔''بتا دے کوئی کون گلی گئے شام'' ایک گانا ریکارڈ کرانے کے بعد نوشاد نے یہ فلم چھوڑ دی۔مدھوک کو اس فیصلے سے دکھ بھی ہوا اور حیرت بھی۔پوچھنے پر پتا چلا کہ کوئی بھی سازندہ نوشاد کے ساتھ تعاون کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔وہ تو اس لونڈے کو میوزک ڈائرکٹر ماننے کے لئے تیار ہی نہیں تھے اور اُسکا حکم ماننے کی بجائے اُسکا مذاق اُڑایا کرتے تھے اسلئے اُسنے دل برداشتہ ہو کے فلم ہی چھوڑ دی۔اُسنے مدھوک صاحب کا شکریہ ادا کیا اور اُن سے وعدہ کیا کہ مستقبل قریب میں وہ اُنکے ساتھ فلم ضرور کریں گے۔یہ چانس چھوڑنے کے بعد اُسنے معاون بننے پر ہی اکتفا کیا اور مدھوک صاحب کی ہی پنجابی فلم ''مرزا صاحباں'' میں بحیثیت معاون سنگیت کار کے کام کرنا قبول کیا۔یہ فلم 1939 میں ریلیز ہوئی۔

ڈی این مدھوک موہن بھونانی کی فلم ''پریم نگر'' لکھ رہے تھے۔وہ اسکے کہانی کار، مکالمہ نگار اور گیت کار تھے۔فلم لکھتے ہوئے اُنکے ذہن میں نوشاد کا خیال بار بار آ رہا تھا۔وہ اُسے وہ مقام دلانا چاہتا تھا جس کا وہ حقدار تھا۔ڈی این مدھوک کی مسلسل کاوشوں کی بدولت 1940 میں نوشاد کو بحیثیت موسیقار پہلا بریک ملا۔یہ اُن ہی کی لکھی فلم تھی ''پریم نگر'' جس کی کہانی کچھ (گجرات) کے پس منظر میں بنی گئی تھی۔نوشاد نے اس فلم پر خوب تحقیق و محنت کی۔اُسنے اُس علاقے کے لوک سنگیت کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالا۔اس فلم کے ریلیز ہونے کے بعد اُسے دو اور فلمیں مل گئیں جن کا نام ''درشن'' اور ''سٹیشن ماسٹر'' تھا۔اسی بیچ اے آر کاردار کی نگاہ کرم اُس پر ہوئی اور اُس نے اُسے اپنی فلم ''نئی دنیا'' کیلئے سائن کیا۔یہ فلم 1942 میں ریلیز ہوئی۔اسی سال اے آر کاردار کی ایک اور فلم ریلیز ہوئی جس کا نام ''شاردا'' تھا۔اس فلم سے نوشاد کو سنگیت پریمیوں نے پہچاننا شروع کر دیا۔اس فلم میں اُسنے تیرہ سال کی بی بی ثریا سے ایک گانا گوایا تھا جو کہ ہیروئن مہتاب پر فلمایا گیا تھا۔اس گانے کے بول تھے۔''پنچھی جا جا''۔یہ گانا اُس دور کا سپر ہٹ گانا ہے۔

''شاردا'' کے گانوں کی مقبولیت اور نوشاد کی لگن سے عبدل رشید کاردار اتنا متاثر ہوا کہ اُسنے اپنے رشتہ دار محبوب خان سے نوشاد کی سفارش کی۔محبوب خان کا پسندیدہ سنگیت کار انل بسواس تھا۔اگر دونوں میں معاوضے کو لے کر اختلاف نہ ہوا ہوتا تو نوشاد شاید وہ نوشاد نہ بن پاتا جو وہ انل بسواس کے محبوب فلمز چھوڑنے سے بن پایا۔محبوب خان کی گنتی اول نمبر کے ہدایت کاروں میں ہونے لگی تھی۔محبوب خان کی دو فلمیں ''عورت'' اور ''روٹی'' نے محبوب خان کو قدآور ہدایت کاروں میں لا کر کھڑا کر دیا تھا۔

نوشاد نے کاردار فلمز کی بیشتر فلمیں کیں۔کاردار فلمز کے ساتھ نوشاد نے یہ معاہدہ کر لیا تھا کہ وہ کاردار کی فلموں کے علاوہ باہر کی فلمیں بھی کر پائے گا۔اسلئے نوشاد کاردار فلمز سے باہر بھی کام کرنے کے لئے آزاد تھا۔اسی بیچ کاردار کی 1944 میں ریلیز ہونے والی فلم ''رتن'' نے تو نوشاد کی تقدیر ہی بدل کر رکھ دی۔اس کے گانوں نے ایسی دھوم مچا دی کہ صرف ایک سال کے عرصے میں ریکارڈ کمپنی کو رائلٹی کے طور پر تین لاکھ روپے مل گئے جو کہ اُس زمانے میں بہت ہی کثیر رقم مانی جاتی تھی۔اس فلم سے نوشاد کی پہچان بنی اور وہ راتوں رات شہرت کے ساتویں آسمان تک پہونچ گیا۔اس فلم کے بعد اُس نے اپنا معاوضہ پچیس ہزار کر دیا جو کہ بہت بڑی رقم تھی۔اسی بیچ گھر والے اُسکے پیچھے پڑے تھے کہ اُنہوں نے اُسکے لئے ایک لڑکی ڈھونڈ کے رکھی ہے۔وہ آ کر اُس سے نکاح کر لے۔نوشاد اُنہیں ٹالتا رہتا تھا۔اُس نے کبھی بھی گھر والوں کو اپنے بارے میں سچ نہیں بتایا، یہاں تک کہ جب وہ کامیابی کی سیڑھیاں چڑھتا گیا تب بھی وہ اپنے کام کو اپنے گھر والوں سے چھپاتا

رہا۔ جب گھر والے سر پڑ گئے تو ایک دن نوشاد نے لکھنو کی ٹرین پکڑی اور سیدھے اپنے گھر لکھنو پہونچ گیا۔ شادی کی تاریخ پہلے سے ہی طے ہو چکی تھی۔ بس دلہا میاں کا انتظار تھا۔ وہ جب گھر پہونچا تو اُسے دلہا بنا کر دلہن کے گھر پہونچا دیا گیا۔ دلہا بننے سے پہلے اُسکے والد نے اُسے ایک کونے میں لے جا کر کہا کہ اگر لڑکی والے تم سے پوچھیں گے کہ تم کیا کام کرتے ہو تو کہنا کہ میں بمبئی میں درزی کا کام کرتا ہوں۔ نوشاد اپنے والد کا منہ حیرت سے تکنے لگا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ جب وہ برات لے کے اپنے سسرال پہونچا تو وہاں پر بینڈ باجے والے جو دھن بجا رہے تھے وہ نوشاد کی فلم ''رتن'' کی ہی تھی۔ اُنکے والد کی ہی طرح نوشاد کے سسر بھی سنگیت کے خلاف تھے۔ نوشاد کی موجودگی میں ہی وہ دونوں گانے والوں کو کوس رہے تھے۔ نوشاد کی حالت یہ تھی کہ نک نک دیدم دم نہ کشیدم۔ نکاح ہوا تو اُسنے کمرے میں بیٹھے سب لوگوں کو نوشاد نے باہر جانے کے لئے کہا۔ وہ اپنے سسر سے اکیلے میں بات کرنا چاہتا تھا۔ اُسکے سسر کا ماتھا ٹھنکا۔ اُسنے سوچا کہ لڑکا جہیز کی مانگ کرے گا۔ جب سب لوگ باہر چلے گئے تو نوشاد نے اپنے سسر سے کہا کہ آپ یہ مت سوچئے کہ میں آپ سے کچھ مانگنا چاہتا ہوں۔ آپ نے مجھے جو کچھ دیا وہ کیا کم ہے جو میں آپ سے کچھ اور مانگوں۔ میں آپ سے صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس شادی پر جتنا کچھ خرچہ آیا وہ میں نے اپنے ہاتھوں سے کمایا ہے۔ میں آپ کی بیٹی کو خوش رکھنے کی کوشش کروں گا۔ اُسکا سسر جذباتی ہو گیا اور اُسنے اُسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ باہر سب لوگ بیٹھ کر یہی اٹکلیں لگا رہے تھے کہ نوشاد میاں نے اپنے سسر سے جہیز کی مانگ کی ہوگی جو کہ اُن دنوں ایک عام بات تھی۔

فلم ''رتن'' کے بعد اُسنے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ کم عمری میں اُسنے وہ مقام حاصل کیا جسے پانے کے لئے کئی جنم لگ جاتے ہیں۔ اُسکی اگلی فلم ''انمول گھڑی'' تھی جو باکس آفس پر بیحد کامیاب رہی۔ نوشاد نے عبدل رشید کاردار کے لئے کئی ساری فلمیں کیں مگر جس فلم نے اُسے صحیح معنوں میں کامیابی سے ہمکنار کر دیا وہ فلم تھی 1946 میں ریلیز ہونے والی اے آر کاردار کی ''شاہجہاں''۔ یہ وہ زمانہ تھا جب پورے ملک میں سہگل کا بخار چڑھا ہوا تھا۔ ہر سنگیت پریمی سہگل کے گانوں کا دیوانہ تھا۔ ایسے میں ایک نوجواں موسیقار کا سہگل کے ساتھ کام کرنا فخر کی بات سمجھی جاتی تھی۔ نوشاد کا یہ دیرینہ خواب تھا کہ وہ سہگل صاحب کو اپنی ہدایت میں گوائیں نوشاد کا یہ خواب کاردار نے پورا کیا۔ ''شاہجہاں'' میں اُسنے اپنے محبوب گلوکار کو اپنی ہدایت میں گوایا۔ محمد رفیع بھی سہگل صاحب کا دیوانگی کی حد تک پرستار تھا۔ اُسکی دلی تمنا تھی کہ وہ سہگل صاحب کے ساتھ ایک بار گا لے۔ ایک دن وہ نوشاد صاحب سے ملا اور اُس سے اپنی خواہش ظاہر کی۔ نوشاد صاحب نے اُسکی یہ دلی تمنا پوری کی اسی فلم میں محمد رفیع نے سہگل صاحب کے ساتھ دو لائینیں گائیں۔ ''روجی او روجی میرے سپنوں کی رانی'' کچھ بے مثال اور لاجواب گانے جو کاردار فلمز کے لئے نوشاد نے کمپوز کئے وہ ہیں۔ ''ایک تو ہو ایک میں ہوں، ایک ندی کا کنارہ ہے'' آواز ثریا۔ فلم ''قانون'' ''آن ملو میرے شیام سنوریا'' آواز پرل گھوش اور جی ایم درانی۔ فلم ''نمستے'' ''چلے گئے چلے گئے دل میں آگ لگانے والے'' آواز زہرہ بائی انبالہ والی۔ فلم ''پہلے آپ'' ''آج مچی ہے دھوم، جھوم خوشی میں جھوم'' اور افسانہ لکھ رہی ہوں دل بیقرار کا'' یہ 1947 میں کاردار بینر تلے بننے والی فلم ''درد'' کے سپر ہٹ گانے تھے اس فلم میں اُسنے ایک نئی گلوکارہ کو پیش کیا جس کا نام اُما دیوی تھا جو بعد میں ٹن ٹن کے نام سے جانی جانے لگی۔

سچ تو یہ ہے کہ نوشاد کی زندگی میں خوبصورت موڑ تب آیا جب فلم ''شاہجہاں'' ریلیز ہوئی۔ اس فلم میں سہگل صاحب کے چھ گانے تھے۔ ہر گانا لاجواب تھا، ''غم دئے مستقل، کتنا نازک ہے یہ دل'' ''کر لیجئے چل کر میری جنت کے نظارے'' ''اے دل بیقرار جھوم'' ''جب دل ہی ٹوٹ گیا پھر جی کر کیا کریں گے'' ''اہ بربادکرے گی ہم کو معلوم نہ تھا'' اور ''میرے سپنوں کی رانی روجی روجی''۔ یہ گانے سن کر ایسا لگتا تھا کہ سرسرگم کے کسی ماہر اُستاد نے یہ گانے کمپوز کئے ہیں۔

نوشاد کا سنہری دور 1948 سے شروع ہوا۔ پہلی فلم محبوب خان کی ''انوکھی ادا'' تھی جسمیں اُسے محبوب خان کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا تھا۔ یہ فلم گولڈن جبلی ہٹ رہی۔ اُسکے بعد اسی سال ایس یوسنی کی فلم ''میلہ'' ریلیز ہوئی جس نے باکس آفس پر دھوم مچا دی۔ یہاں سے دلیپ کمار اور نوشاد کا ایسا ملن ہوا کہ اُسکے بعد بیشتر فلموں میں نوشاد نے ہی سنگیت دیا۔ اسکے بعد 1949 کی محبوب خان کی ہی فلم ''انداز'' تھی جو کہ ایک یادگار اور کامیاب ترین فلم مانی جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جب نوشاد کی صاحب نے لتا منگیشکر کو ''انداز'' کے گانا گانے کے لئے بلا لیا تو محبوب فلمز میں کانا پھوسی شروع ہو گئی۔ سب لوگ نوشاد کے اس فیصلے پر حیران تھے کہ اُس نے شمشاد کو چھوڑ کے ایک مراٹھی لڑکی کو ''انداز'' کے گانے گانے کے لئے کیوں بلا لیا۔ اور لوگوں کے علاوہ اس فیصلے کے خلاف دلیپ کمار بھی تھے۔ محبوب خان نے نوشاد کو بلا کر پوچھا۔ ''میری فلم میں دلیپ کمار، راجکپور اور نرگس کام کر رہے ہیں۔ یہ فلم محبوب خان کی فلم ہے۔ اتنی بڑی فلم میں اس مراٹھی لڑکی کا نرگس کے لئے گانا مجھے مناسب نہیں لگ رہا ہے۔'' نوشاد صاحب نے قدرے ناراضگی سے کہا ''محبوب صاحب۔ مجھے میرا کام کرنے دیجئے۔ ویسے لتا کو گوانے میں مجھے کچھ بھی غیر مناسب نہیں لگ رہا ہے۔'' جب گانے تیار ہوئے تو نوشاد صاحب نے محبوب خان اور دلیپ کمار کو ریکارڈنگ پر بلا لیا۔ جب اُنہیں گانے سنائے گئے تو وہ دم بخود ہو کر رہ گئے۔ وہ گانے تھے۔ کوئی میرے دل میں ۲۔ اُٹھائے جا اُنکے ستم اور جئے جا ۳۔ دادھر دارا۔ او میری لاڈلی ۴۔ ڈر نا محبت کر لے (شمشاد کے ساتھ) ۵۔ یوں تو آپس میں (رفیع کے ساتھ) یہ پانچ گانے اتنے پر اثر اور خوبصورت تھے کہ کئی سالوں تک یہ گانے ریڈیو سے مسلسل بجتے رہے۔

اسی سال اے آر کاردار کی دو فلمیں ریلیز ہوئیں۔ ''دل لگی'' اور ''دلاری''۔ دونوں فلموں نے سلور جبلی منائی مگر سنگیت تو سپر ہٹ رہا۔ فلم ''دلاری'' سے ایک نئے ستارے کا جنم ہوا جس کا نام محمد رفیع تھا۔ اس فلم کا گانا ''سہانی رات ڈھل چکی، نا جانے تم کب آو گے'' نے لاکھوں سنگیت

پریمیوں کو محمد رفیع کا دیوانہ بنا ڈالا۔ 1950 میں نوشاد کی دو فلمیں ریلیز ہوئیں ۔ایک تھی ایس یوسنی کی ''بابل'' اور دوسری تھی اے آر کاردار کی داستان ۔ایک فلم کا ہیرو دلیپ کمار تھا تو دوسری فلم کا ہیرو راج کپور تھا۔ یہ دونوں اُس دور کے سب سے بڑے ایکٹر تھے جنہیں دیکھنے کے لئے سینما پریمی تھیٹر پر ٹوٹ پڑتے تھے۔ یہ دونوں فلمیں بیحد کامیاب رہیں۔

درحقیقت نوشاد کا پسندیدہ گلوکار طلعت محمود تھا۔ ہوا یوں کہ ''بابل'' کی ریکارڈنگ کے دوران ایک دن طلعت محمود نے نوشاد صاحب کے سامنے سگریٹ لے کر سلگایا۔ نوشاد صاحب طلعت کی اس حرکت سے اتنے برہم ہوئے کہ اُنہوں نے طلعت محمود کو فلم سے الگ کر دیا اور اُسکے بعد طلعت محمود کو گانے کے لئے کبھی نہیں بلایا۔ اس فلم کے گانے مکیش نے گائے۔ طلعت کا جانا محمد رفیع کے لئے وردان ثابت ہوا۔ اسکے بعد نوشاد نے محمد رفیع کے ساتھ آخری دم تک کام کیا۔

1950 اور 1951 میں نوشاد کی دو فلمیں ریلیز ہوئیں۔ یہ فلمیں تھیں ''داستان'' اور ''جادو''۔ ان فلموں میں پہلی مرتبہ نوشاد نے مغربی آرکسٹرا کا استعمال کیا۔ ان گانوں کو سنگیت پریمیوں نے بیحد پسند کیا۔ نوشاد کلاسیکل سنگیت پر زیادہ یقین رکھتا تھا۔ اس سنگیت میں اس مٹی کی خوشبو تھی اسلئے کلاسیکل گانے لوگوں کو زیادہ پسند تھے۔ انیل بسواس کے بعد یہ نوشاد تھے جس نے لتا کی آواز کو بڑی خوبصورتی سے تراشا۔ اس بات کا اعتراف لتا نے کئی بار اپنے انٹرویوز میں کیا۔ نوشاد کو لتا پر اس قدر اعتماد تھا کہ اُسنے مشکل سے مشکل ترین گانے لتا کو دئے جو اُس نے بڑی خوبصورتی سے گائے۔ جب فلم ''دیدار'' ریلیز ہوئی تو اُس فلم کے گانوں نے موسیقی کے دیوانوں کو نوشاد اور لتا کا دیوانہ بنا ڈالا۔ اس فلم کا ہر گانا بے مثال تھا۔ ا۔ بچپن کے دن بھلا نہ دینا۔ ۲ دیکھ لیا میں نے قسمت کا تماشہ دیکھ لیا۔ لتا محمد رفیع۔

1952 میں پھر وہ فلم آئی جس نے نوشاد کو شہرت کی معراج تک پہونچا دیا۔ وہ فلم تھی ''بیجو باورا''۔ یہ ایسی فلم تھی جو اپنے گانوں کی وجہ سے آج بھی یاد کی جاتی ہے۔ اس فلم میں نوشاد نے اپنی تمام تر صلاحیتں بروئے کار لائیں تھیں اور ایسا سنگیت تیار کیا تھا جو آج بھی اُتنا ہی مقبول ہے جتنا کل تھا۔ اس فلم نے ریکارڈ توڑ بزنس کیا۔ اس فلم کی کامیابی کا سہرا فلم کے سنگیت کو جاتا ہے۔ ایک سے ایک گانا۔ لتا منگیشکر اور محمد رفیع نے اس فلم کا سنگیت امر کر دیا تھا۔ ا۔ موہے بھول گئے ۔۲۔ بچپن کی محبت کو دل سے نہ جدا کرنا۔ ۳۔ او دنیا کے رکھوالے، سن درد بھرے میرے نالے ۴۔ من تڑپت ہری درشن کو آج ۵۔ تو گنگا کی موج میں جمنا کی دھارا۔ ۶۔ جھولے میں پون کے آئی بہارے۔ دور کوئی گائے دھن یہ سنائے۔ تیرے بنا چھلیا رے''۔ یہ وہ گانے تھے جنہیں کلاسیکل دھنوں پر تیار کیا گیا تھا اور ان گانوں کا خمار سنگیت پریمیوں پر کچھ اس طرح چڑھا کہ فلم کئی سالوں تک سینما ہال سے اُتری ہی نہیں۔ اس فلم نے دادر کے براڈوے تھیٹر میں سلور جوبلی منائی۔ اس فلم کے مدھر اور کانوں میں رس گھولنے والے سنگیت کے لئے نوشاد کو اسی تھیٹر میں بلا کر خراج تحسین پیش کیا گیا۔ نوشاد نے رقت بھری آواز میں کہا کہ ''اس تھیٹر کی سیڑھیوں سے اس اسٹیج تک آنے میں مجھے سولہ سال لگ گئے۔ میں نے جب اپنا سفر شروع کیا تھا تو اسی تھیٹر کی سیڑھیوں پر میں رات کو سویا کرتا تھا''

نوشاد نے محبوب خان کے ساتھ کئی ساری فلمیں کیں۔ یہ ساری کی ساری بیحد کامیاب رہیں ۔''انمول گھڑی'' ''اعلان'' ''انوکھی ادا'' ''انداز'' ''آن'' ''امر'' اور ''مدر انڈیا''۔ میں نے ایک انٹرویو میں سنا کہ محبوب صاحب نوشاد صاحب سے کہتے تھے کہ اُنہیں اس سچویشن کے لئے ایک گانا چاہیے تو نوشاد صاحب اپنے پسندیدہ گیت کار شکیل بدایونی کو بٹھاتے تھے اور اُنہیں سچویشن سمجھا کر گانا لکھواتے تھے۔ پھر وہ گانا ریکارڈ کر کے محبوب صاحب کو بھیج دیتے تھے۔ محبوب صاحب گانے کو پکچرائز کرتے تھے۔ اس طرح کی ذہنی ہم آہنگی تھی ان دونوں کے بیچ۔

نوشاد نے جس گلوکار کے ساتھ بھی کام کیا وہ گلوکار امر ہوگیا۔ سریندر سے لے کر مہندر کپور تک جس نے بھی نوشاد صاحب کی ہدایت میں گایا وہ جاوداں ہوگیا۔ غلام حیدر کے بعد یہ نوشاد ہی تھا جس نے ملکہ ترنم نور جہاں سے ایسے گانے گوائے جو ہندو پاک میں لافانی بن کر رہ گئے۔ فلم ''انمول گھڑی'' کا گانا۔ آواز دے کہاں ہے دنیا میری جواں ہے۔ آج بھی ہر دل میں جوان ہے۔ آجا میری برباد محبت کے سہارے۔ کیا مل گیا بھگوان میرے دل کو دکھا کے۔ جواں ہے محبت حسین ہیں نظارے۔ من لیتا ہے انگڑائی۔ مُن دل میں درد بسا لائی۔ سوچا تھا کیا، کیا ہوگیا ایسے بے مثال گانے ہیں جنہوں نے نور جہاں کو شہرت کے بام عروج تک پہونچا دیا۔ اگر نور جہاں نے پاکستان ہجرت نہ کی ہوتی تو لتا منگیشکر کو اتنی شہرت کبھی نہ ملتی۔ چونکہ نور جہاں کے جانے سے موسیقی کی دنیا میں ایک خلا پیدا ہوگیا تھا جسے لتا نے پر کیا۔

نوشاد کی یادگار فلموں سے ایک فلم ہے ''مغل اعظم''۔ اسی موضوع پر پہلے ہی ایک فلم بن کر ریلیز ہوئی تھی جس کا نام ''انارکلی'' تھا۔ اس فلم کی موسیقی نے تو دھوم مچا دی تھی۔ اس کا ہر گانا سپر ہٹ تھا۔ اس فلم کی موسیقی جانے مانے سنگیت کار سی رامچندر نے دی تھی۔ نوشاد کے لئے یہ ایک چیلنج تھا۔ اُسے ''مغل اعظم'' میں کچھ اسطرح کا سنگیت دینا تھا جو انارکلی سے بھی بڑھکر ہو۔ ''انارکلی'' ایک چھوٹے بجٹ کی فلم تھی جب کہ ''مغل اعظم'' بہت بڑے بجٹ کی فلم تھی۔ اس فلم کا ڈائرکٹر کے آصف تھا۔ اس فلم کے کلاکار اُس زمانے کے سپر سٹار دلیپ کمار اور مدھو بالا تھے۔ ساتھ میں پرتھوی راج کپور تھا۔ نوشاد اس فلم کے سنگیت میں ایسا ڈوب گیا کہ وہ کھانا پینا بھول گئے۔ مہینوں کی عرق ریزی کے بعد اُنہوں نے کئی گانے تیار کئے جو ہر طرح سے لاجواب تھے۔ ''محبت کی جھوٹی کہانی پہ روئے''۲۔ بے کس پہ کرم کیجئے سرکار مدینہ ۳۔ جب رات ہو ایسی متوالی پھر صبح کا عالم کیا ہوگا۔ ۴۔ خدا نگہبان ہو تمہارا۔ ۵۔ یہ دل کی لگی کم کیا ہوگی۔ ۶۔ پنگھٹ پہ نندلال چھیڑ گئو رے۔ ۷۔ تیری محفل میں قسمت آزما کے ہم بھی دیکھیں گے۔ ۸۔ جب پیار کیا تو ڈرانا کیا۔ ۹۔ زندہ باد، زندہ باد، اے محبت زندہ باد۔ اور دو کلاسیکل گانے جو کہ اُستاد بڑے غلام علی خان نے گائے تھے۔ شبھ دن آئیو اور پریم جوگن بن جاوں۔ کہا جاتا ہے کہ بڑے

غلام علی خان فلموں میں گانے کے خلاف تھے۔نوشاد صاحب نے کسی کی معرفت خان صاحب تک رسائی پالی اور وہ کے آصف کو لے کر خان صاحب سے ملنے گئے۔ نوشاد صاحب نے اُستاد جی کو بڑی عزت دی۔استاد جی نے پوچھا کہ تم مجھ سے کس سلسلے میں ملنا چاہتے ہو۔اس سے پہلے کہ نوشاد صاحب کچھ کہتے ،آصف صاحب بولے کہ ہم ایک فلم بنا رہے ہیں، اُسمیں آپ کو ایک گانا گانا ہے۔ بڑے غلام علی خان فلم کا نام سنتے ہی ہتھے سے اُکھڑ گئے اور نوشاد صاحب کی طرف دیکھ کر بولے۔ یہ تم کس احمق کو اپنے ساتھ لائے ہو؟ اُنکا اتنا کہنا تھا کہ نوشاد صاحب کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا ایک طرف سنگیت کا اُستاد اور دوسری طرف ایک جانا مانا ہدایت کار۔وہ کیا کہیں اور کس سے کہیں ۔وہ اسی کشمکش میں تھا اور کے آصف بضد تھا کہ اُسے اس آدمی سے اب گانا گوانا ہی ہے۔ بڑے غلام علی خان نے سوچا کہ یہ آدمی بھی میرا پیچھا چھوڑنے والا نہیں ہے۔کیوں نہ اس سے ایک گانا گانے کا تنا معاوضہ مانگا جائے کہ یہ سنتے ہی یہاں سے بھاگ جائے۔اُستاد نے کہا کہ میں ایک گانا گانے کے پچیس ہزار لیتا ہوں۔آصف صاحب نے کہا کہ آپ کے گانے انمول ہیں۔یہ رہے پچیس ہزار روپے۔روپے اُنکے سامنے رکھ کر وہ وہاں سے چلدئے۔

وہ جب ریکارڈنگ کے لئے آئے تو ضد کر بیٹھے کہ پہلے اُنہیں وہ سین دکھایا جائے جہاں پر اُنہیں گانا ہے۔ وہ ریل تھیٹر میں چلائی گئی اور اُسکے بعد اُنہوں نے وہ سین دیکھ کر گایا۔دو گانے گانے کا معاوضہ اُنہوں نے پچاس ہزار روپے لیا جو کہ اُس دور کے حساب سے بہت ہی زیادہ تھا۔اُس زمانے میں بڑے سے بڑا گلوکار دو سے تین ہزار روپے معاوضہ وصول کرتا تھا۔بہر حال ان دو گانوں کی فلم میں شمولیت سے فلم کو ایک الگ ہی رنگ مل گیا تھا۔اس فلم نے جسطرح کا بزنس کیا وہ اپنے آپ میں ایک مثال ہے۔اس کامیابی میں نوشاد کی موسیقی کا بھی بڑا دخل تھا۔

''مغل اعظم'' کی کامیابی کے بعد اُسنے دلیپ کمار کے ساتھ کئی فلمیں کیں جن میں ''کوہ نور''''گنگا جمنا'' اور ''لیڈر'' شامل ہیں۔پہلی دو فلموں نے تو دھوم مچادی مگر تیسری فلم ''لیڈر'' اتنی نہ چلی جتنی کہ توقع کی جاتی تھی حالانکہ اس کے سنگیت کو بیحد پسند کیا گیا۔اُسکے بعد فلم ''پالکی'' آئی جو نا کام رہی اور یہاں سے نوشاد کی کامیابی کا ستارہ ماند پڑ گیا اور وہ فلموں سے کنارہ کشی کرنے پر مجبور ہو گیا۔سنگیت کی لے تال بدل چکی تھی۔مغربی موسیقی فلموں پر اس قدر حاوی ہو چکی تھی کہ کلاسیکل سنگیت ایک طرح سے خانہ بدر ہو چکا تھا۔نوشاد نے بدلتے رجحان سے سمجھوتہ کرنا گوارہ نہ کیا اور اُنہوں نے فلموں سے دست بردار ہونا ہی مناسب سمجھا۔

نوشاد صاحب دلیپ صاحب کے یہاں اکثر آیا جایا کرتے تھے۔ میری اُن سے اکثر دعا سلام ہو جایا کرتی تھی۔وہ بہت ہی حلیم اور ملنسار تھے۔کسی کو چھوٹا بڑا نہیں سمجھتے تھے۔شعر و ادب کا اچھا خاصا ذوق و شوق رکھتے تھے۔وہ جب بھی دلیپ صاحب کے ساتھ بیٹھتے تھے تو شعر و شاعری کی محفل شروع ہو جاتی تھی۔

نوشاد صاحب پانچ وقت کے نمازی تھے۔اُن کے دل میں ہر مذہب کے لئے احترام تھا۔اُنہوں نے جس عقیدت سے نعت ریکارڈ کی اُسی شردھا سے اُنہوں نے بھجن بھی پیش کیا۔بھجنوں میں اُنکے کمپوز کئے ہوئے بھجن سب سے اول مانے جاتے ہیں۔وہ چاہے ''انصاف کا مندر ہو یا بھگوان کا گھر ہو۔من ترپت ہر یدرشن کو آج۔پنگھٹ پہ نند لال چھیڑ گئیو رے۔او دنیا کے رکھوالے سن درد بھرے میرے نالے وغیرہ وغیرہ۔

کہا جاتا ہے کہ نوشاد صاحب کو اپنے رہن سہن سے بڑا پیار تھا۔ جب وہ ایک بار امریکہ چلے گئے تو اُسوقت کے صدر نے اُنہیں رات کے کھانے پر وائٹ ہاوس میں مدعو کیا۔ہر دعوت نامے کے ساتھ یہ ہدایت رقم تھی کہ ہر کوئی کالا جیکٹ اور کالی ٹائی پہن کے ہی اس دعوت میں شریک ہو سکتا ہے۔نوشاد صاحب کو بڑا غصہ آیا۔اُنہوں نے کبھی بھی ٹائی نہیں پہنی تھی۔پہلے یہ فیصلہ کیا کہ وہ اس دعوت میں شریک نہیں ہونگے۔بعد میں یہ سوچ کے اُٹھے کہ کسی کے کہنے سے میں اپنا پوشاک کیوں بدلوں۔وہ بند گلے کی شیروانی پہن کر چلے گئے جو کہ اُن کا پسندیدہ لباس تھا۔جب وہ اُس پارٹی میں چلے گئے تو امریکہ کے صدر نے اُس کے پاس جا کر نہ صرف اُسکی شیروانی کی تعریف کی بلکہ اپنے کلچر سے اسقدر لگاو ہونے پر اُسکی ستائش بھی کی۔ایسے تھے نوشاد صاحب۔

1942 سے لے کے 1960 تک فلمی سنگیت کی اونچی پائدان پہ براجمان رہے۔اُنکی فلموں میں سے 26 فلموں نے سلور جوبلی (25) ہفتے،8 نے گولڈن جوبلی (50) ہفتے منائی۔اور 4 نے پلاٹینم جوبلی (60) ہفتے منائی۔نوشاد صاحب کو بے شمار اعزازات سے نوازا گیا ہے۔1981 میں اُنہیں دادا صاحب پھالکے اعزاز سے نوازا گیا۔1992 میں اُنہیں پدم بھوشن سے نوازا گیا۔

نوشاد صاحب کے معاون ہدایت کاروں میں موسیقار محمد شفیع، جیری عمل دیو اور موسیقار غلام محمد نے برسوں تک اُنکے ساتھ کام کیا۔نوشاد صاحب کا بڑا پن دیکھئے کہ غلام محمد جو کہ کمال امروہی کی فلم ''پاکیزہ'' کی موسیقی دے رہا تھا کہ اُنکا بے وقت انتقال ہو گیا اور وہ کام اُدھورا چھوڑ کر اس دنیا سے رخصت ہوئے۔نوشاد صاحب نے اپنے اسسٹنٹ کا کام پورا کیا۔

نوشاد صاحب آخری ایام میں صاحب فراش رہے۔ وہ 5 مئی 2006 کو 86 سال کی عمر میں اس جہاں فانی سے کوچ کر گئے۔اُنہیں جوہو کے قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا۔وہ اپنے پیچھے چھ بیٹیاں اور تین بیٹے چھوڑ کر گئے۔ اُنکے دو بیٹے رحمٰن نوشاد اور راجو نوشاد بطور معاون اُنکے ساتھ کام کرتے رہے۔رحمٰن نوشاد نے تو ڈائرکشن میں بھی ہاتھ آزمایا۔اُس نے دو فلمیں کیں۔''گڈو'' اور ''تیری پائل میرے گیت''۔ان دونوں فلموں کو نوشاد صاحب نے اپنے سنگیت سے آراستہ کیا تھا افسوس کہ یہ دونوں فلمیں اچھی اسٹار کاسٹ کے باوجود چل نہیں پائیں۔

گو کہ سنگیت کا بادشاہ آج ہم میں موجود نہیں ہے مگر جب تک سنگیت رہے گا نوشاد صاحب کا نام زندہ و تابندہ رہے گا۔اُنکے بے مثال اور لازوال گانے ہمیں ہمیشہ اُنکی یاد دلاتے رہیں گے۔وہ اپنے پیچھے گانوں کی صورت میں جو انمول خزانہ چھوڑ کر گئے ہیں۔یہ گانے اُنہیں ہر سنگیت پریمی کے دل میں زندہ رکھیں گے۔

رس رابطے

جستجو، ترتیب، تدوین

وقار جاوید

(راولپنڈی)

محترمی گلزار جاوید جی، السلام علیکم۔

یوں تو ''چہارسو'' کا ہر شمارہ اپنے مندرجات کے حوالے سے ادب کی دنیا میں ایک منفرد مقام پر کھڑا دکھائی دیتا ہے۔ خصوصاً جب ہر بار قرطاس اعزاز کے ذریعے دنیا کی کسی نہ کسی اہم شخصیت سے ملاقات کا شرف حاصل ہوتا ہے تو قاری کے ذہن میں چہارسو کی عظمت میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔

پچھلے شمارے میں آپ نے مجھ جیسے ایک ''نمانے'' سے ادیب کو چہارسو کے قرطاس اعزاز سے نوازا ہے اس کے لیے آپ کا بے حد ممنون ہوں۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ آپ نے مجھے جو عزت بخشی، جو توقیر دی اور جس قدر و منزلت سے مجھے سرفراز کیا اسے میں دنیا کا سب سے بڑا انعام سمجھتا ہوں۔ کیا ہوا کہ اگر تمغے بانٹنے والوں کی نگاہ مجھ پر نہیں پڑی نہ سہی لیکن آپ نے مجھے ادب کے جس سنگھاسن پر بٹھا دیا ہے وہاں سے مجھے تمغوں کی یہ بندر بانٹ ہیچ لگنے لگی ہے۔

حنیف باوا (جھنگ)

بھائی گلزار جاوید۔ سلام اور خلوص

آپ نے میری نظم 'جی بھی گئے' کو اپنے موقر جریدے میں جگہ دی۔ شکر گزار ہوں اور ان مہربانوں کا بھی جنہوں نے اس نظم کے لئے پسندیدگی کے لفظوں کی سوغات دی۔ اس سلسلے میں پروفیسر زہیر کنجاہی (راولپنڈی) فیصل عظیم (کینیڈا) شگفتہ نازلی (لاہور) کا تہہ دل سے ممنون احسان ہوں۔ گلزار جی آپ میری جانب سے بونی کے آصف ثاقب کو ڈھیر سارے پیار بھجوا دیں اور بھئی یہ پتہ کریں کہ ''بے گھری'' کی تفصیل کیا ہے، اللہ تعالیٰ ان کو عمر دراز، صحت اور گھر کا سکون عطا کرے آمین۔

عبداللہ جاوید (کینیڈا)

میرے گلزار، سلامت باشد۔

چہارسو بابت جولائی اگست باصرہ نواز ہوا۔ حنیف باوا جیسے درویش قلمکار کو قرطاس اعزاز پیش کر کے آپ نے بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ حنیف باوا صاحب ایک سلجھے ہوئے باشعور قلمکار ہیں جس کا ثبوت انہوں نے براہِ راست میں بھی فراہم کیا ہے اور اپنے افسانے ''باہر کا آدمی'' اور انشائیے ''پرتوئے خیال'' میں تو اُس پر مہرِ تصدیق لگا دی ہے۔ باوا صاحب کی گورمکھی زبان پر گرفت کا اندازہ اُن کا ترجمہ پڑھ کر ہوا اور جناب اُن کی پنجابی شاعری نے تو دل ہی موہ لیا اور سونے پر سہاگہ یہ کہ ابراہیم عدیل صاحب کی نظم ''باوا کے نام لکھنا'' خوب بلکہ بہت خوب ہے۔ باوا صاحب کو ڈھیروں مبارکباد اور آپ کے لیے بے شمار دعائیں۔

افسانوں میں نیلم احمد بشیر نے ''اللہ کی زمین'' جس نفاست، ہنرمندی اور جرأت سے تحریر کیا ہے اُس کے لیے اُنہیں بے پناہ مبارکباد۔ فرخندہ شمیم کا ''سجدہ سہو'' بھی اپنی جگہ خوب افسانہ ہے۔ نصرت بخاری کا ''صدر ضیا'' ڈاکٹر وقار کا ''پاگل'' اور انوار انجم کے ''افسانچے'' اچھے لگے۔ شاعری میں پروفیسر مظفر حنفی، پروفیسر خیال آفاقی کی غزلیں اور ندا فاضلی کی نظمیں بہت منفرد اور نئے انداز لیے ہوئے ہیں۔

ہمیشہ کی طرح اس بار بھی ڈاکٹر فیروز عالم نے قاری پر اپنی گرفت مضبوط رکھی اور کافی معلومات بھی فراہم کیں جو اپنے اندر دلچسپی کا بے پناہ سامان لیے ہوئے ہے۔ محترمہ سلمیٰ اعوان نے ''عراق جل رہا ہے'' لکھ کر آب دیدہ کر دیا اور دیپک کنول جی نے اشوک کمار صاحب سے تفصیلی ملاقات کرا کر ایک اور فریضہ سے خوبصورتی سے انجام دیا۔

یوگیندر بہل تشنہ (کینیڈا)

برادرم گلزار جاوید! محبتیں۔

چہارسو نظر نواز ہوا، شباب للت کی رحلت کا دکھ ہوا۔ وہ نہ صرف بڑے لکھاری بلکہ اردو کے مشاہیر مددگاروں میں سے تھے۔ اُن کے جانے سے اردو ادب ایک بڑے مددگار سے محروم ہو گیا ہے اور جناب خوشونت سنگھ کے حوالے سے زبیر رضوی کی تحریر اچھی لگی۔ خوشونت صاحب بھی باغ و بہار شخصیت کے مالک بڑے انسان تھے البتہ اس بار ڈاکٹر انور سدید کی کمی محسوس ہوئی اللہ تعالیٰ اُنہیں سلامت رکھے۔

اس دفعہ افسانے ہماری چاروں نامور لکھنے والی خواتین کے تھے اور بہت ہی اچھے تھے۔ آپ نے ''حسرتوں کا بوجھ'' مت ڈھویا کرو خوب نکالا ہے۔ مظفر حنفی، حسن عسکری کاظمی، تشنہ بریلوی اور سرور انبالوی صاحب کی غزلیں پسند آئیں۔ ڈاکٹر تقی عابدی صاحب نے مشاہیر کے حوالے سے بہت کام کیا ہے خصوصاً میر انیس، مرزا دبیر کے حوالے سے اُن کا کام بہت وقیع ہے اور ادب کے لیے اُن کی ذات شجرِ سایہ دار کی طرح ہے۔

کرامت بخاری (لاہور)

ہمیشہ رہنے والی پھلواری گویا گل زار جاوید، دعائے بادِ بہاری۔

چہارسو کا تازہ شمارہ ''جوں کا توں'' سحر کار ہے مگر اس میں حنیف باوا کی پنجابی خوشی سے دھومیں مچ گئیں وہی میر والی دھومیں، میں حنیف باوا کا ٹھہرا گرویدا باوا میں نے ''باوا باوا'' ہو کر اس خصوص کی تحریریں پڑھیں۔ باوا کی پنجابی

اور اردو تحریریں ایک سی ہیں۔ ان میں ایک سا لطف ہے اور مزہ۔ خوشی کی بات ہے کہ باوا کو دوست اچھے ملے ہیں۔ وہ ان میں شاد و آباد۔ رسالے کی کمپوزنگ کی صورتیں اور سمتیں خاصی دل افروز ہیں۔ تاہم کبھی کبھی ہاتھ جھٹک جاتا ہے۔ ''کس'' کسی ہو جاتا ہے ''کسی'' کس۔ یہ معمول کی بات ہے۔ چہارسو کی دل پذیری کے چرچے ''چہارسو'' ہیں۔ آپ نے اچھے اچھوں کی صحبتیں اٹھائی ہیں (ضمیر جعفری) جو فیض بھی حاصل کیا وہ خوب کیا۔ اچھی دوستی، رفاقت کے ثمرات حسنِ ترتیب سے مترشح ہیں۔ یہ سوچ کر دل کٹتا ہے کہ اب پہلے کی طرح رسالوں کے اکثر مدیر اہلِ نظر نہیں رہے شاعری کی سمجھ بوجھ تو ان کے بس کی بات نہیں۔ ''خواہ مخواہ'' کی تنقید پر بھی نظر نہیں رکھتے۔ کسی نے مشفق خواجہ سے پوچھا کیا خیال ہے ''فلاں صاحب'' اچھے سخن فہم ہیں۔ ان کی سخن فہمی کیسی ہے۔ خواجہ بولے سخن فہمی میں کیا جانوں ان کی غلط فہمی بھلی ہے۔ کئی میرے ایسے بزعمِ خود ناقد خط میں ''پسندیدہ'' شعر رقم کر کے Expose ہو جاتے ہیں۔ اصل میں تنظیمی رکھ رکھاؤ کا سلیقہ ایک چیز ہے پھر سخن فہمی کی قدر و قیمت بھی قرینے کی چیز ہے۔ رسالے میں غزلوں کا دوسرا حصہ ''مضبوط'' ہے۔ یعنی یہاں ''ربط و ضبط'' کے پیرائے دل خوش کن ہیں۔ اس حصہ کے شاعر مشہور و معروف ہیں۔ ان میں سے اکثر کو رسالے ٹائٹل پر سجاتے ہیں (تصویریں) میں ان کا پرانے وقتوں کا پڑھنے والا ہوں۔ ایک صدی کا قصہ۔ اشوک کمار نے دل کے تار چھو لیے۔ اشوک کمار ایک بہت بڑے اداکار تھے۔ انہوں نے اداکاری کا جو معیار قائم کیا وہ ان کے علاوہ اور کسی کے بس میں نہ تھا۔ میں نے اشوک کمار کی طرز اور ادائی کو سب سے مختلف دیکھا ہے۔ وہ دلیپ کمار، راج کپور اور دیو آنند سے ایک جداسٹائل رکھتے تھے اور منفرد تھے۔ بھارت بھوشن کی معصومیت خاصے کی چیز ہے۔ بیجو باورا میں بھارت بھوشن نے اداکاری کا ایک ایسا سکول پیش کیا تھا جو بعد میں اپنا فنِ اختصاص کسی کے حوالے نہ کر سکا تھا۔ وہ ایک ہی مقام پر جوں کا توں ہے۔ افسانوں میں نسوانیت کی لہریں کس سمت نکلی جاتی ہیں یہ کھوجنا پڑے گا۔ بہرنوع ہماری افسانہ نگاروں نے قلم کی آبرو رکھ لی ہے۔

آصف ثاقب (بوئی، ہزارہ)

جناب گلزار جاوید مدیر ''چہارسو'' سلام

جولائی اگست چہارسو کی ہارڈ کاپی ملی۔ ہم اس کو عید کی سوغات سمجھیں گے۔ شکریہ۔ اللہ تعالیٰ پنڈی کو اور آپ سب کو اپنی پناہ میں رکھے آمین۔ حنیف باباا پنی تصویر میں غرقِ فکر ہیں۔ پارچہ بافی کس طرح زمینی کھڈی سے، دستی کھڈی اور پھر برقی کھڈی میں بدلی اس کا بیان اچھا لگا۔ گاندھی جی نے چرخے کو سیاسی مزاحمتی رنگ دیا وہ زیریں لہر کے طور پر اوپر آ ہی گیا۔ آپ نے براہِ راست میں قابلِ گرفت نکات میں مروت سے کام نہیں لیا یہ اچھی بات ہے اور منافقت کے مقابلے میں بہتر بھی۔

ان خواتین و حضرات کی شکر گزار ہوں جن کو میرا افسانہ ''ایسا بھی ہو تا ہے'' پسند آیا اور اپنی پسند کو رس رابطے تک پہنچایا۔ ڈاکٹر سید سعید نقوی (نیو یارک) انتظار باقی (جھنگ) محمد طارق علی (راولپنڈی) احسان مجید (اٹک) نجیب عمر (کراچی) ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی (کراچی) کی بطورِ خاص شکر گزار ہوں اور آپ کی بھی کہ آپ نے میرے مذکورہ افسانے کو سپردِ ''چہارسو'' کیا۔

شہناز خانم عابدی (کینیڈا)

پیارے بھائی جان، آداب۔

جولائی اگست ۲۰۱۴ء کا شمارہ ہمدست ہو کر نظر نواز ہوا۔ حنیف باوا صاحب کی تحریریں تو مدت سے ہم بڑے اشتیاق کے ساتھ پڑھتے آ رہے ہیں لیکن براہ راست اور ان سے متعلق دوسرے مضامین کے ذریعے ان کی ادبی شخصیت کے کئی نئے گوشے وا ہوئے ہیں جو آپ کے کمال کا مظہر ہے۔ دیوندر ستیارتھی (آنجہانی) کے ''انتیس مئی کو سلام'' کا ان کا اردو ترجمہ بے حد دلچسپ اور معلوماتی ہے۔ افسانوں میں عذرا اصغر، نیلم احمد بشیر، نصرت بخاری صاحبان اور شعری حصّے میں حضرات مظہر حنفی، سرور انبالوی، محمود الحسن، حسن عسکری کاظمی، صفوت علی صفوت، کرامت بخاری، ظریف احسن، شگفتہ نازلی، زاہدہ عابد حنا، منظور ثاقب، تصور اقبال، نوید سروش، سمیع نوید اور معصوم شرقی کے کلام نے متاثر کیا۔ آخر الذکر شاعر کی غزل کے ایک شاعر سے آنجہانی جناب گوپال متّل کا یہ شعر بے ساختہ ذہن میں ابھر آیا:

مجھے زندگی کی دعا دینے والے
ہنسی آ رہی ہے تری سادگی پر

برادرم ڈاکٹر شباب کی وفاتِ حسرت آیات پر کرشن نندہ صاحب کا خراج عقیدت برحق ہے۔ شباب صاحب واقعی ایک نیک نفیس انسان اور اعلیٰ مرتبت قلم کار تھے لیکن کیا کیا جائے:

جو بادہ کش تھے پُرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں

''ہوا کے دوش پر'' اور ''ایک صدی کا قصہ'' کی قدر و قیمت اور افادیت برقرار ہے۔ اشوک کمار کے بارے میں اس بار نہایت تفصیل کے ساتھ بہت سے ایسے حقائق درج کیے گئے ہیں جو بیشتر قارئین کے لیے نئے ہوں گے۔ ہاں دیپک کنول صاحب نے ابھی تک کئی اداکاروں اور فلم سازوں کے بارے میں ہمیں روشناس کروایا ہے کیا ہی اچھا ہو اگر وہ اپنے کالم میں فلمی شاعروں، گلوکاروں اور موسیقاروں سے متعلق ایسی تفصیلات قلم بند کریں گو آج کل فلمی شاعری اور موسیقی کا معیار بہت پست ہو گیا ہے لیکن پچھلی صدی کے بے شمار شاعر، گلوکار اور موسیقار ایسے ہیں جن کے بارے میں چہارسو کے قارئین یقیناً تفصیل کے ساتھ جاننا چاہیں گے۔ مزید ڈاکٹر فیروز عالم اور دیپک کنول جی سے استدعا ہے کہ وہ اپنی تحریروں کو بعد میں کتابی صورت میں بھی ضرور شائع کریں۔

مہندر پرتاپ چاند (انبالہ، بھارت)

''چہارسُو''

محترمی گلزار جاوید صاحب، سلام مسنون۔

پچھلے پانچ ماہ میں امریکہ اور کناڈا میں رہا۔ وہاں سے واپسی پر خطوط، کتابوں اور رسالوں کا بڑا ذخیرہ جمع ہے۔ جس میں ''چہارسو'' کے شمارے بھی موجود ہیں۔ ان سب کو دھیرے دھیرے پڑھ رہا ہوں اور محبتوں کا قرض اتار رہا ہوں۔ ابھی آپ کو خط لکھنے بیٹھا تو جولائی اگست کا تازہ شمارہ بھی آ گیا۔ آپ نے قرطاس اعزاز کا جو منفرد سلسلہ شروع کر رکھا ہے اس کی وجہ سے چہارسو کا ہر شمارہ خاص نمبر ہوتا ہے۔

بھائی! بات یہ ہے کہ پی آر کے اس زمانے میں اہلیت اور فعالیت کو کون پوچھتا ہے۔ اسی سلسلے میں میرا ایک شعر بھی ہے کہ:

نہ اہلیت سے، نہ انساں کے تجربات سے ہے
یہاں عروج و ترقی تعلقات سے ہے

اب آپ یہ دیکھئے کہ لکھنؤ اور علی گڑھ نے ادب کا جو ذوق دیا تھا اسی کی وجہ سے منسٹری آف ڈیفنس کے شعبے میں جنرل منیجر کے عہدے سے ریٹائر ہونے کے بعد ایم۔ اے اور پی۔ ایچ۔ ڈی کیا اور بڑی محنت سے تین درجن کتابوں کو تصنیف/تالیف کیا۔ اردو انٹرنیشنل (کراچی) اور خیال (کراچی) کا مدیر رہا۔ کئی ادبی اداروں کا سیکرٹری رہا اور ہنوز یہ سلسلہ جاری ہے۔ بہت سی تنظیموں نے خدمات کا اعتراف کیا۔ ایم۔ اے اور ایم فل کے مقالے تحریر ہوئے مگر حکومت نے ابھی تک کسی اعزاز کے لائق نہیں سمجھا۔ مگر جو خوشی ادب کے قارئین اور محبان ادب کے قرطاس اعزاز نشانِ سپاس اور اعتراف کمال سے حاصل ہوتی ہے اس کی اور ہی بات ہے۔

جمال نقوی (کراچی)

پیارے بھائی گلزار جاوید صاحب، تسلیمات۔

''چہارسو'' بڑے اچھے موقع پر آیا۔ روزے میں کوئی کام تو ہوتا نہیں چلو ''چہارسو'' میں ہی دل بہلائیں۔ سب سے پہلے اپنی عادت کے خلاف حنیف باوا کو پڑھا۔ ابراہیم عدیل نے حنیف باوا کے لیے اچھی نظم لکھی ہے۔ آپ نے اس دفعہ ''براہِ راست'' شروع ہی میں لگا دیا۔ خوب مزا رہا۔ سوال بھی اچھے ہیں اور جواب بھی اچھے ہیں۔ حنیف باوا کے بارے میں بعض حضرات نے بڑے اچھے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ سب نے طرفداری ہی کی ہے کسی نے یہ نہیں بتایا کہ حنیف باوا میں یہ کمزوری بھی ہے۔ بانو قدسیہ لکھتی ہیں کہ ''حنیف باوا افسانے کا بڑا نام ہے'' میرے نزدیک تو حنیف باوا کا افسانہ ''باہر کا آدمی'' کوئی نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوا۔ محض ایک واقعہ ہے جسے بیان کر دیا گیا ہے۔ تاہم جناب شفقت تنویر مرزا نے حنیف باوا کو ایک اچھا افسانہ نگار تسلیم کیا ہے لہٰذا مجھے بھی اس میں کوئی شک نہیں۔ حنیف باوا نے پنجابی میں آزاد نظمیں اچھی لکھی ہیں۔

آیئے اب رسالہ کی طرف سب سے پہلے حسبِ عادت ''رس رابطے'' پڑھے اس دفعہ رس رابطے سے کچھ نہیں ملا۔ اگرچہ میں خود بھی شامل ہوں۔ ایک بات ضرور دیکھی کہ نوید سروش نے میری غزل میں سماجی و سیاسی افراتفری کا نوحہ محسوس کیا۔ پھر ایک شعر بھی پسند کیا:

طویل مدت گزر گئی ہے
اُداس کتنی ہے پاک دھرتی

شعر اور غزل پسند کرنے کا شکریہ:

حمد اور نعت دونوں دل کو بھاتی ہیں۔ مظفر حنفی صاحب فرماتے ہیں کہ ہندوستان (بھارت) میں غزل کی گونج ہے مگر کہیں سنائی نہیں دیتی ہاں اُس ہندوستان میں غزل کی واقعی گونج تھی جب ہندوستان انگریزوں کے پاس تھا اور دہلی میں درد، غالب، مومن اور ذوق غزل کا نعرہ بلند کر رہے تھے۔ سرور انبالوی، غالب عرفان اور تصور اقبال کی غزل اچھے اشعار کا مجموعہ ہے۔ افسانوں میں پہلے تین افسانے ہی اچھے لگے۔ ''پریت نہ جانے کوئے'' ''اندھے چاند کی صدا'' اور ''اللہ کی زمین''۔ تینوں کا موضوع ایک ہی ہے ''دہشت گرد'' مگر اندازِ بیاں مختلف ہے۔ میرے نزدیک ان کی ترتیب یوں ہے۔ ''اللہ کی زمین'' نیلم احمد بشیر اوّل، ''پریت نہ جانے کوئے'' دوم، عذرا اصغر اور ''اندھے چاند کی صدا'' رخسانہ صولت سوم۔

پروفیسر زہیر کنجاہی (راولپنڈی)

برادرم گلزار ہی گلزار

سلام مسنون۔ پچھلا شمارہ نہیں ملا تھا، نیٹ پر دیکھا مگر میں کوئی بھی رسالہ نیٹ پر پڑھ نہیں سکتا چنانچہ انتظار کرتا رہا کہ چند دن بعد مل ہی جائے گا، مگر اب جب جولائی اگست کا شمارہ موصول ہوا تو سمجھ گیا کہ اس سے پہلے کا شمارہ کہیں غائب ہو گیا ہے اور یوں بہت سی چیزیں جو ایک تسلسل سے پڑھنے کا لطف آتا ہے ادھوری رہ جائیں گی۔ خیر، اگر اب بھی ممکن ہو تو ازراہِ کرم اس کی ایک کاپی ارسال فرما دیں۔

مجھے آپ کے پاس حاضری دینی تھی مگر کچھ طبیعت کی خرابی، کچھ ڈرائیونگ میں مشکلات پیش آنے اور پھر مری روڈ کے 'میٹرو زدہ' ہونے کی وجہ سے صدر یا ویسٹرج کی جانب آنا بھی خیال است و محال است و جنوں کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ ابھی ابھی میرا حمدیہ و نعتیہ مجموعہ شائع ہوا ہے وہ بھی آپ کی خدمت میں بذریعہ کوریئر روانہ کر رہا ہوں کیونکہ 'ترے گھر کے راستے میں کوئی کہکشاں نہیں ہے' اور مَیں انہی پتھروں پر چل کر اور کھائیوں میں اتر کر نہیں آ سکتا جو راولپنڈی کی نوے فیصد سڑکوں پر دامِ ہمرنگِ زمیں کی طرح پھیلی ہوئی ہیں۔

تازہ شمارے میں آپ نے حنیف باوا کے نام قرطاسِ اعزاز شائع کر کے ایک بہت بڑا کام کیا ہے۔ حنیف باوا ایک بہت بڑی شخصیت ہیں مگر ان تمام ہتھکنڈوں سے ناواقف ہیں جن کے ذریعے آج کل کوئی بڑا آدمی اور نامور ادیب بن سکتا ہے، ایسے آدمیوں کی تلاش اور ان کی طویل ادبی خدمات کا

اعتراف بیحد ضروری ہے۔آپ کو سلام پیش کرتا ہوں۔ان کے بارے میں شائع ہونے والے پانچ چھ مضامین میں سے چار تو انہی کے شہر جھنگ کے لکھنے والوں کے تحریر کردہ ہیں جو میرے اس شکوے کا ثبوت دیتا ہے کہ حنیف باوا بڑے ادیب ہونے کے باوجود معروف نقادوں کی نظر سے اوجھل ہیں۔جناب غلام شبیر اسد کا مضمون بھی تمہیدِ طولانی کا شکار ہو گیا ہے، بہتر ہوتا کہ اس کا زیادہ حصہ حنیف باوا کے فن وشخصیت پر مرکوز ہوتا۔

ابھی زیادہ افسانے نہیں پڑھ سکا۔(رمضان میں مطالعے کا وقت ہی بہت کم ملتا ہے)، تاہم فرخندہ شمیم کا افسانہ ''سجدۂ سہو'' پڑھا اور ان کے عمومی لہجے اور اسلوب سے یکسر ہٹ کر لکھا ہوا یہ افسانہ مجھے بہت پسند آیا۔جنس کے موضوع پر اس عمدہ ڈھکے چھپے انداز اور صاف ستھرے الفاظ میں افسانہ لکھنا اور آخر میں قاری کو چونکا دینا واقعی ایک مشّاق افسانہ نگارہ کا کمال ہے۔جناب احمد زین الدین کا کراچی کے حالات کے حوالے سے لکھا ہوا افسانہ ہمارے ملک کی تیزی سے بگڑتی ہوئی صورتِ حالات میں پورے ملک کا افسانہ بن گیا ہے۔

رس رابطوں میں جناب امجد حسین نے اپنے خط میں لکھا ہے کہ انگریزی اردو ڈکشنری میں لفظ archetype موجود نہیں ہے، مجھے اس پر حیرت ہوئی اور میں نے اپنے پاس موجود کچھ ڈکشنریوں میں چیک کیا تو مجھے یہ لفظ مل گیا ہے اور اس کا ترجمہ بھی۔اس کے معنی ہیں: 'نقش اول، پہلی بناوٹ، وہ پہلا نمونہ جس کے مطابق کوئی چیز بعد میں بنائی جائے یا جس کے وہ مطابق ہو' (حوالہ: قومی انگریزی اردو لغت۔مرتب: ڈاکٹر جمیل جالبی۔۱۹۹۴ء ایڈیشن، صفحہ نمبر ۱۰۱)۔

نسیمِ سحر (راولپنڈی)

جناب گل زار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

چہارسو کی ایک انفرادیت یہ ہے کہ اس کے تمام شمارے انٹرنٹ پر دستیاب ہیں۔ہزاروں لوگ ان کو ڈاؤن لوڈ کرتے ہیں۔اس کی یہی خصوصیت اسے دوسروں سے ممتاز کرتی ہے۔مجھے اس حوالے سے یہ خوش فہمی رہتی ہے کہ میں دنیا کے ہر اس ملک میں ہمہ وقت پڑھا جاتا ہوں، جہاں اردو زبان وادب سے لگاؤ رکھنے والا ایک آدمی بھی موجود ہے۔ہم اہلِ قلم کی ذمہ داری یہ ہے کہ ہم اپنی بہترین تخلیقات سے اس کو ثروت مند کرتے جائیں۔

حنیف باوا میری جانی پہچانی شخصیت ہیں۔مجھے ان کی بے باکی بھلی لگتی ہے۔آپ نے ان کے متعلق اتنا سارا مواد یک جا کر دیا۔اس کے وہ حق دار تھے لیکن انھیں آپ کا ممنون بھی ہونا چاہیے۔نیلم احمد بشیر کا افسانہ ''اللہ کی زمین'' اہلِ دل کے لیے مقامِ فکر اور دین کے نام نہاد ٹھیکے داروں کے منہ پر طمانچہ ہے۔یہ افسانہ اس بات کی دلیل ہے کہ ہمارا قلم قبیلہ اپنا کردار خوب ادا کر رہا ہے۔انور انجم کے افسانچے کاغذ کالا کرنے کے مترادف ہے۔اس قسم کی کوشش ڈاکٹر فہیم اعظمی کے رسالے صریر میں بھی کی گئی تھی؛ جو پذیرائی سے محروم رہی۔جو لوگ شعر نہیں کہہ سکتے تھے انھوں نے نثری نظم کا سہارا لیا؛ جسے محققین (خود جن کے لیے شاعری بھاری پتھر ہے) نے بڑھ کر تھام لیا؛ اور شاعر کہلانے لگے: افسانچوں کو بھی میں نثری نظم کے زمرے میں رکھتا ہوں۔ڈاکٹر معصوم شرقی، حسن عسکری کاظمی، پروفیسر خیال آفاقی، شگفتہ نازلی، زاہدہ عابد نے بہت اچھی غزلیں پڑھنے کو دیں، فیروز عالم (ہوا کے دوش پر) اور سلمیٰ اعوان (عراق جل رہا ہے) ایسی خوب صورت تحریریں ہیں جو اختتام سے پہلے پہلو بھی نہیں بدلنے دیتیں۔یوگیندر بہل تشنہ کی ''کتاب زندگی'' ان کی روح پر لگے زخم ہیں؛ اسی لیے پر اثر ہے۔''خوش ونت کی کالم نویسی'' کی مزے داری کو زبیر رضوی کے اسلوب نے دوچند کر دیا۔

جو لوگ بغیر پڑھے تبصرہ کرتے ہیں، وہ اپنے جملوں سے پہچانے جاتے ہیں مثلاً: تمام افسانے بہت اچھے ہیں، بہت اچھی شاعری پڑھنے کو ملی، مضامین بہت معلوماتی ہیں وغیرہ۔ہونا تو یہ چاہیے کہ ایسے خطوط شائع نہ ہوں لیکن ان کے شائع ہونے سے یہ معلوم ہو جاتا کہ کس کس نے رسالہ نہیں پڑھا۔معین قریشی سینئر آدمی ہیں ؛میں ان کا نیاز مند ہوں۔خاک کو آسماں سے کیا نسبت۔

سید نصرت بخاری (اٹک)

مکرمی گلزار جاوید، سلام مسنون۔

جولائی۔اگست ۲۰۱۴ء کا ''چہارسو'' اپنی مخصوص دل ربائی کے ساتھ نظر نواز ہوا۔اس مرتبہ قرطاس اعزاز کا قرعہ حنیف باوا کے نام تھا۔اس میں فنکار کے شخصی اور فنی خدوخال نظر آئے۔جبکہ براہ راست میں ان کے جیتے جاگتے پورے وجود سے ملاقات ہوئی۔ایک سوال کے جواب میں حنیف باوا کا تیقّن پوری طرح پر کھولے نظر آیا ''پنجابی زبان کے مستقبل کو کوئی خطرہ نہیں۔۔۔جب تک پنجابی میں لکھنے والوں کے ہاتھ میں قلم رہے گا، پنجابی زبان زندہ رہے گی''

حقیقت یہ ہے کہ حنیف باوا ایک ایسا فنکار ہے جو بہت کچھ کہہ کر بھی اور بہت کچھ کہنا چاہتا ہے۔ان کی کہانیاں محض الفاظ کا مجموعہ نہیں ہوتیں بلکہ وہ براہ راست قاری سے مخاطب ہوتی ہیں۔محمود شام کی یہ رائے بہت صائب ہے کہ وہ دہشت گردی اور غیر ملکی مداخلت کی بہ دولت ہمارے سماج میں در آئے ''جدید ترین غم دوراں کو بھی نظر انداز نہیں کرتے'' (اُن کی) ''بہت پُر تاثیر کہانیاں ہیں۔۔۔معاشرے میں تاریکی کے دیوتاؤں کو بھی وہ بے نقاب کرنے میں نہیں چوکتے''۔حنیف باوا نے تازہ پرچے میں اپنی ترجمہ کاری کا ہُنر بھی خوب خوب دکھایا ہے۔انہوں نے دیوندر ستیارتھی کی گورمکھی تصنیف ''انتیس مئی کو سلام'' کو اتنی پُرکاری سے اردو میں ڈھالا کہ زبان پر اُس کی حلاوت ابھی تک محسوس ہو رہی ہے۔حنیف باوا واقعی اردو ادب کا ایک قیمتی سرمایہ ہیں۔

عذرا اصغر کی کہانی ''پریت نہ جانے کوئے'' نئی جوانی کے چلبلے سے لمحوں میں چلنے والی داستان ہے، چند منٹوں کے لشکارے والی لیکن اپنی جگہ مکمل جبکہ رخسانہ صولت کے افسانے ''اندھے چاند کی صدا'' میں ایک باشعور لڑکی

ذات کے کتھارسس کے گرداب میں بری طرح پھنسی دکھائی دیتی ہے اس طرح کہ وہ بے سمت ہو چکی ہے۔ وہ خود مانتی ہے کہ ''مشرق مغرب اور شمال جنوب کی ساری سمتیں ایک جگہ سمٹی نظر آتی ہیں''۔ فرخندہ شمیم کی کہانی ''سجدہ سہو'' ایک Off Beat موضوع پر مبنی ہے لیکن پھر بھی ایسی پُر غضب کہ پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ اسی طرح انسان کے جسم کے اندر کہیں دُور کلبلاتے وحشی جذبے جب اُمڈ گھمڈ کر باہر آتے ہیں تو کہانی بنتی ہے ''چکر''۔ جسے احمد ذین الدین کے قلم نے بہت پرکاری سے چلایا ہے۔ اُن کے لیے ڈھیروں داد۔

محمد طارق علی (راولپنڈی)

مدیر محترم، سلام ورحمت۔

بہت شکریہ بہت کرم اس مرتبہ نیلگوں سرورق کے ساتھ محترم حنیف باوا کو اُن کی تمام تر تخلیقی جہات کے ساتھ ''قرطاس اعزاز'' سے نوازا گیا۔ براہِ راست میں ہر طرح کے ملائم و ناملائم سوالات کے جوابات نہایت متحمل مزاجی و فراخدلی سے اپنے نکتہ نظر کو پیش نظر رکھتے ہوئے دیے گئے باوا کے نام لکھنا عمدہ خراجِ تحسین ہے۔ ''سکھ دی نیندر'' پنجابی کلام بہت اچھا انتخاب ہے۔ ''پرانی صحبتوں کی یادیں ہیں'' حقیقت پسند کہانی کار کا اعتراف وہ اور میں کا موازنہ ہے یا افسانوی ادب میں باواجی کا تعین باہر کے آدمی تک رسائی ہے یا ہمدردانہ حقیقت نگاری کا تجزیہ، تنہائیوں کے درمیاں ہے یا دائروں سے باہر، ہر طرز نگارش میں اُن کی مختلف نثری وشعری جہات کا احاطہ وادراک فنی شخصیت کے پس منظر و پیش منظر کے ساتھ بکمال حسن وخوبی کیا گیا ہے۔ پرتو خیال، انتیس مئی کو سلام اور باہر کا آدمی انشائیے، ترجمے اور کہانی کے لیے اخلاص فن کے ساتھ وابستگی قلم وقرطاس کے بہت روشن اظہار بھی ہیں ویسے کبھی کبھی اندر کا آدمی ہی ہماری بے خبری میں باہر کے آدمی کا روپ دھار لیتا ہے۔

محبت کے مظاہر میں جوگندر پال جی اور انجم نیازی صاحب کے مخلصانہ تاثرات بالخصوص پسند آئے اور قارئین اُن کے مستقبل کے تخلیقی کارناموں سے ہمیشہ کی طرح شاندار توقعات وابستہ کیے ہوئے ہیں۔

انشا جی کی جھوٹی باتیں بھی سچی لگیں۔ اگرچہ ظفر تو کہہ گئے ''ان مسرتوں کو کہد و کہیں اور جا بسیں'' اس پر حسرتوں کا بوجھ تو اور حوصلہ طلب ہوا تاہم کرامت بخاری صاحب کو اعزازِ سخن مبارک ہو۔ خوشونت سنگھ صاحب کا نشاطیہ کلچر کے سیاق وسباق میں مطالعہ اچھا لگا زمیں کھا گئی۔۔۔ سے ڈاکٹر شباب للت کے انتقال کا علم ہوا حقیقتاً ان کی تحریروں کے حوالے سے جو دیکھا پڑھا اور جانا ہے وہ بلاشبہ ان کی فنی عظمت کا بیّن ثبوت ہے اور حوصلہ افزائی ادبی راستوں کو دُور تک اجالنے کے مترادف ہے، ان رخصت ہونے والوں میں کئی ایک ایسے ہیں جنہیں ادارہ چہارسو نے قرطاس اعزاز سے سرفراز کیا اور بہت شاد کام کیا۔۔۔

مدیر چہارسو گلزار جاوید صاحب کے لیے تہنیتی نظم بہت عمدہ قلمبند ہوئی ہے جس میں جملہ ادارتی محاسن اور شخصی اوصاف منظوم ہو گئے ہیں دراصل تعریف چہارسو کی ہو یا مدیر محترم کی خالق میں تخلیق اور تخلیق میں خالق کا پرتو تو برابر جھلکتا ہی رہتا ہے۔ کبھی ایسا بھی کی آخری لائن تھی ''ردائے روشنی جس طرح کہ ہو پھیلتی جاتی'' ''ہو'' کی جگہ ''وہ'' کمپوز ہونے سے مفہوم وتاثر دونوں تبدیل ہو گئے۔

شگفتہ نازلی (لاہور)

مکرمی ومحترمی جناب گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

یوں تو چہارسو ہر مرتبہ نئی آب وتاب لیے جلوہ ریز ہوتا ہے لیکن اس بار تو بات ہی کچھ اور ہے ٹائٹل پر ہمارے بہت ہی خوبصورت دوست اور معروف افسانہ نگار محترم حنیف باوا کی تصویر دل میں اتر گئی قرطاس اعزاز اُن کے نام کر کے آپ نے یہ ثابت کر دیا کہ آپ خلوص دل سے ادب کی خدمت کر رہے ہیں اور چُن چُن کے ایسے اہل قلم کار سامنے لاتے ہیں جن کا کام واقعی اس قابل ہے کہ انہیں اعزاز سے نوازا جائے۔ حنیف باوا پر احباب نے بہت اچھے مضامین تحریر کیے۔ محمود شام، مصطفیٰ کریم، ناصر عباس نیّر اور غلام شبیر اسد کا مضمون قابلِ داد ہے۔ براہِ راست میں کئے گئے سوالات اور جوابات معلومات افزا ہیں۔ چہارسو کے دیگر سلسلے بھی کچھ کم اہمیت کے حامل نہیں میں آپ کو اتنا خوبصورت اور معیاری پرچہ شائع کرنے پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

ابراہیم عدیل (جھنگ)

محترم گلزار جاوید، السلام علیکم۔

''چہارسو'' برائے جولائی، اگست ۲۰۱۴ء موصول ہوا، ممنون ہوں۔

قرطاس اعزاز حنیف باوا کے نام کر کے آپ نے میری دلی خواہش پوری کی۔ حنیف باوا اُردو افسانے کے سمندر میں وہ سچا موتی ہے جسے اپنی قیمت کا اندازہ نہیں۔ افسانوں میں عذرا اصغر ''پریت نہ جانے کوئے'' پڑھا۔ اس افسانے میں عذرا اصغر نے ماحول اور کہانی کو اہمیت دی، افسانہ قاری کی گرفت بھی کرتا ہے لیکن اختتام دھندلا سا گیا ہے۔ نیلم احمد بشیر نے ''اللہ کی زمین'' لکھ کر خودکش بمبار تیار کرنے والے نام نہاد مولویوں کے چہروں سے نقاب نوچا ہے۔ اس موضوع پر لکھا جا چکا ہے اور لکھا جا رہا ہے اس لیے یکسانیت کا احساس ہوتا ہے۔

جناب احمد ذین الدین نے ایسا ''چکر'' لکھا کہ پڑھتے ہوئے مجھ جیسا قاری لطف اندوز ضرور ہوا ہے، آپ معروف افسانہ نگار ہیں یوں کہانی کو فریم کے اندر کلائمیکس تک لانا آپ کے لیے کارِ دشوار نہیں ہے۔ اگرچہ دورانِ مطالعہ میں کہیں کہیں بھٹک جاتا رہا لیکن میں اسے اپنی علمی کم مائیگی پر محمول کروں گا۔ آپ صرف افسانہ نگار ہی نہیں بلکہ کراچی سے شائع ہونے والے معروف رسالہ سہ ماہی ''روشنائی'' کے مدیر بھی ہیں۔

نصرت بخاری نے بہت دنوں بعد ''صدرضیا'' سے ملاقات کرائی۔ درونِ افسانہ بخاری نے خاتون کردار سے وہ کچھ کہلوا دیا جو عام حالات میں بھی لوگ کہنے سے گریزاں رہتے ہیں، افسانے کا اختتام قاری کو مزاح کے انداز میں

چونکاتا ہے یہی ایک اچھے افسانے کی خوبی ہوتی ہے۔

احسان بن مجید (اٹک)

محترمی ومکرمی گلزار جاوید صاحب، سلام مسنون۔

ہمیشہ کی طرح گذشتہ ہفتے وقار وتمکنت کے ساتھ ایک خلوص و شفقت ومحبت کے دامن میں سموئے ''چہارسُو'' موصول ہوگیا۔ پھر سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اس کا مطالعہ ہی واجب ٹھہرا۔ سرورق پر حنیف باوا کی تصویر دیکھ کر دل بلیوں اچھلا۔ جی چاہا کہ آپ کے ہاتھ چوم لوں۔ بلآخر قرطاس اعزاز اس درویش صفت لکھاری کو نصیب ہوا، اردو ادب میں جس کا بہت بڑا حصہ ہے۔ جس طرح آپ نے ان کا مقام بلند کیا اللہ تعالیٰ آپ کے درجات میں بھی سرفرازی عطا فرمائے (آمین)۔ جن قلمکاروں نے ان پر اپنے تاثرات قلمبند کیے یوں لگا جیسے وہ حنیف باوا کو رنگ برنگے معطر پھولوں کے ہار پہنا کر ان کو خراج عقیدت پیش کررہے ہیں۔ ان کا انٹرویو پڑھ کر ان کی شخصیت کے بہت سے مخفی پہلو واضح ہوئے۔ ناصر عباس نیّر نے ان کے فن پر سیر حاصل گفتگو کی۔ دیگر مضامین بھی ان کا کام اور بہ لحاظ انسان ان کی خوبیوں کی وضاحت کرتے دکھائی پڑتے ہیں۔ عذرا اصغر صاحبہ کا افسانہ ''پریت نہ جانے کوئے'' بہت اچھا لگا۔ لیکن وقار مسعود خان کا افسانہ ''پاگل'' بڑی عمدہ کہانی ہے۔ ڈاکٹر تقی عابدی ''منظر نگاری کا حاصل'' اور زبیر رضوی کا ''خشونت سنگھ اور نشاطیہ کلچر'' بہت دلچسپ معلومات افزا ہیں۔

نیّر اقبال علوی (لاہور)

محترم گلزار جاوید، السلام علیکم۔

اس بار قرطاسِ اعزاز معروف افسانہ نگار وشاعر ''حنیف باوا'' کو پیش کیا گیا ہے اور یہ ان کا حق تھا۔ حنیف باوا کو میں بہت عرصے سے پڑھ رہا ہوں اُن کی کہانیوں کی بڑی خوبی ''سادگی'' ہے۔ میں نے اُن کی دو پنجابی کہانیوں کے ترجمے بھی کیے ہیں۔ ''براہِ راست'' میں انہوں نے بڑی سادگی سے جوابات دیے جو اچھے لگے۔ محمود شام نے اپنے مختصر مضمون میں حنیف باوا کے ساتھ گزرے وقت اور اُن کی کہانیوں میں زندگی کے سماجی رویوں کو تلاش کیا ہے۔ انتظار باقی نے انہیں حقیقت پسند افسانہ نگار قرار دیا جو کہ درست ہے۔ مصطفیٰ کریم نے ان کے افسانے ''وہ اور میں'' کا تجزیہ بڑی نزاکت اور ہنر مندی سے کیا ہے۔ عامر عبداللہ اور پروین طارق کی تحریریں حنیف باوا کے فن کو سمجھنے میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔ فاری شانے باوا صاحب کی پنجابی نظموں کا انتخاب کمال کا کیا ہے ان کی نظمیں پہلی بار مطالعہ میں آئی ہیں جنہوں نے متاثر کیا۔ حنیف باوا کی تخلیقات کا انتخاب بھی محنت سے کیا گیا ہے۔ اتنا بھرپور گوشہ مرتب کرنے پر جہاں گلزار جاوید صاحب مبارکباد کے مستحق ہیں وہاں حنیف باوا کے لیے بھی یہ قرطاس کسی بڑے اعزاز سے کم نہیں۔

ڈاکٹر معصوم شرقی، غالب عرفان، مہندر پرتاپ چاند، پروفیسر خیال آفاقی اور پروفیسر زہیر کنجاہی کی غزلوں کے اشعار میں لفظیات کی نشست اور قافیے ردیف کو اس انداز سے برتا ہے جس سے ایک نیا پن اور تازگی محسوس ہو رہی ہے۔ تشنہ بریلوی کی غزل عشقیہ شاعری میں اچھا اضافہ ہے۔ کرامت بخاری، شاہین زیدی، ڈاکٹر انیس الرحمان، نورزمان ناوک، جہانگیر اشرف، احمد ظہور، انجم جاوید اور اسد اعوان کی غزلوں میں شعری نزاکتیں بھی اور بیان کی سادگی بھی۔ مظفر حنفی کا یہ شعر غزل کی حمایت میں اچھا لگا:

کئی صدیوں سے کس کی گونج ہے ہندوستان بھر میں
سُنا تم نے، غزل کے دشمنو! طنّاز نقّادو!

نیلم احمد بشیر کا افسانہ ''اللہ کی زمین'' خودکش حملہ آوروں کی تربیت گاہ (کمین گاہ) اُن کے روز وشب اور اُن کے طریقہ واردات کی حقیقت کی نظر سے ترجمانی کی ہے۔ ''پھول توڑنے'' اور ''جوں مارنے والے'' واقعات اور دوسری جانب گردن کا ٹکرا اُس سے فٹ بال کھیلنے کا عمل نئی نسل کو بھڑکانے اور اپنے مطلب کے گھناؤنے مقاصد کے حصول کی تدابیر ہیں۔ نصرت بخاری کا افسانہ ''صدر ضیا'' افسانے سے زیادہ افسانچے کے قریب ہے۔ اس تحریر میں ایک سیاسی جماعت کی حمایت اور صدر ضیا مرحوم کی ناقص کارکردگی کو پیش کیا ہے کچھ غیر حقیقی سا ہے۔ رخسانہ صولت سلیمی کا افسانہ ''اندھے چاند کی صدا'' اور فرخندہ شمیم کا افسانہ ''سجدہ سہو'' اپنے موضوع، پیش کش اور اسلوب کے اعتبار سے متاثر کن ہے۔

خطوط کے بعد ڈاکٹر فیروز عالم کی داستانِ حیات ''ہوا کے دوش پر'' کا مطالعہ ہمیشہ کی طرح اطمینان کا باعث رہا۔ میرا خیال ہے کہ اس آپ بیتی کو تقریباً چار سال سے چہارسو کے قارئین کی توجہ اور پسندیدگی کا درجہ حاصل ہے۔ میں ڈاکٹر صاحب کی یادداشت اور مستقل مزاجی کی داد دیتا ہوں۔ موجودہ قسط میں ڈاکٹر صاحب نے عملی زندگی کے ابتدائی ایام کو حقیقت کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ کراچی میں قیام، ملازمت کا پہلا دن، خالہ جان کی زندگی کے مشکل دن، اُن کے گھر کا اپنائیت سے پُر ماحول اور ڈاکٹر چیپ کی اپنے کام سے لگن والی بامقصد شخصیت دلچسپی کا تمام تر سامان لیے ہوئے ہیں۔

نوید سروش (میرپور خاص)

بھائی گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

اس بار آپ نے ایک درویش صفت قلم کار حنیف باوا کو قرطاس اعزاز سے سرفراز کرکے بڑا کام کیا ہے۔ شمارے کی سبھی چیزیں دل موہ لیتی ہیں مگر زبیر رضوی کا ''خشونت سنگھ اور نشاطیہ کلچر'' اپنے مخصوص اسلوب کی وجہ سے خشونت سنگھ کی زندہ دلی کو پیش کی ہے وہ کافی دلچسپی کی حامل ہے۔ مجھے السٹریڈ ویکلی کے چند ایسے شمارے دیکھنے کا موقع ملا جب وہ ایڈیٹر تھے۔ میں نے اُس میں (With Malice Towards one & All) سارے کالم پڑھنے کے بعد مطالعے کی جو سیرابی محسوس کی وہ آج بھی تازہ ہے۔ واقعی سعدیہ دہلوی نے ٹھیک ہی کہا تھا ''اگر خشونت عورت ہوتا تو ہمیشہ ''حاملہ'' ملا کرتا کہ ایسے نہ کرنے کی عادت نہیں''۔ افسانوں میں نیلم احمد بشیر کا ''اللہ کی زمین'' بہت دل ہلا

دینے والا تھا۔ موصوفہ نے کتنی بڑی بات کس قدر آسانی سے دو ڈھائی صفحات میں کہہ دی! دوسرا خوبصورت افسانہ ''پاگل'' تھا جسے وقار مسعود خان نے انتہائی چابکدستی سے قلمبند کیا ہے کہ پڑھنے کے بعد دل میں عجیب سی کسک محسوس ہوتی ہے۔

رس رابطے میں بھائی طارق علی کے خط نے بہت متاثر کیا۔ اس بات سے قطع نظر کہ ان کا افسانہ ''جب جسم جاگتے ہیں'' وہ یٰسین احمد صاحب کے افسانے کی نقل تھا یا نہیں میں اب طارق صاحب کے بیان کو سچ مان کر کہ انہوں نے ''کرکیچہ کا فلیٹ'' نہیں پڑھا تھا۔ اپنے درست الفاظ واپس لیتا ہوں۔ عمر کے چھہترویں سال میں مجھے بعض اوقات اپنی تحریر کی شائستگی کا خیال نہیں رہتا ہے۔ ویسے طارق صاحب میرے کلام کو پسند کرتے ہیں تو مجھے خوشی ہوتی ہے۔

آخری بات یہ کہ گذشتہ شمارے میں کمپوزنگ کے سہو کے سبب میری نعت کے چھٹے شعر کے پہلے مصرعے میں ''اُس رحمتِ عالم'' کے بعد لفظ ''سے'' چھوٹ گیا ہے جس سے مصرعہ بے وزن ہو گیا ہے جبکہ پورا مصرعہ کچھ اس طرح ہے:

اُس رحمتِ عالم سے نسبت رہے مستحکم!

غالب عرفان (کراچی)

ڈیئر گلزار جاوید صاحب، سلام مسنون۔

ممتاز افسانہ نگار حنیف باوا کا خصوصی گوشہ شائع کرنے پہ آپ کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ حنیف باوا غضب کا قلم کار ہے۔ تخلیقی دولت سے مالا مال ہے۔ اس کے قلم میں روانی ہے۔ آسان عام فہم زبان میں کہانیاں یوں سناتا ہے کہ آغا جان عیشؔ کا مصرعہ یاد آتا ہے:

''مزہ کہنے کا جب ہے اک کہے اور دوسرا سمجھے''

وطن عزیز میں پھیلی منافقت ادب میں بھی در آئی ہے۔ پسند و ناپسند کا طوفان امنڈھ آیا ہے۔ آپ کو یاد ہوگا ۱۹۶۰ء کی دہائی میں ریڈیو مشرقی پاکستان میں رابندر ناتھ ٹیگور پر پابندی عائد کرنے کی کوشش کی گئی۔ بنگلہ دیش بنا تو جھٹ ہمارے نصاب سے وحشت کلکتوی کو نکال دیا گیا۔ جوشؔ ریڈیو اور ٹی وی کے ناپسندیدہ شاعر قرار پائے۔

اخباروں کو اشتہاروں کی راتب پر پالا جاتا ہے۔ اب میڈیا کا فیصلہ ہے کہ کسے عظیم دانشور اور لکھاری ثابت کرے نہ کہ قاری کا۔ اس دورِ بدتمیزی میں جیسے جان ملٹن والا CHAOS بھی کہا جا سکتا ہے۔ شیطان کے سرچار خدائی طاقتوں سے نبرد آزما ادیب کو علم نہیں کہ اس کی تحریر کن کن ہاتھوں تک پہنچ پائے گی۔ وطن عزیز میں باون تظیموں کو دہشت گرد قرار دیا گیا ہے۔ ادیب خوفزدہ ہے کہ اس کی تحریر کا مفہوم کہاں کیا لیا جائے گا۔ عباس خان اور حنیف باوا جیسے افسانہ نگار صلہ وستائش سے منہ موڑے اپنے میں مگن کام کیے جاتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایسے ہی لکھاری عظیم قرار دیے جائیں گے۔ خصوصی گوشہ نے تو حنیف باوا کی تخلیقی زندگی کے ایسے پہلوؤں کی جھلک دکھائی کہ طویل روابط کے باوجود جن تک میری رسائی نہ تھی۔ میں حنیف باوا کا ہمیشہ سے معترف اور قاری رہا ہوں۔ وہ بہت اچھا انسان ہے، مگر ضرورت سے کچھ زیادہ ہی شریف ہے، شرافت اگر بتیوں کی خوشبو کی مانند ہوا کرتی ہے قابل برداشت ہو تو روحانیت اور ارتکاز توجہ میں مدد و معاون زیادہ تیز ہو تو دم ہی گھٹنے لگتا ہے۔

آغا گل (کوئٹہ)

گرامی قدر گلزار جاوید صاحب، دعائیں۔

''چہارسُو'' بابت ماہ جولائی، اگست محبتوں کی خوشبو لئے موصول ہوا۔ یک رنگا سرورق اور اس پر حنیف باوا کا Sketch جاذب نظر ہے۔ براہ راست میں تین چار زبانوں کا بیک وقت استعمال ایک ایسا خوبصورت Mixture ہے جس میں ان جملہ زبانوں کی چاشنی، مٹھاس اور رنگ ''براہِ راست'' نمایاں ہوتے ہیں۔ سوال و جواب کا یہ سلسلہ اگرچہ مختصر ہے لیکن علمی اور معلوماتی ہے۔ چالیس صفحات پر محیط قرطاس اعزاز حنیف باوا کی اردو اور بالخصوص پنجابی زبان و ادب کے لیے خدمات کا حاصل تو نہیں لیکن خراج کا ایک انداز اور سعی ضرور ہے۔ پنجابی شاعری کا انتخاب بھی خوب ہے۔ اسی طرح ممتاز قلم کاروں اور تنقید نگاروں کے تنقیدی اور توصیفی مضامین موصوف کے فن کو سراہنے کی روایت ہے جو اپنی جگہ اہمیت کی حامل ہے۔ ان چالیس صفحات کے علاوہ پرچے میں جو کچھ ہے اس کا اپنا ایک الگ رنگ اور ڈھنگ ہے جس کی ہر قاری کو امنگ ہے۔ غزلیات کے پہلے حصے ''سچ بولنا سیکھو'' میں تقریباً تمام غزلیں لاجواب ہیں (ایک دو کو چھوڑ کر) دوسرا حصہ بہ عنوان ''حسرتوں کا بوجھ'' جیسے نام ویسا کلام کی مصداق چہارسو پر بوجھ نہیں ہے البتہ کمزور ضرور ہے۔ نظمیں ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔ ہر نظم اپنے عنوان کی مناسبت سے مکمل اور جامع ہے اور اپنے اندر اصلاح اور فلاح کا کوئی نہ کوئی پہلو ضرور رکھتی ہے۔ افسانوی ادب میں چار عورتیں چار مردوں پر سبقت لے گئی ہیں اگرچہ احمد زین الدین نے ''چکر'' لکھ کر ایک ایسے معاشرتی رویے اور روگ کی کامیاب عکاسی کی ہے جس نے بحیثیتِ مجموعی ہمارے معاشرے کو ''چکرا'' دیا ہے۔

''رس رابطے'' کو آدھی ملاقات کے ذیل میں پڑھا گیا۔ مختلف النوع احساسات و جذبات اور تاثرات نیز سر اٹھاتے اختلافات خط کی اہمیت اور افادیت واضح کرتے ہیں۔ میری ناقص رائے میں یہ سلسلہ مقبول بھی ہے اور محبوب بھی۔ خیالات کا تبادلہ علم و آگہی کے بند دریچے وا کرتا ہے۔ آخر میں ایک درستی۔ زیرِ نظر شمارے میں شامل میری غزل کے تیسرے شعر کا مصرعہ ثانی ایک لفظ ''با'' کے کمپوز نہ ہونے کی وجہ سے بے وزن ہو گیا ہے۔ پورا شعر اس طرح ہے

تری منزل اگر صبحِ درخشاں تھی تو پھر ''اے شب''
بتا دیتی ترے ہمرہ باندازِ دگر جاتے

تصور اقبال (اٹک)

..... کھڑکی میں بیٹھا وقت .....

محترمہ عذرا اصغر فن کی اُس معراج پر متمکن ہیں کہ اُن کی تعریف وتوصیف میں کہے گئے الفاظ ایک طرح سے معنٰی ومفہوم سے عاری ہو چکے ہیں۔محترمہ عذرا اصغر نے جس لگن کے ساتھ اردو افسانے کی خدمت کی ہے وہ ہم سب پر ظاہر وباہر ہے۔اُن کے تازہ افسانوی مجموعے ''کھڑکی میں بیٹھا وقت'' کی نسبت کسی بھی طرح کی حاشیہ آرائی کرنے سے بہتر ہے کہ ہم اُن کے تازہ مجموعے سے مختصر افسانہ ''حیرت زدہ'' آپ کی نذر کریں۔

''آپ کے افسانوں میں قنوطیت در آئی ہے۔'' قاری نے افسانہ نگار سے کہا۔افسانہ نگار نے حیرت سے قاری کی جانب دیکھا اور بولا۔

''قنوطیت؟ بھلا میرے افسانوں کا حصہ کیسے نہ بنے؟ معاشرے میں پھیلی منافقت، لالچ، طمع، لوٹ کھسوٹ، مفاد پرستی اور آپا دھاپی نے ہی تو اس قنوطیت کو جنم دیا ہے۔پھر ایک افسانہ نگار اس آگ میں جھلسنے سے کیسے محفوظ رہ سکتا ہے؟

''افسانہ نگار کا کام آگ بجھانا ہے۔آگ لگانا یا بھڑکانا نہیں۔'' قاری نے دل گرفتہ ہو کر کہا۔

افسانہ نگار نے حقیقت بین نگاہوں سے قاری کی جانب دیکھا اور اپنے تازہ تخلیق کردہ افسانے کو پُرزے پُرزے کر کے کوڑے دان میں پھینکا اور ایک دل فریب مسکراہٹ اور پُرعزم اعتماد کے ساتھ لکھنے کی منیر پر جھک گیا۔'' .....**انوار شریف**

اشاعت: جون ۲۰۱۴ء، قیمت: ۳۰۰ روپے، شرکت پرنٹنگ پریس، لاہور

..... آوازِ عشق .....

یہ کتاب محمد رفیع صاحب کی سوانح حیات نہیں، اور نہ ہی ماہ وسال کے تواتر سے اُن کے نغمات کا مجموعہ۔میں نے موسیقی کے ایک طالب علم کی حیثیت سے اُن کی آواز کے اسرار ورموز، آواز ندرّت اور تراکیب پہ کچھ لکھنے کی کوشش کی ہے۔محمد رفیع صاحب کے حالات زندگی، بچپن کا زمانہ، لاہور میں قیام اور ابتدائی مصروفیات، ممبئی میں آغاز سنگیت، عروج وکمال اور بعد میں ۷۰ء کی دہائی کے واقعات اور اُن کی وفات۔ان تمام امور پر کچھ نہ کچھ سطحی طور پر لکھا ہوا تو موجود ہے جو شائقین سنگیت کو اُن کے بارے میں محدود سی معلومات فراہم کرتا ہے، لیکن اصل موضوع جس کی وجہ سے محمد رفیع آج محمد رفیع صاحب ہیں، یعنی اُن کی ''بے مثال آواز اور باکمال فنِ سنگیت''۔یہ مضمون اس قدر تشنہ ہے، جس پر کوئی تحقیق وجستجو نہیں کی گئی۔آواز کیا ہے؟ آواز کی ماہیت اور ساخت کیسی ہے؟ مقامات آواز کیا ہیں؟ آواز کیوں متاثر کرتی ہے اور محاسنِ آواز کیا ہیں؟ یہ موضوعات چونکہ دشوار ہیں اور جن کا تعلق مابعد الطبیعات Metaphysic سے ہے۔شاید اسی لیے کسی نے ان پر طبع آزمائی نہیں کی۔محمد رفیع صاحب کی رعنائیِ آواز کی پرکشش تاثیر ہر صاحبِ دل کو کھینچتی ہے، اہل بینش کو متوجہ کرتی ہے فنِ سنگیت پر ان کی کامل دسترس نے فلمی نغمات کو معنویت کے اسلوب عطا کیے۔گلے سے نکلتے نور نے نغمات کو آگہی کے دلنواز پیکروں میں اتارا۔اُن کی آواز مثلِ روح تازہ پژمردہ خاشاکِ گلستان میں حیات مترنم بن کر جاں گزیں ہوئی۔ .....**قیصر اقبال**

اشاعت: ۲۰۱۴ء، قیمت: ۵۰۰ روپے، سانجھ پبلی کیشنز، لاہور

..... انگیکا زبان: پس منظر، پیش منظر .....

انگیکا لوک گیت انگ علاقے کی سماجی زندگی کا آئینہ ہیں۔ان میں صدیوں پرانے چہرے کو دیکھا جا سکتا ہے۔گذرے ہوئے لمحات، رہن، سہن، رسم و رواج، کلچر، دانش مندی، سماجی بندشیں اور مصائب اس آئینے میں صاف طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔

انگیکا لوک گیت محض الفاظ کا خوبصورت مرقع ہی نہیں بلکہ ان میں تجربات اور محسوسات کا عرق ملتا ہے۔ان میں تخیل کی زرکاری کا احساس ہی نہیں ہوتا بلکہ اس علاقے کی بو باس بھی ملتی ہے اور ارضیت کے سارے کھرے اور کھوٹے پہلو سامنے آجاتے ہیں جہاں یہ زبان بولی اور سمجھی جاتی ہے۔

لیکن انگیکا بولی یا زبان، زمانہ حال تک Spoken Language رہی ہے۔اسی لیے اس کے لوک گیت نسلاً بعد نسلاً یا سینہ بہ سینہ منتقل ہوتے رہے ہیں اور اس کا وافر سرمایہ موجود ہے۔آج یہ زبان اور اس کا ادب بھاگلپور یونیورسٹی (بہار) کے ایم۔ایک کے نصاب میں شامل ہے۔پوسٹ گریجویٹ شعبہ انگیکا قائم ہے اور ہر صنف میں درجنوں کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔اس زبان سے عام طور پر اردو داں طبقہ ناواقف ہے۔وجہ یہ ہے کہ اردو والوں نے اس کی طرف توجہ ہی نہیں دی ہے۔ ..... **ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی**

اشاعت: ۲۰۱۴ء، قیمت: ۱۵۰ روپے، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، بھارت۔

زندگی کے ساتھ ساتھ
ماہنامہ
چہارسو
راولپنڈی